کچھ یادیں کچھ آنسو
اے حمید

www.iqbalkalmati.blogspot.com

(افسانے)

اے حمید

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاندنی اور جزیرے

کولمبو سے انا پورنا کا ایک اور خط آیا ہے۔

اس نے لکھا ہے کہ وہ لوگ شہر چھوڑ کر اپنے گاؤں کندر گام چلے آئے ہیں۔ انہوں نے گھر کے پاس والا ذخیرہ دوبارہ حاصل کر لیا ہے اور اب وہ بانس کی ٹھنڈی چھاؤں اور کیلے کے قرمزی جھومروں کو چھوڑ کر بوریلا سٹریٹ کے گندے اور بیمار مکان میں نہیں جائیں گے۔ یہ خط مجھے آج شام کی ڈاک سے ملا ہے۔ زرد رنگ کے سرکاری لفافے پر کول پٹی اور کولمبو کے علاوہ کندر گام کے ڈاکخانے کی مہر بھی ہے۔ کندر گام کا قصبہ لنکا کے جنوبی ساحل کی جانب کولمبو شہر سے ڈیڑھ پونے دو سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ کولمبو کے دوسرے بڑے ریلوے سٹیشن "فورٹ" سے سبز رنگ کی چھوٹی سی گاڑی بلا ناغہ شام کے ساتھ بجے کول پٹی کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ یہ گاڑی چھوٹے چھوٹے سٹیشن چھوڑتی، سمندر کے ساتھ ساتھ رات بھر اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ اس کی ایک جانب گہرے سبز رنگ کا پر شور سمندر ہوتا ہے اور دوسری جانب جزیرہ سنگلدیپ کے تاریک اور سنسان جنگل ------ صبح صبح جب آسمان پر ستارے ایک ایک کر کے مدھم ہونے لگتے ہیں اور طلوع ہونے والے سورج کی نیلگوں جھلکیاں نمودار ہوتی ہیں تو گاڑی سمندر سے ایک دم جدا ہو کر ملیلا، بانس، تاڑ، سپاری اور سال بن کے جنگلوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہاں سمندر کی جانب سے آنے والی کھاری ہوا اور مچھلیوں کی چھچھاند کی بجائے فضا میں بانس کے گیلے درختوں اور کھڑے پانیوں میں بوئے ہوئے دھان کی پنیریوں کی ٹھنڈی مہک رچی ہوتی ہے۔ یہاں پہنچ کر آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ پر شور کھارے سمندروں میں ایک مدت تک سفر کرنے کے بعد کسی چھوٹے سے خوبصورت جزیرے میں آ گئے ہیں۔ جوں جوں رات کا تاریک غبار اڑتا ہے صبح کی لطیف ہوا زیادہ خنک اور خوشگوار ہوتی جاتی ہے۔ اور جب جنوب مشرقی جزیروں کا روشن اور پر اسرار سمندر سوئے ہوئے گنجان جنگلوں میں سنہری کرنوں کا جال پھینکتا ہے' تو بڑ' مہوا' سال اور بانس کے درختوں کی نیند ٹوٹ جاتی ہے اور ان کی سایہ دار شاخوں میں بسیرا کرنے والے پرندے شور مچانا شروع کر دیتے ہیں اور گاڑی ایک سبز ٹیلے کا چکر کاٹ کر چھوٹے میدان میں نکل آتی ہے۔ یہاں سے کال پٹی سٹیشن کی یک منزلہ سرخ عمارت صاف دکھائی دیتی ہے۔ بھورے بھورے بادل دور سبز پہاڑیوں کے عقب سے اٹھ رہے ہوں گے اور سگنل کے لال لال بازو نیچے گرے ہوں گے۔ جیسے بادلوں کو گزر جانے کی جھنڈی دے رہے ہوں۔ پلیٹ فارم پر شروع سے لے کر آخر تک مہوا کے درخت سایہ کئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دکھائی دیں گے۔ جن کی ہلکی سبز اور گہری سبز شاخوں میں نوکیلی پتیوں والے سرخ سرخ پھول مسکرا رہے ہوں گے۔ سنہالی لڑکیاں اور لڑکے پان' سگریٹ سگار' گرم کوکو زرد زرد کیلے اور اناس کے قتلے لیے ڈبوں کی طرف لپکتے ہیں۔ کم عمر لڑکے صرف میلی نیکریں پہنے ہوتے ہیں اور ان کے سانولے خاکی' زرد اور کمزور بدن ننگے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں عام طور پر پنڈلیوں تک دھوتی باندھتی ہیں اور انگیا پہنتی ہیں۔ دھوتیاں پھولدار بھی ہوتی ہیں۔ اور سادہ بھی۔ انگیا اس طرح کس کر باندھی ہوتی ہے کہ ان کے سینے بالکل سپاٹ معلوم ہوتے ہیں۔ دھوتی اور انگیا کے درمیان ان کے پیٹ بھی کسے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے بال سیاہ ہوتے ہیں اور ناریل کے تیل میں تر بتر۔ ان بالوں کو لپیٹ کر انہوں نے گردن پر باندھ رکھا ہوتا ہے اور ان میں مٹیلا کی سپید یا سرخ کلیاں سجائی ہوتی ہیں۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں مٹکاتی وہ بڑی آزادی سے آپ کے پاس بھاگ کر آئیں گی اور کچھ ایسی لجاجت سے سگریٹ پان' یا اناس کے قتلے پیش کریں گی کہ آپ انکار نہیں کر سکیں گے۔ کال پٹی کے سٹیشن پر گاڑی کافی دیر رکتی ہے اور کندر گام جانے والے مسافر اسی جگہ اتر پڑتے ہیں۔ کال پٹی کی اہمیت محض کندر گام کی وجہ سے ہے۔ اگر کندر گام تک ریل جا سکتی تو شاید کال پٹی کا سٹیشن کبھی معرض وجود میں نہ آتا۔ کندر گام ویسے تو چھوٹا سا قصبہ ہے لیکن کھوپا' چھال' چائے' چاول' پان' اور گرم مسالوں کی تجارت کے باعث بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں سے روزانہ ہزاروں روپے کا مال کال پٹی کے سٹیشن پر لایا جاتا ہے اور ریل کے ذریعے کولمبو' کینڈی اور لنکا کے دوسرے بڑے بڑے شہروں میں بھیجا جاتا ہے۔

کال پٹی سے کندر گام تک کا سفر بیل گاڑیوں میں طے کیا جاتا ہے۔ راستہ چونکہ دشوار گزار ہے اور تنگ سڑک تقریباً سارا سال بارش میں بھیگتی رہتی ہے اس لیے موٹر لاریوں کا یہاں کوئی انتظام نہیں ہے۔ پتلی سی لک پھری سڑک پاس پاس اگے ہوئے گنجان درختوں والی مرطوب ڈھلوان کے درمیان ادھر ادھر چکر کاٹتی بیس میل تک چلی گئی ہے۔ راستے میں جگہ جگہ بارش میں سدا ٹپکنے والے گھنے درختوں کے نیچے ناریل کے کھپریلوں سے بنی ہوئی دوکانیں اور چائے خانے ملتے ہیں۔ کسیلی اور تلخ چائے پینے کے لیے آپ کو لکڑی کے گیلے بنچ پر بیٹھنا پڑے گا۔ چائے میں چونکہ ناریل کے گودے کا دودھ نکال کر ڈالا ہوگا اس لیے اس میں سے عجیب قسم کی بو اٹھ رہی ہوگی۔ یہ بو آپ کو سنہالی کنواریوں کے گندھے ہوئے گہرے سیال بالوں میں بھی محسوس ہوگی اور کولمبو کے سب سے بڑے ہوٹل کال فیس کے بال روم کی فضا میں بھی رچی ہوگی۔ یہ بو لنکا کا سانس اور اس کا لمس ہے۔ آپ جزیرے میں قدم رکھتے ہی اسے اپنے نتھنوں میں محسوس کریں گے۔ چائے خانے کی پیشانی پر سوکھے تمباکو کے گھٹے' کیلے کے زرد گچھوں کے ساتھ ہی لٹک رہے ہوں گے اور آپ کو گھٹیا قسم کے سگریٹ یا گھریلو سگار اور چرٹ خریدتے ہوئے سر جھکانا پڑے گا' اور آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کسی خانقاہ

کے مجاور سے تبرک لے رہے ہیں۔ جب کندر گام ایک آدھ فرلانگ رہ جائے گا تو ایسے چائے خانوں میں اضافہ ہو جائے گا اور سڑک کے بیچ میں سنہالی دیہات کے ننگ دھڑنگ بچے بانس کا گیند کھیلتے دکھائی دیں گے اور تھکے ہوئے زرد چہروں والی عورتیں ٹوکریاں پشت پر باندھے اوپر چائے کے باغوں کی طرف جاتی ملیں گی۔

کندر گام میں صرف ایک بازار ہے جو کافی گنجان اور بارونق ہے۔ چند ایک پکی دوکانوں کو چھوڑ کر باقی تمام بانس اور ناریل کے کھپریلوں سے بنی ہوئی ہیں۔ مضافات سے پان' چھال' اناناس دھان' کیلا اور گرم مسالے کا سارا سٹاک اسی بازار میں آ کر جمع ہوتا ہے۔ کسان اور محنت کش باغبان ان چیزوں کو نمک' مرچ' تمباکو' ہلدی' کپڑا' شکر اور دیا سلائیوں کے عوض اونے پونے بیچ جاتے ہیں جنہیں شہر کی بڑی بڑی فرموں اور کمپنیوں کے ایجنٹ کندر گام کے بیوپاریوں سے خرید کر چھکڑوں کے ذریعے کال پٹی اور وہاں سے بذریعہ ریل کولمبو اور کینڈی روانہ کر دیتے ہیں۔ قصبے کے اس مختصر لیکن اہم کاروباری بازار میں کئی ایک تاڑی خانے ہیں۔ اردگرد کے دیہاتوں سے پیدل چل کر آئے ہوئے کسان اور باغوں میں دن رات کام کرنے والے مزدور ناریل کی چھال کی بوریاں' کیلوں کے پور اور پان کی ٹوکریاں بیچ کر یہاں آ جاتے ہیں اور اپنا غم غلط کرتے ہیں۔ آنسوؤں کی طرح غم بھی ہر جگہ پایا جاتا ہے اور ہر جگہ غلط کیا جاتا ہے۔ لنکا کے بیٹے پانی ملی ہوئی تاڑی کی بوتل لے کر کلال خانے کے اندر یا باہر زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پہلا گھونٹ پی کر وہ جلدی سے پیاز اور املی کی تیز مرچوں والی چٹنی کھانے لگتے ہیں اور سوں سوں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کچی لسی کے رنگ ایسی پھیکی اور بدبودار تاڑی کے دوسرے گھونٹ پر ہی ان کی آنکھیں لال لال انگارے بن جاتی ہیں اور وہ بات بات پر ایک دوسرے کو دھمکیاں دینے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی یہاں دنگا فساد بھی ہو جاتا ہے لیکن قصبے کے تھانے سے کوئی سپاہی نہیں پہنچتا تھانے کے انچارج کو نیولے اور سانپ کی لڑائی دیکھنے کا شوق جنون کی حد تک ہے۔ چنانچہ سپاہیوں کا کام صبح سے شام تک بھیکڑ اور سال کے جنگل میں نیولے تلاش کرنا اور انہیں کسی نہ کسی طرح گرفتار کر کے تھانے میں لانا ہے۔ سپاہی یا نیولے گرفتار کر سکتا ہے یا آدمی۔۔۔۔۔۔ وہ دونوں کام ایک وقت میں نہیں کر سکتا۔

انا پورنا کا گھر یہاں سے تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ کندر گام کا بڑا بازار جہاں ختم ہوتا ہے وہاں سے ایک پتلی سی پگڈنڈی نکلتی ہے جو چائے اور کوکو کی ڈھلوان کے ساتھ ساتھ بل کھاتی جھیل نندا دیوی کے پرسکون اور پھول پتوں میں چھپے ہوئے کناروں تک چلی گئی ہے۔ اس جھیل کے متعلق سنہالی لوگ گیتوں میں مشہور ہے کہ یہاں نندا دیوی نے اپنے محبوب دیوتا سورج پوری سے جدا ہو کر بان باس کے بارہ سال کاٹے تھے۔ چاند کی پہلی تاریخوں میں وہ آدھی رات گزر جانے پر اپنے لمبے بال کھول کر ملیلا کے کسی درخت تلے

بیٹھ جاتی تھیاور اپنے پریمی کی یاد میں خاموشی سے آنسو بہایا کرتی تھی۔ چنانچہ جب بارہ سال پورے ہو گئے اور نندا کو اس کا محبوب سورج پوری دوبارہ آن ملا تو جنگل میں جہاں سوگوار محبوبہ کے آنسو گرے تھے وہاں ایک جھیل بن گئی۔ یہ جھیل کافی بڑی ہے اور اس کی سطح پر ہر موسم میں گدلے رنگ کے گول گول پتے تیرتے رہتے ہیں۔ ان پتوں کے درمیاں کنول کے بے شمار پھول اپنے دھلے ہوئے شفاف چہرے اٹھائے رکھتے ہیں۔ ان میں کوئی ادھ کھلا ہے کوئی ابھی بند ہے اور نازک پتیوں میں لپٹا سو رہا ہے۔ کوئی ریشمی آنچل ہٹا کر چوری چوری دیکھ رہا ہے اور شرم سے اس کا منہ لال ہو رہا ہے۔ کوئی پورا کھلا ہوا ہے اور اس پر بھونروں کی ٹولیاں چکر لگا رہی ہیں۔ ان میں کسی کا رنگ گلابی ہے تو کسی کا زرد۔۔۔۔۔۔۔ بالکل زرد! جیسے سورج نکلنے سے کچھ دیر پہلے ستاروں کا ہوتا ہے۔ کسی میں کاسنی اور قرمزی رنگ کی آمیزش ہے اور ایسا معلوم ہوتا گویا نیلے پردوں کے پیچھے سرخ قندیل جل رہی ہو۔ کوئی بالکل سپید ہے' برف ایسا سپید اور سبز پتوں کی طشتری میں روئی کے دھلے ہوئے گالے کی طرح پڑا ہے۔ ہوا چلے خواہ نہ چلے یہ پھول جھیل کی ہلکی سبز سطح پر بے معلوم انداز میں ہلورے لیتے رہتے ہیں۔ جیسے سانس لے رہے ہوں یا محبوب کا شہد آگیں لمس محسوس کر رہے ہوں۔ اس جگہ موٹے موٹے تنوں والے گنجان اور قد آور درخت ہیں' اور دن کے وقت بھی ہلکا ہلکا مرطوب اندھیرا سا چھایا رہتا ہے۔ جھیل کے اوپر درختوں کی شاخیں جھکی ہوئی ہیں۔ کنارے کنارے بانس اور تاڑ ساتھ ساتھ اگے ہیں۔ فیلا کی ٹہنیاں سال کے درختوں میں الجھی ہوئی ہیں اور سال کی ٹہنیاں مہوا کی شاخوں میں سو رہی ہیں اور ان کے اوپر رتنا کلی اور نیل دھاری کی نازک بیلوں نے جال پھیلا رکھا ہے۔ رتنا کلی میں گلابی رنگ کی کلیاں لگتی ہیں جن میں سے نشہ آور میٹھی میٹھی مہک اٹھا کرتی ہے۔ کہتے ہیں اس کلی پر جو تتلی آکر بیٹھتی ہے اپنے آپ نیند میں ڈوب کر بے سدھ ہو جاتی ہے۔ ماہ چیت میں اس جھیل پر نندا دیوی کی یاد میں ہر سال میلہ لگتا ہے۔ یہ میلہ چاند کی ابتدائی تاریخوں میں شروع ہوتا ہے اور تین دن بعد ختم ہو جاتا ہے۔ قریبی دیہات سے عورتیں' مرد بوڑھے بچے' لڑکیاں پیدل چل کر یہاں آتے ہیں اور تین دن تک جی بھر کر ناچنے گانے اور ہنسنے ہنسانے کے بعد سارے سال کی دکھوں کی گرد جھاڑ کر تازہ دم واپس ہو لیتے ہیں۔ ابھی برسات شروع نہیں ہوئی ہوتی اور لنکا کا یہ بہترین موسم ہوتا ہے۔ انہیں ایام میں اناس کے پودوں میں رس آتا ہے اور پام کے درختوں پر ایسے ناریل لگتے ہیں جن میں سپید بند پھول ہوتے ہیں۔ سنہری دھوپ میں دھیما دھیما خمار سا سا لگا رہتا ہے اور جنگلوں میں رات کو جو ہوائیں چلتی ہیں وہ بانس کے نوکیلے پتوں میں سے گزرتے ہوئے نغموں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور پھولوں کو وقت سے بہت پہلے سلا دیتی ہیں۔ جب رات زیادہ گزر جاتی ہے اور شروع تاریخوں کا چاند مغربی جنگلوں کے اوپر جھک آتا ہے اور مشرقی آسمان پر ستارے زیادہ شوخ اور بھڑکیلے ہو جاتے ہیں تو سنہال کی کنواری دوشیزائیں اپنے کنول کے پھولوں ایسے ان چھوئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ریشمی جسم سمائے جھیل کے سبز پانی میں اتر جاتی ہیں اور ایک دوسری پر پانی کے چھینٹے اڑانے لگتی ہیں۔ ان کے لمبے سیاہ بالوں کے جوڑے کھل جاتے ہیں اور گلابی رخساروں پر ننھے ننھے قطرے ستاروں کی طرح چمکنے لگتے ہیں اور کنول کے پھول ان کے بے داغ جسموں سے چھو کر کانپنے لگتے ہیں لرزنے لگتے ہیں۔ دھندلی چاندنی کا مدھم غبار ٹہنیوں سے چھن چھن کر ان کے بھیگے ہوئے مردار شانوں' رخساروں' ہونٹوں' آنکھوں اور حنا میں ڈوبی ہوئی انگلیوں کو چومتا ہے اور جھیل کے دوسرے کنارے پر ناریل کے تیل میں تر کی ہوئی مشعلیں جل اٹھتی ہیں اور سنہالی دوشیزائیں ہنستی' قہقہے لگاتی' ایک دوسرے سے چہلیں کرتی جھیل سے باہر نکل آتی ہیں اور درختوں کے نیچے پہنچ کر کپڑے پہنتی ہیں' لمبے بالوں کو جھٹک جھٹک کر سکھاتی ہیں۔ انہیں گردن پر جوڑوں کی شکل میں باندھ کر ان میں ملیا کی گلابی کلیاں سجاتی ہیں۔ کنول کے سپید پھولوں کے ہار گلے میں ڈالتی ہیں' ادھ کھلے کنول کے نیلے پھولوں کے گھنگھرو پاؤں میں باندھتی ہیں اور مشعلوں کی روشنی میں ناچنے لگتی ہیں۔ درمیان میں دو آدمی شہنائی اور مرونگ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اردگرد رقص کرنے والیوں کے بھائی' باپ' مائیں' بہنیں' محبوب' ہونے والے خاوند تالی پیٹ کر رقص کی دھن پر تال دیتے ہیں۔ لڑکیاں کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دائرے کی صورت میں ناچنے لگتی ہیں اور کبھی ہاتھ چھوڑ کر گردنیں آگے ڈھلکا کر صرف ایک پاؤں پر تھرکتی ہوئی آگے جاتی ہیں اور پھر تیزی سے پیچھے پلٹ آتی ہیں۔ جیسے شہنائی کی لے ناگن بن کر پھن پھیلائے ان کی جانب لپک رہی ہو۔ مشعلوں کی کانپتی روشنی میں ان کے نیم عریاں لوچدار جسم ایک پل کے لیے اجالے میں آتے ہیں اور شعلے کی مانند بھڑک کر ڈوب سے جاتے ہیں۔ شہنائی کی لے بے الفاظ فریاد کی صورت میں رقص کرنے والیوں کے متحرک قدموں میں بچھ جاتی ہے اور ان کے نازک پاؤں کو چومتی ہوئی مرونگ کی تال پر سے پھسل کر سنگلدیپ کے پہاڑوں' جنگلوں اور میدانوں کو چیرتی ہوئی بیکراں سمندر کی وسعتوں میں کہیں گم ہو جاتی ہے۔ یہ فریاد کہاں کھو جاتی ہے؟ یہ روٹھے ہوئے محبوب کو منانے جاتی ہے؟ شہنائی سے بچھڑا ہوا نغمہ جانے کب ملے! پھر رقص کرنے والیوں کے پاؤں دکھنے لگتے ہیں اور ان کی پیشانیاں پسینے کی شبنم میں شرابور ہو جاتی ہیں اور ان کے معصوم چہرے مسرت سے کندن کی مانند چمکنے لگتے ہیں اور وہ گھاس پر گر پڑتی ہیں ان پر پھولوں کی بارش ہوتی ہے' عطر چھڑکا جاتا ہے' رتنا کلی کی کلیاں لٹائی جاتی ہیں اور ان کے لیے کیلے کے پتوں میں ناریل کا شیریں رس ڈال کر لایا جاتا ہے۔ اس وقت چاند مغربی افق میں چھپنے سے پہلے آخری مرتبہ بانس کی شاخوں میں سے جھانکتا ہے اور سنسان جنگلوں میں رات ایک لمحے کے لیے رک جاتی ہے اور جھیل ندا پر اپنا تاروں بھرا آنچل ڈال دیتی ہے۔ اب ہر شے خاموش ہے اور سو رہی ہے۔ ناچنے والی دوشیزائیں گھاس کے قالین پر نیند میں بے ہوش ہیں۔ کسی کا ہاتھ سینے پر ہے تو کسی کے بالوں کی سیاہ لٹ اس کے ہونٹوں کو چوم رہی ہے۔ نرم اور مخمور اعضاء کچھ عریاں'

کچھ پنہاں' چمکیلے سیاہ بال' کچھ گندھے ہوئے کچھ پریشان۔۔۔۔۔۔۔حنا میں ڈوبی ہوئی خوشبودار ہتھیلیاں۔۔۔۔۔۔۔کچھ کھلی ہوئی کچھ بند' گول اور سڈول پاؤں تھکے ہوئے پاؤں' سینوں کے ننھے ابھار پر سوئے ہوئے کنول کے پھول' نیم وا ہونٹوں میں سے جھلکتے ہوئے موتیوں کی لڑیوں اور خوشبوؤں' آنسوؤں' قہقہوں' سرگوشیوں اور اندھیروں' اجالوں اور موتیوں کلیوں اور پھولوں کے ڈھیر۔۔۔۔۔۔۔آم اور تاڑی کی ٹہنیوں میں سے شیرہ ٹپک رہا ہے اور سیاہ بھنورے نیند میں مدہوش دوشیزاؤں کے خوشبودار بالوں کے گرد منڈلا رہے ہیں۔نندا دیوی کی جھیل کا میلہ سنگلدیپ کی راتوں کا سہاگ اور سنہاری کنواریوں کی مانگ کا سیندور ہے۔

کلیوں کی خوشبو سے مہکی ہوئی اس فضا سے گذر کر' کچھ دور چلنے پر تاڑ' ناریل اور کیلے کے درختوں کے جھنڈ دکھائی دیتے ہیں۔یہ باغات کا ذخیرہ ہے جس کا حصہ انا پورنا کے بوڑھے باپ کی ملکیت میں ہے۔انہیں جھنڈوں کے آخری کنارے پر آم کے جھکے جھکے درختوں تلے انا پورنا کا گھر ہے۔یہ گھر ایک منزلہ ہے اور آڑے ترچھے پتھروں کے چبوترے پر گھاس پھونس اور تاڑ کے پتوں سے ملا کر بنایا گیا ہے۔دروازے بانس کے ہیں اور ڈھلوانی چھت پر ناریل کی کھپریلیں بچھی ہوئی ہیں۔برسات کے موسم میں جب بادل جنگلوں میں سے ہو کر گزرتے ہیں اور دھواں دھار بارشیں ہوتی ہیں تو اس گھر کی چھت پر سے پانی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی صورت میں نیچے گرتا ہے۔بانس کے دروازے مرطوب سی بو چھوڑ دیتے ہیں اور رات کو جنگل میں جھینگر اور مینڈک ٹرانے لگتے ہیں۔انا پورنا کا بوڑھا باپ لنگوٹ کس کر دن بھر کیلے کے درختوں کی مناسب آب یاری اور اناس کے پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف رہتا ہے۔اس کے سپید بال بھیگ کر کھوپڑی سے چپک جاتے ہیں اور سوکھے جسم کی سیاہ کھال چمکنے لگی ہے۔انا پورنا بھی بالوں کا جوڑا اچھی طرح باندھ کر مختلف کاموں میں مشغول رہتی ہے۔کبھی گرتی بارش میں مٹی کھودتے' فالتو ٹہنیاں کاٹتے اور سن کر رسیوں کے گچھے اٹھا کر اندر رکھنے میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتی ہے۔کبھی مٹکے میں رکھے ہوئے چاولوں کو اچھی طرح ڈھانپتی چھت پر فالتو کھپریلیں پھیلانے لگتی ہے۔اس جگہ بارش کا کوئی اعتبار نہیں۔سال میں گیارہ مہینے آسمان بھورے بھورے بادلوں کے کمبل میں لپٹا رہتا ہے۔ابھی اگر فضا میں امس ہے اور گرمی ہے اور ہر طرف گہرا سناٹا ہے تو دوسرے لمحے بادل زور سے گرجے گا اور ایک دم موسلا دھار بارش شروع ہو جائے گی اور اس کے شور میں جنگلی جانوروں کی آوازیں ڈوبنے ابھرنے لگیں گی۔

یہاں ایک مہینے سنہری دھوپ نکلتی ہے اور انہی دنوں درختوں پر پھل مٹھاس حاصل کرتے ہیں اور گہرے نیلے آسمان تلے بانس کی شاخوں پر ہری ہری کونپلیں پھوٹتی ہیں۔انا پورنا اپنے چھوٹے بھائی منو کو لے کر ناریل کے بھینگے' ٹیڑھے درختوں پر چڑھ کر انہیں زور زور سے ہلاتی ہے اور ناریل دھپ دھپ زمین پر گرنے لگتے ہیں۔ان کا باپ پھلوں کو ایک جگہ اکٹھا کرتا جاتا ہے۔پھر وہ انہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تیز دھار والی کلہاڑی سے توڑتے ہیں۔ پانی مٹکوں میں بھر کر گودا اور چھال سکھانے کے لیے دھوپ میں پھیلا دیتے ہیں۔ دوسرے مہینے کیلا اور اناس بھی پک کر تیار ہو جاتے ہیں۔ انہیں توڑ کر الگ الگ ٹوکریوں میں ڈالا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب چھال اور گودا سوکھ چکتا ہے تو انا پورنا' اس کا باپ اور چھوٹا بھائی ٹوکریاں سروں پر اٹھائے پتلی سی پگڈنڈی پر سے ہو کر کندرگام کے بڑے بازار میں پہنچ جاتے ہیں۔ ان چیزوں کے عوض وہ دکاندار بیوپاری سے چینی' چاول' نمک' دیا سلائی کی ڈبیاں اور کچھ نقدی وصول کرتے ہیں جس کا وہ تھوڑا بہت معمولی قسم کا کپڑا خریدتے ہیں اور اسی دن شام ہونے سے پہلے پہلے وہ واپس اپنی جھونپڑی میں آ جاتے ہیں۔

جھیل نند اپور کے اردگرد آم' تاڑ اور بانس کے جھکے جھکے درختوں تلے زندگی صدیوں سے موٹے چاول کھا کر اور ناریل کا میٹھا پانی پی کر بسر ہو رہی ہے۔ جنوری کے آخری دنوں میں تاڑ کے درختوں کی شاخیں شیریں رس سے بھر جاتی ہیں۔ انا پورنا کا بھائی چھوٹا سا کورا مٹکا لے کر چالاک بندر کی مانند سیدھے درخت پر چڑھ جاتا ہے اور چھری سے کسی شاخ کو آدھا کاٹ کر اس کے نیچے کورا مٹکا باندھ کر لٹکا دیتا ہے۔ رات بھر درخت کی مستی قطرہ قطرہ مٹکے میں ٹپکتی رہتی ہے۔ صبح پو پھٹتے ہی یہ مٹکا اتار لیا جاتا ہے۔ اس میں دودھ ایسے شفاف رنگ کی تاڑی جمع ہوتی ہے۔ اس پر جھاگ آیا ہوتا ہے۔ تاڑی کا اصلی روپ یہی ہے۔ اس کا ذائقہ میٹھے دہی کی لسی ایسا ہوتا ہے اور یہ انتہائی ٹھنڈی اور مفرح ہوتی ہے۔ کہتے ہیں اگر اسے پو پھٹنے سے پہلے اتارا جائے اور سورج نکل آئے تو اس کی تاثیر جاتی رہتی ہے۔ شہر والے اسے کچھ مدت کے لیے مٹکوں میں ڈال کر زمین میں دفن کر دیتے ہیں۔ وہ پھٹ کر انتہائی بدبودار ہو جاتی ہے اور اس میں نشہ آ جاتا ہے۔ پھر وہ لوگ اس میں دو تین گنا زیادہ پانی ملا کر بوتلوں میں بند کر کے تاڑی خانوں میں بیچتے ہیں۔ سیلون کے ان غیر مہذب علاقوں میں زندگی کا کچھ حصہ بسر کرنا' ناریل کے درختوں تلے بیٹھ کر منہ اندھیرے ٹھنڈی اور میٹھی تاڑی پینے کے مترادف ہے۔ شہروں میں بیٹھ کر جلی ہوئی کافی پینے والے تاڑی کا لطف نہیں اٹھا سکتے۔ تاڑی کے ایک گھونٹ میں ہزاروں کافی ہاؤس آباد ہیں۔ کافی پی کر آدمی کوہ قاف کے ہوائی محلات میں نکل جاتا ہے اور تاڑی پی کر وہ اپنے نیچے زمین کی سختی اور گھاس کی نرمی محسوس کرتا ہے لیکن اسے ہمیشہ سورج نکلنے سے پہلے پینا چاہیے۔ سورج نکلنے کے بعد پیا جائے تو آدمی کے نیچے سے زمین کھسک جاتی ہے اور وہ فضا میں معلق ہو جاتا ہے اور انا پورنا نے لکھا کہ اس دفعہ تاڑی اتنی میٹھی ہوئی ہے کہ صبح صبح جب ہم مٹکے اتارتے ہیں تو ان میں شہد کی مکھیاں تیر رہی ہوتی ہیں۔ اور ہم لوگ کولمبو کی دھواں اگلتی چمنیوں اور بوریلا اسٹریٹ کے تنگ و تاریک ڈربوں سے نکل کر پھر اپنے گاؤں چلے گئے ہیں اور بابا اور چھوٹا منو تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔

یہ خط انتہائی شکستہ ہندی میں لکھا ہے اور میرے سامنے میز پر کھلا پڑا ہے۔ کھڑکی کے باہر جنوری کی سرد رات ٹھٹھر رہی ہے اور میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سگریٹ سلگائے نیم وا آنکھوں سے اناپورنا کے جوڑے میں سجی ہوئی کنول کی زرد کلیوں کو دیکھ رہا ہوں۔ میرے اردگرد میرا سارا کنبہ سو رہا ہے۔ میز پر جلتے لیمپ کی روشنی مدھم ہے۔ میں اس کی بتی زیادہ اونچی نہیں کر سکتا۔ میری ماں کی آنکھیں خراب ہیں اور وہ تیز روشنی میں سو نہیں سکتی۔ میں نے لیمپ کے دونوں پہلوؤں کو کتابوں سے ڈھانپ کر سونے والوں کی جانب اندھیرا کر دیا ہے۔ اس کے باوجود ماں کو نیند نہیں آ رہی۔ آنکھوں کی خرابی کے علاوہ اسے درد ریح کا بھی عارضہ ہے۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد درد سے نڈھال ہو کر لمبی سی ہائے کرتی ہے اور اناپورنا کے جوڑے سے کنول کے پھول زمین پر گر پڑتے ہیں اور بانس کے جنگلوں پر چمکنے والا چاند ایک دم ڈوب جاتا ہے اور میں لنکا کے گل پوش جزیرے سے ایک بار پھر اس گھٹے ہوئے نیم روشن کمرے میں آ جاتا ہوں جہاں دن بھر مچھروں کی طرح محنت کرنے والے اب لکڑی کے شہتیروں کی مانند بے سدھ پڑے ہیں۔ میری میز کھڑکی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ جس کرسی پر میں بیٹھا ہوں اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی ہے اور میں نے اس جگہ اینٹیں جوڑ رکھی ہیں۔ یہ کمرہ الم غلم اشیاء سے بھرا ہوا ہے۔ کمرے کے آگے چھوٹا سا دالان ہے جس کی ایک جانب باورچی خانہ اور دوسری جانب غسل خانہ ہے۔ باورچی خانہ اس قدر چھوٹا ہے کہ اگر دیوار سے ٹیک لگائی جائے تو پاؤں سامنے والی دیوار سے جا لگتے ہیں۔ غسل خانے کا بھی یہی حال ہے۔ ہمارا پمپ سدا خراب رہتا ہے۔ جب تک اسے آدھ گھنٹہ چلایا نہ جائے پانی نہیں نکلتا۔ یہاں کا پانی کھارا اور ریتلا ہے جیسے صحرائے گوبی سے گزر کر آتا ہو۔ اس کا کرایہ پچاس روپے ماہوار ہے اور مالک مکان پہلی تاریخ کی صبح کو سیڑھیوں میں آ کر بیٹھ جاتا ہے اور ہمارے لیے نیچے اترنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں عنقریب یہ مکان بھی بدلنا پڑے گا۔ مسلسل مکان بدلتے رہنے سے ہمارا سامان خود بخود مختصر ہو گیا اور اس کی حالت خستہ ہو رہی ہے۔ اگرچہ نیلم اور سعیدہ نے اسے کمرے میں بڑے سلیقے سے لگا رکھا ہے پھر بھی وہ یوں لگ رہا ہے جیسے کسی ویران سٹیشن کے پلیٹ فارم پر پڑا ہو۔

یہ مکان جس سڑک پر واقع ہے وہ شہر سے آتی ہے اور باہر گندے دلدلی جوہڑوں اور غیر ہموار کھیتوں کی طرف نکل جاتی ہے۔ دن بھر اس سڑک پر سے گندگی سے بھرے ہوئے ٹرک گزرتے رہتے ہیں۔ ٹرک جب ہمارے مکان کے قریب سے گزرتا ہے تو اس کے در و دیوار یوں لرزنے لگتے ہیں گویا زلزلے کے جھٹکے محسوس ہو رہے ہوں۔ قریب ہی آٹا پیسنے والی چکی لگی ہوئی ہے۔ یہ چکی بجلی کے ذریعہ چلتی ہے اور کافی طاقتور ہے۔ جب یہ چلتی ہے تو ہمارے گھر کے دروازے، کھڑکیاں اور ان کی زنجیریں اپنے آپ کانپنے لگتے ہیں۔ شروع شروع میں ہم نے یہ ناٹک دیکھا تو ماں نے اسی وقت تھالی میں اگربتیاں سلگائیں اور کمرے میں چکر لگا کر آیات پڑھنے لگیں۔ جب میں نے چکی کا بھید کھولا تو ماں کو پھر بھی یقین نہ آیا۔ اس نے اگربتیاں بجھاتے ہوئے کہا:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''تم دیکھ لینا۔اس گھر میں وہی امرتسر والے بزرگ آباد ہیں۔''

بازار کی جانب ہمارے مکان کے سامنے ایک بڑی سی حویلی کا محراب دار دروازہ ہے۔ یہاں رہنے والے سبھی کوچوان ہیں۔ اندر نصف دائرے کی شکل میں چھوٹی چھوٹی اندھیری کوٹھڑیاں بنی ہیں۔ان کے وسط میں مریل سے گھوڑے یونہی ٹاپتے اور ہنہناتے رہتے ہیں۔گرمیوں میں یہاں سے مچھروں کی ٹولیاں اردگرد کے مکانوں پر حملہ آور ہوتی ہیں اور بدبو سے دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ کوچوان سروں پر رومال لپیٹے' گلوں میں میلے کچیلے ریشمی مفلر لٹکائے' چارپائیوں پر بیٹھ کر حقہ پیتے ہیں' مالکوں کی سنگ دلی' دانے کی مہنگائی' گھوڑوں کی بیماریوں اور ٹکو کے چوڑے کولہوں کی باتیں کرتے ہیں۔گھوڑوں کے لیے گھاس پھوس پھینکتے ہیں۔ان کے بدن پر کھرکھرا پھیرتے ہیں۔سرخ مفلر اپنے گلوں سے اتار کر ان کی گردنوں میں ڈالتے ہیں۔انہیں پچکارتے ہوئے تانگے کے آگے جوتتے ہیں اور پھر خدا کا نام لے کر یا کسی نئی فلمی گیت کی تان اڑا کر بازار کا رخ کرتے ہیں۔یہ کوچوان اپنی بیویوں سے بھی گھوڑوں ایسا سلوک کرتے ہیں۔انہیں پیار سے پچکارتے بھی ہیں۔تھپتھپاتے بھی ہیں'ان کے جسموں پر کھرکھرا بھی پھیرتے ہیں اور چابکوں سے ان کی مرمت بھی کرتے ہیں۔

حویلی کے باہر پان سگریٹ کی چھوٹی سی دوکان رات گئے تک کھلی رہتی ہے۔بجلی کی روشنی میں لکڑی کے بنچوں پر محلے کے مستری' خرادیے' فٹر' کوچوان ''سینما'' کے بورڈ اٹھانے والے' ڈھول بجانے والے دن بھر کچھ نہ کرنے والے' گھٹیا قسم کے جواریے بیٹھے رہتے ہیں اور بات بات پر ایک دوسرے کو فحش گالیاں بکنے لگتے ہیں۔اس وقت اگر میں گھر میں بہنوں کے درمیاں بیٹھا ہوتا ہوں تو جان بوجھ کر بلند آواز میں بولتا ہوں۔مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ سن رہی ہیں اور میں یوں شرمندہ سا ہو کر سر جھکا لیتا ہوں گویا میں نے انہیں گالی دی ہو۔پنواڑی کی دوکان کے ساتھ ہی ایک نیم پاگل سا آدمی رہتا ہے۔کسی وقت میں اسے دیکھتا ہوں کہ نلکے پر منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے برش اور قلعی کا ڈبہ اٹھا لیا ہے اور اپنی چھوٹی سی دوکان سے باہر نکل کر بازار میں سر جھکائے ہاتھوں سے یونہی ادھر ادھر اشارے کرتا چلا جا رہا ہے'وہ اسی دوکان میں سوتا ہے۔کوٹھڑی میں ایک جھلنگا سی چارپائی بمشکل تمام پھنسی ہوئی ہے۔وہ سارا دن اس پر بیٹھا بیڑیاں پیتا اور تھوکتا رہتا ہے۔محلے میں وہ کسی سے بات نہیں کرتا۔میں نے اسے ہمیشہ خاموش اور تنہا دیکھا ہے۔ وہ ہر راہگیر کو اپنی کھلی ہوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے یوں دیکھتا ہے جیسے اسے پتہ چل گیا ہو کہ وہ اپنے گھر جا کر کسی کا خون کرنے والے ہیں۔پنواڑی کو صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ گورداسپور کا مہاجر ہے۔ایک روز سہ پہر کے قریب بازار میں شور سا مچ گیا۔میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا کہ ایک خوش پوش آدمی اس نیم پاگل کو زمین پر گرائے لاتوں اور مکوں سے بری طرح پیٹ رہا ہے۔وہ

خاموشی سے زمین پر پڑا اپٹ رہا تھا اور اس کے چہرے پر تکلیف اور درد کا احساس تک نہیں تھا۔ گویا لڑائی کا یہ منظر بھی اس کے روزمرہ کے مشاہدات کا حصہ ہو اور وہ چارپائی پر بیٹھا اسے خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد جب میں گھر سے باہر جانے لگا تو میں نے دیکھا کہ وہ چارپائی پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا اور اس کی داہنی آنکھ سوج کر نیلی ہو رہی تھی۔

اس وقت نہ جانے کیوں مجھے اس پر ایک کیمرے کا گمان ہوا جسے کسی نے کھول کر چارپائی پر رکھ دیا ہو۔

لیمپ میں تیل ختم ہو رہا ہے اور میں نے ابھی تک انا پورنا کو اس کے خط کا جواب نہیں لکھا۔ میں یہ کام آج ہی رات کر لینا چاہتا ہوں۔ میں اسے لکھتا ہوں انا پورنا! میں بہت جلد تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ تاڑی کے درخت پر ایک مٹکا میرے حصے کا بھی لگا دو۔ زرد کیلوں کا ایک پور میرے نام پر بھی کاٹ کر رکھ لو۔ بہت جلدی ان گندی گالیاں بکنے والوں اور بے ضرر جسموں پر لاتوں گھونسوں کی بارش کرنے والوں سے بھاگ کر تمہارے پاس آ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ میں اپنے آپ کو مکان کی سیڑھیاں اتر کر بازار میں آتے اور وہاں سے سٹیشن کی طرف جاتے دیکھتا ہوں۔ پھر جیسے بہت سے افسردہ چہرے میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان میں اپنی ماں اور بہنوں کے چہرے صاف صاف دیکھتا ہوں۔ میرے قدم اسی جگہ رک جاتے ہیں اور میں یوں پلٹ کر اپنے گھر کی طرف بھاگ آتا ہوں جیسے انا پورنا جوڑے میں نیلا کی سرخ کلیاں سجائے ہمارے گھر میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہو۔

کھلی کھڑکی میں سے جنوری کی سرد ہوا اندر آ رہی ہے۔

شہر کے مٹیالے سے خاکستری آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ جھلملا رہے ہیں۔ ان کے چہروں پر ہسپتال سے ابھی ابھی اٹھ کر آئے ہوئے مریضوں ایسی کمزور شگفتگی سی ہے۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی ہے۔ اور سنسان گلی کوچوں میں سے کسی وقت پہریدار کی آواز سنائی دے جاتی ہے اور یا کہیں کوئی کتا سخت سردی میں سکڑ کر بھونکنے لگتا ہے۔ کھڑکی میں سے نیچے کٹڑی کوارٹروں کا اونچا نیچا فرش ویران دکھائی دے رہا ہے۔ ابھی ابھی ایک کالی بلی منڈیر چھلانگ لگا کر دوسرے مکان کی چھت پر چلی گئی ہے۔ یہ کوارٹر آمنے سامنے بنے ہوئے ہیں درمیان میں تنگ سا لمبا فرش ہے اور گندی نالی بہتی ہے۔ ایک طرف پمپ لگا ہے جس کے نیچے پانی سے لبالب بھری ہوئی بالٹی پڑی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی دھواں زدہ بوسیدہ کوٹھڑیوں میں درزی لوکوشاپ کا مستری سپاہی ترکھان اور ایک موچی اپنے کنبے سمیت آباد ہے۔ یہ لوگ بڑی ہنسی خوشی ان بلوں میں چوہوں جیسی زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ ان کے مرجھائے ہوئے چہروں والے کمزور بچے گندی نالیوں پر کھیلتے رہتے ہیں اور ان کی عورتیں دالان میں بیٹھی ہونے والے بچوں کے فراک وغیرہ سیتی رہتی ہیں یا اپنے خوشحال رشتہ داروں کے من گھڑت قصے ایک دوسری کو سناتی رہتی ہیں۔ ان کا آپس میں سلوک بھی بہت ہے اور

لڑائی بھی بڑی جلدی ہو جاتی ہے۔ ابھی اگر دو عورتیں پرات میں رکھے مٹروں کے دانے نکال رہی ہیں اور اپنے اپنے خاوندوں کی اچھائیاں گنوا رہی ہیں تو ابھی کسی بات پر وہ ایکا ایکی آگ بگولہ ہو جائیں گی اور ایک عورت وہی مٹروں کی پرات دوسری کے سر پر دے مارے گی۔ دوسری اسے بالوں سے پکڑ کر زمین پر گرا لے گی۔ پھر اگر آپ آنکھیں بند کر لیں تو یوں محسوس ہو گا جیسے کہیں پاس ہی آرا کش مشین چل رہی ہے اور بڑے بڑے شہتیر کٹ کٹ کر نیچے گر رہے ہیں۔ انہیں کوئی چھڑاتا بھی نہیں۔ درزی کی ناک کٹی کالی اور بدشکل بیوی بڑے مزے سے چیتھڑوں کے ڈھیر میں چھپی مشین چلا رہی ہو گی۔ ہندوستانی موچن اپنی کوٹھڑی کے باہر پھسکڑا مارے بیٹھی اپنی بہو سے سر کی مالش کروا رہی ہو گی۔ ترکھان کی لمبے منہ والی ادھ موئی بیوی چولھے کے پاس بیٹھی چپ چاپ آٹا گوندھ رہی ہو گی۔ سپاہی پمپ کے پاس یوں کھڑا انم دے کر اپنی سرکاری پگڑی کی تہیں جما رہا ہو گا گویا وہ وہاں تنہا ہو۔ اس کی نئی نویلی بیوی بڑے اطمینان سے پمپ چلا رہی ہو گی۔ ان کے درمیان دونوں عورتیں مرغیوں کی طرح زمین پر لوٹ رہی ہوں گی۔ ان کے بال کھلے ہوں گے اور منہ سے جھاگ بہہ رہا ہو گا۔ کسی وقت یونہی کسی عورت کے دل میں کچھ خیال آ جائے گا اور وہ آٹا گوندھتے ہوئے یا مشین چلاتے ہوئے صرف اتنا کہہ کر چپ ہو جائے گی:

''چلو اب چھوڑو بھی یہ کنجر خانہ''

کچھ روز ایک دوسرے سے کھچی کھچی رہنے کے بعد وہ ایک دن پھر چارپائی پر بیٹھی ہوں گی اور مٹروں کے دانے نکالتے ہوئے یا شلغم کے قتلوں کے ہار پروتے ہوئے آپس میں گھل مل کر باتیں کر رہی ہوں گی۔ شاید اسی لیے اس چڑیا گھر میں جب کوئی عورت اچانک دوسری عورت کے سر پر پرات یا تسلا اٹھا کر دے مارتی ہے تو باقی عورتیں خاموشی سے اپنے اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں۔

درزی کو کالی کھانسی کا دورہ پڑتا ہے۔ پھر وہ کوٹھڑی چھوڑ کر دالان میں آ جاتا ہے اور نالی میں بیٹھ کر گھٹنوں اچھل اچھل کر کھانستا رہتا ہے۔ اپنی میز پر لیمپ کی دھیمی روشنی میں کچھ لکھتے یا پڑھتے ہوئے مجھے اس کا دھونکنی کی طرح چلتا ہوا اکھڑا اکھڑا سانس اپنے بالکل قریب سنائی دیتا ہے۔ یہ درزی ہڈیوں کا پنجر ہے اور زندگی کی لاش کے اوپر شکستہ پر گدھ کی مانند بیٹھا ہوا ہے۔ سارا دن وہ گھر پر پھٹے پرانے تنبو قناتوں اور لنڈے بازار میں بکنے والے کوٹوں کی مرمت کرتا رہتا ہے۔ دوپہر کو جب اس کا لڑکا اسکول سے واپس آتا ہے تو اس کے سر پر شکر قندی کا تھال رکھ دیتا ہے اور گلی کوچوں میں چکر لگانے بھیج دیتا ہے۔ واپسی پر وہ اس سے پائی پائی کا حساب لیتا ہے۔ اگر ایک دھیلا بھی کم ہو تو جوتا اٹھا کر صحت مند آدمیوں کی طرح اس کی کٹائی شروع کر دیتا ہے۔ اس کی بیوی بدصورت چرب زبان ہے۔ اس کی ناک ایک دفعہ کٹ کر دوبارہ جڑی ہوئی ہے اور وہ دھوپ میں بیٹھ کر دوسری عورتوں کی برائیاں گنتی رہتی ہے۔ جب وہ کسی

عورت کی برائی بیان کرنے لگتی ہے تو یوں پرشوق لہجے میں بولتی ہے جیسے حضرت یوسف سے زلیخا کی پہلی ملاقات کا حال بیان کر رہی ہو۔ اسے نماز کے تمام فوائد اور وضو ٹوٹ جانے کے تمام اسباب یاد ہیں۔ سردی ہو یا گرمی وہ نماز ہمیشہ بیچ والان میں پڑھتی ہے۔ دنیا جہاں کی عورتوں لڑکیوں اور مردوں میں کیڑے نکالنے کے بعد اس کی تان عموماً اس جملے پر ٹوٹتی ہے۔

"لے بہن نماز کا وقت ہو گیا۔۔۔۔۔۔ میں تو چلی وضو کرنے"

ترکھان کا قد چھوٹا اور جسم گٹھا ہوا ہے۔ اس کی ڈاڑھی گھنی ہے اور گردن بھینسے ایسی ہے۔ وہ بلاناغہ ڈاڑھی میں عطر لگاتا ہے۔ آنکھوں میں سرمہ ڈالتا ہے اور صبح سویرے مگدر گھماتا ہے۔ کوٹھڑی کے اندر اس نے ٹین کے صندوق میں جنگ نامہ' قصہ چہار درویش' پنج گنج بوٹا' مرزا صاحباں اور اصلی ہیر رانجھا کے پھٹے پرانے نسخے جمع کر رکھے ہیں۔ دن کے وقت وہ کلدار چوہے کی طرح کوٹھڑی کے اندر باہر گھومتا رہتا ہے۔ کبھی چارپائیوں کی پائینتیاں کس رہا ہے اور کبھی دہلیز پر جما ہوا میل کھرچ رہا ہے۔ جب کوئی کام نہ ہو گا تو چولھا ڈھا کر اسے پھر سے بنانا شروع کر دے گا۔ اس کے اندر فالتو طاقت گیس کی مانند بھری ہوئی ہے۔ اس کی بیوی اس سے بہت ڈرتی اور کبھی اس کی بات میں دخل نہیں دیتی۔ ایک مرتبہ اس نے خاوند کو فرش کی اینٹیں اکھیڑ کر پھر سے جماتے دیکھ کر کہہ دیا تھا:

"ناس مار دیا ہے فرش کا تو"

اس پر ترکھان کی بھینسے ایسی گردن تن گئی تھی اور اس نے مرچیں گھوٹنے والے ڈنڈے سے بیوی کی اتنی مرمت کی تھی کہ وہ ہفتہ بھر کے لیے چارپائی پر پڑی رہی تھی' ان دنوں ترکھان سارا دن اس کے لیے دوائیاں گھوٹا کرتا تھا"

شام کے وقت وہ اپنے اوزاروں کی بوری کندھوں پر ڈال کر سیاہ ٹوپی کی گرد جھاڑتا ہوا کام کی تلاش میں گھر سے نکل پڑتا ہے اور ایک آدھ گھنٹے بعد ہی واپس آ کر یوں چارپائی پر گر پڑتا ہے جیسے کوئی نہر کھود کر آ رہا ہو۔ رات کو وہ ٹین کی کپی جلا کر بیٹھ جاتا ہے اور مرزا صاحباں یا جنگ نامے کا ورد شروع کر دیتا ہے۔ بند کوٹھڑی میں سے نکلتی ہوئی آواز جب میری میز تک پہنچتی ہے تو مجھے خواہ مخواہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا کوئی ٹھٹھیرا ساتھ والے محلے میں بیٹھا تانبا کوٹ رہا ہو۔

سپاہی کی بیوی بڑی نٹ کھٹ ہے۔ اس کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے اور وہ ہر دوسرے روز اپنے خاوند کے ساتھ سینما دیکھنے چل دیتی ہے اور بطخ کی طرح کولھے مٹکا مٹکا کر چلتی اس چڑیا گھر سے باہر نکل جاتی ہے۔ اگلے دن وہ اس کٹڑی کی ہر عورت کے پاس بیٹھ کر کسی نہ کسی طریقے سے رات والی فلم کا ذکر چھیڑ دیتی ہے اور ہیروئن کے کپڑوں اور زیوروں کی تعریفیں شروع کر دیتی ہے۔ وہ بار بار اس واقعے کا ذکر کرتی ہے:

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''جب وہ مجھے اندر لے جانے لگے تو گیٹ کیپر نے کچھ نہ کہا۔ وہ اپنی وردی میں تھے نا۔۔۔۔۔۔۔ہم نے تو کبھی ٹکٹ نہیں خریدا بہن عیشاں۔ فکر نہ کرو میں ایک پاس منگوا دوں گی۔''

صبح سے شام تک وہ چھابڑی والوں سے گلے سڑے پھل خرید کر کھاتی رہتی ہے اور دن میں کئی بار منہ دھو کر آنکھوں میں چمچیوں سے سرمہ ڈالتی ہے۔ کسی وقت وہ چار پائی پر لیٹے لیٹے نہ معلوم کس خیال کے تحت پر شکم مجرا ایسی لمبی انگڑائی لیتی ہے اور ترکھان کی بیوی کو آنکھ مار کر کہتی ہے:

''ہائے دو لتے! میرا تو سارا بدن دکھ رہا ہے۔''

اس کا بدن دکھے یا نہ دکھے لیکن اسے دیکھ کر لوکوشاپ کے چرخ مستری کی دھوتی ضرور کھل جاتی ہے۔ درزی کی ناک کٹی بیوی سیاہن کے تر و تازہ جسم اور خوبصورت پتلے ناک سے جلتی رہتی ہے۔ ایک دن اسے ''پچھی'' فلم کا کوئی گیت گنگناتے دیکھ کر اس نے موٹی موچن کے کان میں کہا:

''دیکھا بوا۔۔۔۔۔۔کتنی اجاش ''عیاش'' عورت ہے۔''

لوکوشاپ کے دبلے پتلے مستری کو دیکھ کر نہ جانے مجھے گنجے بٹیروں کا خیال کیوں آ جاتا ہے۔ وہ مٹیالی رنگت اور لمبے جبڑوں والا درمیانی عمر کا آدمی ہے جو منہ اندھیرے ہی ورکشاپ کے بھونپو کی آواز پر اٹھ بیٹھتا ہے۔ اس کی بیوی پہلے سے ہی کھانا تیار کر رہی ہوتی ہے۔ اندر دھواں ہی دھواں بھر جاتا ہے اور مستری پمپ پر منہ ہاتھ دھوتے ہوئے گنگنائے جاتا ہے:

''تیرے در تے دھونی لائی یار وٹا لے دیا''

کسی وقت وہ جبڑے پھیلا کر غرا اٹھتا ہے:

''روٹی تھیلے میں رکھ کر وہ کمبل میں اچھی طرح منہ سر لپیٹتا ہے اور ڈاکوؤں ایسا حلیہ بنا کر کھڑ کھڑ کرتی سائیکل پر سوار ہو کر لوکوشاپ کی طرف چل دیتا ہے۔ چھٹی کے دن وہ حقہ لے کر اپنی کوٹھڑی کے باہر بیٹھ جاتا ہے اور دوسروں کی ہر بات، ہر کام میں ٹانگ اڑانے لگتا ہے۔ کسی وقت وہ اردو بولتا ہے اور کسی وقت پنجابی۔ سب سے نازک وقت وہ ہوتا ہے جب وہ اردو بولتا ہے۔ کسی زمانے میں وہ فوج میں نائیک رہ چکا ہے۔ اچھی بھلی پنجابی بولتے بولتے اس پر اچانک اردو بولنے کا دورہ پڑتا ہے اور وہ اسے الٹی چھری سے ذبح کرنے لگتا ہے۔ سیاہن کو منہ دھوتے دیکھ کر پہلے وہ دھوتی کس کے باندھے گا اور پھر کہے گا:

''بھائی یہ کونسا صابون ورتتی ہو؟ لیف بائی ہے؟ بڑا نامراد صابون ہے۔ ''میری مانو تو'' لک کس'' ورتا کرو۔ ائی ایسی کش بو چھوڑتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے کہ ہاضمہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

پھر فوراً ہی ناک کٹی درزن کی طرف آ جائے گا۔

"ماسی عیشاں! تو تو اس دنیا میں عیش کرنے آئی ہے۔ پر خدا بھلا کرے کیلا کھا کر "چھلڑ" کوڑے میں پھینک دیا کرو۔ آدمی اس پر سے تلک پڑے تو گٹا ضرور نکل جاتا ہے۔"

پھر حقے کا دھواں چھوڑتے ہوئے یونہی جیسے ہوا سے پوچھے گا:

"وجا کیا ہو گا اس وقت؟"

ہندوستانی موچن سے باتیں کرتے ہوئے وہ بڑے اہتمام سے اردو بولتا ہے۔ وہ اسے جنگ کی باتیں بڑے شوق سے سنایا کرتا ہے۔ گنجان بھنویں سکیڑ کر جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے بٹیرے کی طرح اچانک بول اٹھتا ہے:

"انگریز لفٹین کی بیٹی مر گئی مگر زناب کیا مزال جو اس کی میم کا ایک اتھر و بھی نکلا ہو۔ بس اٹن شن ہو کر قبر پر کھڑی تھی۔ بڑی "صبر ناک" عورت تھی اماں اپنا بودی ان دنوں چھوٹا سا تھا۔ بس اسے وہ میم اٹھائے اٹھائے لیے پھرتی تھی۔ ولایتی بسکٹ اور کاچولیٹ بہت کھلایا کرتی تھی۔"

اتنے میں اگر لوکوشاپ کے بھونپو کی آواز سنائی دے تو وہ ایک دم بات پلٹ دے گا۔ "اپنا بھونپو بولا ہے بس اب ٹرین چل پڑی ہو گی۔ او برٹیم تو میں بھی لگاؤں پر اماں بدن میں آ سک نہیں رہی۔

اچانک ترکھان ریچھ کی طرح بازو ہلاتا اپنی کوٹھری سے نکل کر پوچھے گا:

"مستری کیا بجا ہو گا؟"

مستری جلدی سے کہے گا:

"بھونپو بولا ہے ابھی ابھی پونے دس ہوں گے۔"

"پرانے پونے گیارہ ہوئے نا۔"

اتنا کہہ کر ترکھان بڑے زور سے ناک صاف کرے گا۔ جیسے غسل خانہ صاف کر رہا ہو اور دونوں بازو ہلاتا واپس اپنی کوٹھری میں چل دے گا۔

رات زیادہ سرد اور ویران ہو گئی ہے۔ آسمان پر ستاروں کی لوئیں یوں تیز تیز بھڑکنے لگی ہیں جیسے کسی نے ان کی بتیاں اونچی کر دی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوں۔ پہرے دار کی آواز اب دیر بعد سنائی دیتی ہے۔ گویا وہ سوتے میں بڑبڑا رہا ہو۔ میرے سامنے نیم روشن دالان کی دونوں جانب کوٹھریاں دیا سلائی کی ڈبیوں کی طرح بند اور چپ ہیں۔ پمپ کے نیچے پانی سے بھری ہوئی بالٹی گویا سردی میں وہیں جم گئی ہے۔ کچھ دیر پہلے جو بلی منڈیر پر نمودار ہوئی تھی وہ بھی کہیں جا کر سوگئی ہے۔ اب تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بیمار درزی کے ہونکنے کی المناک آواز کوٹھری سے نکلنے لگتی ہے۔ ابھی یہ آواز زیادہ تکلیف دہ اور دردناک ہوجائے گی اور کھانسی کے بھیانک جھٹکوں میں تبدیل ہوجائے گی۔ پھر درزی دروازہ کھول کر باہر سردی میں سکڑتا ہوا نکل آئے گا اور سنسان دالان کی نالی پر بیٹھ کر دیر تک بھیانک انداز میں کھانستا رہے گا۔ میرا خیال ہے مجھے اس سے پہلے پہلے اناپورنا کو خط لکھ ڈالنا چاہیے۔

میں پیڈ کھول کر قلم دوات میں ڈبوتا ہوں اور ماں کے درد میں کراہنے کی آواز آتی ہے۔ میں اور اناپورنا سہم کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ چپکے سے اٹھ کر ماں کے پاس جاؤں اور اس کے پاؤں دابنے لگوں۔ لیکن میں نے کبھی اس کے پاؤں نہیں دابے۔ میں نے کبھی وہ جنت نہیں دیکھی جو اس کے پاؤں کے نیچے ہے۔ اس معاملے میں ہم دونوں بدقسمت ہیں۔ ابھی ابھی اس نے ایک لمبی اور درد انگیز ہائے کے ساتھ پہلو بدلا ہے۔ چارپائی بڑی تکلیف سے چرچرائی ہے۔ اب پھر خاموشی چھا گئی ہے۔ میری دونوں چھوٹی بہنیں گہری نیند میں سو رہی ہیں۔ کسی وقت ان میں سے کوئی لمبا سانس کھینچ کر خواب میں کچھ بڑبڑاتی اور پھر سو جاتی ہے۔ جیسے خاموشی سے بہنے والے پانی کی سطح پر کچھ بلبلے اچانک اٹھے ہوں اور فوراً ہی پھٹ کر بجھ گئے ہوں۔ چھوٹے بھائی ایک ہی لحاف میں میری میز کی دائیں جانب پڑے ہیں اور سوتے میں گھوڑوں کی مانند خراٹے لے رہے ہیں۔ سب سے چھوٹا اسکول جاتا ہے اور گھر سے اسکول تک ڈیڑھ میل کا راستہ پیدل طے کرتا ہے۔ جس دن پیسے ہوں وہ بس میں سوار ہوجاتا ہے جو انارکلی پہنچ کر چیخ اٹھتی ہیں۔

''ہائے ہائے وے منڈیا ہمیں تو موچی دروازے اترنا تھا۔''

دوسرا بھائی جو اس سے بڑا ہے بجلی کی ایک دوکان پر موٹروں کی وائنڈنگ کا کام کرتا ہے اس پر بجلی کا بھوت بری طرح سوار ہے۔ سوتے میں اگر وہ بڑبڑاتا بھی ہے تو اے سی کرنٹ کے پنکھوں اور جلے ہوئے ڈائنموں کا نعرہ لگاتا ہے۔ کام سے واپس آ کر وہ کاپی پنسل لے کر بیٹھ جاتا ہے اور لیمپ کی روشنی میں نہ جانے الجبرا جیومیٹری کے کیسے کیسے سوال حل کرتا رہتا ہے۔ گھر پر بجلی کی ایک آدھ چھوٹی سی موٹر ضرور موجود رہتی ہے۔ جس پر وہ چھٹی کے دن پیچ کس اور ٹیپ وغیرہ لے کر اپنے تجربات شروع کر دیتا ہے۔ دوکان سے اسے ستر اسی روپے ماہوار ملتے ہیں۔ وہ ایک عرصے سے سائیکل خریدنے کے جتن کر رہا ہے اور ابھی تک نہیں خرید سکا۔ آج کل وہ اس فکر میں ہے کہ کسی نہ کسی طرح دوکان سے بیس روپے ایڈوانس لے کر موچی کو دیئے جائیں تاکہ ایک جوتا بن سکے۔ وہ روزانہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایڈوانس مانگتا ہے اور اس کا استاد روز گلہ میز پر الٹا کر ایک ہی جواب دیتا ہے:

''کاروبار کا تو فیوز اڑ گیا ہے کاکا۔۔۔۔۔۔۔۔ پیسے کہاں سے آئیں؟''

اسے اس بات کا شدید احساس ہے کہ وہ انگریزی نہیں جانتا۔ اس کے خیال میں بجلی کا کام بغیر انگریزی کے کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ وہ پچھلے چار سالوں سے کسی نائٹ اسکول میں داخل ہو کر دو سالوں میں میٹرک کرنے کی سوچ رہا ہے۔

بائیں جانب آرٹسٹ بھائی مسعود کا بستر خالی ہے۔ وہ ابھی تک نہیں آیا یقیناً پرسی مل گیا ہوگا۔ پرسی لدھیانہ کا عیسائی لڑکا ہے اور ان دونوں کا آپس میں بہت یارانہ ہے۔ مسعود ایک مقامی سینما کے بورڈوں پر تصویریں بناتا ہے اور پرسی باٹا کی فیکٹری میں کمپنی کی طرف سے بھیجے ہوئے پلاسٹک کے نمونوں کی نقلیں اتارنے پر ملازم ہے۔ ہفتے کی شام کو دونوں ضرور ملتے ہیں۔ پہلے وہ کسی سستے سے ہوٹل میں جا کر چائے کا ایک پیالہ پیتے ہیں' پاسنگ شو کی ایک ڈبی لیتے ہیں اور کوئی نہ کوئی انگریزی فلم دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ فلم دیکھنے کے بعد وہ سینما ہال سے باہر نکل کر لارنس باغ میں آ جاتے ہیں اور باغ کی پرسکون سایہ دار روشوں پر قدم قدم چلتے ہوئے وہ فلم کے قدرتی مناظر اور اس کے ساتھ دکھائے گئے کارٹون کے شوخ اور تر و تازہ رنگوں پر آہستہ آہستہ باتیں کرتے جاتے ہیں۔ پھر وہ دونوں خاموش ہو جاتے ہیں اور تاروں کی چھاؤں میں نیم روشن دھندلا راستہ خاموشی سے طے کرتے ہیں۔ پھر کسی جگہ گھاس پر سگریٹ پھینک کر گھنے درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے اپنے آپ ہی پرسی دھیمی اور خواب ایسی آواز میں مسعود کو اپنے وطن کے گلی کوچوں کی باتیں سنانا شروع کر دے گا۔ اس کا لہجہ آہستہ آہستہ سوگوار ہوتا جائے گا اور گھٹی گھٹی پیازی آنکھیں اندھیرے میں انگاروں کی طرح چمکنے لگیں گی۔

''ہمارے احاطہ میں تمام عیسائی رہتے تھے۔ گرجا گھر کی خوبصورت عمارت ہمارے پاس ہی تھی۔ ہم اتوار کی صبح کو دھلے ہوئے کپڑے پہن کر عبادت کے لیے وہاں جایا کرتے تھے۔ سپید ڈاڑھی والا پادری' بائیبل کی کوئی آیت پڑھنے لگتا اور لمبے اور اونچے روشن دانوں میں سے دن کی روشنی آبشار کی مانند ہم پر گر رہی ہوتی۔۔۔۔۔۔۔ کرسمس کے تہوار پر ہمارے احاطہ میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی۔ ہم ٹولیوں کی صورت میں ہر گھر جا کر کیک اور پیسٹریاں اڑایا کرتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ میری ماں اسی گرجا گھر کے عقب میں دفن ہے۔ وہ ایک دن بچوں کو پڑھا کر واپس آ رہی تھی کہ ایک فوجی ٹرک کی لپیٹ میں آ کر وہیں مر گئی۔ اس کے بعد میری بہنوں نے اپنے آپ شادیاں کر لیں اور ایک جبل پور اور دوسری چٹا گانگ چلی گئی۔ اب میں یہاں اکیلا ہوں اور عرصے سے اپنی بہنوں کی شکل تک نہیں دیکھی۔ انہوں نے بھی کبھی کوئی خط نہیں لکھا۔۔۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کیسا زمانہ آ گیا ہے۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھوڑی دیر بعد وہ مسعود کو چرسیوں اور پوستیوں کے لطیفے سنانے شروع کر دیتا ہے اور ان کے قہقہوں کی گونج سے درختوں میں آرام سے سونے والے پرندے پریشان ہو جاتے ہیں۔

مسعود اور پرسی ایک دوسرے کی ضرورتوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔ ایک روز پرسی کو تین روپوں کی ضرورت تھی۔ مسعود کی جیب خالی تھی اور ان دنوں وہ دن میں صرف دو سگریٹ پیا کرتا تھا۔ لیکن وہ پرسی کو پریشان نہ دیکھ سکا۔ اس نے گھر آ کر سب کے سامنے ٹیفن کیریر اٹھایا اور بازار جا کر ساڑھے چار روپوں میں بیچ ڈالا۔ تین روپے اس نے پرسی کو دے دیئے اور باقی پیسوں میں کیک کے چند ٹکڑے اور پاسنگ شو کی دو ڈبیاں لیتا آیا۔ آتے ہی اس نے خوشی کا ایک نعرہ مارا اور سماوار میں چائے ڈال کر سب کے درمیان بیٹھ کر زور شور سے باتیں شروع کر دیں۔ اس نے بڑے زوردار الفاظ میں ماں کو یقین دلایا کہ وہ اگلی تنخواہ پر ایک ٹیفن کیریر ضرور خرید لائے گا۔ ماں کو یقین آ گیا۔ وہ اگر کمزور الفاظ بھی استعمال کرتا تو ماں یقین کر لیتی۔ مائیں بہت جلد یقین کر لیتی ہیں۔ پھر چائے کی خوشگوار مہک اور مسعود کی دلچسپ باتوں نے کمرے میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ چائے کی تین پیالیاں پی کر مسعود نے بالٹی گود میں رکھی اور اسے طبلے کی طرح بجاتے ہوئے گانے لگا:

رہا کر دے مجھے صیاد ابھی فصل بہاری ہے

کسی وقت وہ بے حد اداس ہو جاتا ہے۔ سگریٹ سلگا کر وہ ٹانگیں باورچی خانے کی دیوار سے لگا دیتا ہے اور بڑے خاموش' گلہ آمیز لہجے میں بول اٹھتا ہے:

''یہاں جب آؤ دال پکی ہوتی ہے۔ کیسا انقلاب آیا ہے۔ ہماری یہاں کوئی قدر نہیں ہے۔ اب میں ضرور رنگون چلا جاؤں گا۔''

اس رات وہ میرے پاس بیٹھا گھنٹوں مجھ سے رنگون کی بارش میں بھیگی ہوئی سڑکوں' سبزے سے ڈھکی ہوئی جھیلوں اور دریا میں لہرانے والے بانس کی لمبی لمبی شاخوں کی باتیں سنتا رہا۔ پھر جب اس پر پاسپورٹ کی الجھنوں' برما کی سیاسی صورت حال اور رنگون کی شدید مہنگائی کا انکشاف ہوتا ہے تو وہ ناامید ہو کر سر دیوار سے لگا دیتا ہے اور صرف اتنا کہہ کر چپ ہو جاتا ہے:

''اب تو اسی ڈربے میں عمر گزرے گی۔''

وہ عمر میں مجھ سے تین چار سال چھوٹا ہے لیکن ہمارے تعلقات دوستوں ایسے ہیں۔ اس کی بڑی خواہش ہے کہ ہم دونوں برما' ملایا اور چین کا پیدل سفر کریں۔ اسے جنوب مشرقی ایشیا سے بے حد محبت ہے' شاید پچھلے جنم میں وہ رنگون' پیکن' سائیگاؤں یا سنگاپور کے کسی غریب واڑے میں پیدا ہوا تھا۔ مجھ سے ان علاقوں کی باتیں یوں دلچسپی اور بے تابی سے سنتا ہے گویا پردیس میں بیٹھا اپنے وطن کی

خبریں سن رہا ہو۔ بعض آدمی اتفاق سے بلکہ غلطی سے غلط مقام پر پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے وطن میں بھی اجنبیوں ایسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میرا چھوٹا بھائی بھی ایسے ہی بدقسمت لوگوں میں سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اسے بھی اپنے لنکا لے جاؤں گا۔ کندر گام اور کال کے جنگلوں میں وہ شاخ وتر وتازہ رنگوں کا ایک اجوم دیکھے گا۔ وہاں اس کی تصویروں میں زندگی کا شعلہ بھڑک اٹھے گا اور اس کا آرٹ اپنی بلندیوں پر جا پہنچے گا۔ مجھے انا پورنا کو اسی خط میں لکھ دینا چاہیے کہ میں اپنے ساتھ آرٹسٹ مسعود کو بھی لا رہا ہوں۔ انا پورنا کتنی اچھی ہے اور اس کا سفید بالوں والا محنتی باپ اور کالی کالی چمکیلی آنکھوں والا منو۔۔۔۔۔۔۔ یہ دنیا کتنی اچھی ہے۔ جہاں انا پورنا ہے' اس کا باپ اور منو ہے اور جھیل نندا پر ڈولنے والی کنول کی زرد کلیاں ہیں اور کیلے کے درخت ہیں اور ناریل کے جھنڈ ہیں اور رات بھر کھانسنے والا درزی ہے اور سینما کے بورڈ بنانے والے آرٹسٹ ہیں اور گندگی سے بھرے ہوئے ٹرک ہیں اور چپ چاپ مار سہہ جانے والے نیم پاگل ہیں۔ یہ دنیا کتنی اچھی ہے۔ انا پورنا کے سیاہ بالوں سے بھی زیادہ تاریک اور خوبصورت اور پر پیچ! ان لوگوں نے اچھا کیا جو کولمبو چھوڑ کندر گام واپس چلے گئے۔ چائے کے بے جان کارخانوں اور بوریلا سٹریٹ کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں سے نکل کر بانس کے درختوں کے درمیان سے ہو کر گزرنے والی نازک پگڈنڈیوں پر چلنے والوں کے قدموں تلے میں کنول اور گلاب کی پتیوں کا فرش بچھانا چاہتا ہوں۔ انا پورنا لنکا کی جفاکش بیٹی ہے۔ اس نے زندگی کے تین بدنصیب سال کارخانے میں کام کر کے' موٹے چاول کھا کر اور تیل ملا پانی پی کر مچھروں اور کھٹملوں کے درمیان بسر کیے ہیں۔ اس چھوٹے سے کنبے نے اپنے گاؤں کے باغات اور مختصر سی زمین حاصل کرنے کے لیے وقت کی تین سنگلاخ اور سنگین چٹانوں کو کلہاڑیوں سے کاٹا ہے۔ انا پورنا کا رنگ کالا پڑ گیا تھا اور اس کے نرم ہاتھوں پر بیائیاں پھوٹ آئی تھیں اور اس کا باپ کمر جھکا کر چلنے لگا تھا۔ یہ تین سال گویا انہوں نے جلاوطنی میں بسر کئے تھے۔ دوسرے سال وہ ہفتہ بھر کے اپنے گاؤں کندر گام گئے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ انا پورنا مجھ سے کئی بار اپنے گاؤں والے مکان' جھیل نندا پر کھلے ہوئے نیلے پھولوں' ناریل کی ترچھی شاخوں میں جھانکتے ہوئے جزیرے کے ستاروں اور تازہ اور ٹھنڈی تاڑی اور سنہری اناس کے شیریں قتلوں کا ذکر کر چکی تھی۔ ہم نے کولمبو سے کندر گام تک مل کر سفر کیا اور ایک ہفتہ شہر سے سینکڑوں میل دور جزیرہ سنگلدیپ کے وسطی جنگلوں میں بانس کے سبز جھنڈوں اور کیلے کے زرد گچھوں کے درمیان گزار کر جب ہماری گاڑی آگ اور دھواں اگلتی کولمبو کے بڑے جنکشن میں داخل ہوئی تو مجھے محسوس ہوا گویا میں خاموش وا داس آنکھوں والی ہرنیوں کے جھرمٹ سے بچھڑ کر پاگل خچروں کے وارڈ میں آ گیا ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر اس کیمرے کا گمان ہو رہا تھا جس کے اندر دنیا کی حسین ترین تصویروں کا عکس موجود ہو اور میں اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہوں سے بچا رہا تھا۔ شہر کی مصنوعی روشنیوں کا سایہ پڑتے ہیں انا پورنا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا چہرہ پھیکا اور پژمردہ سا ہو گیا تھا اور مجھے خواہ مخواہ اس کی آنکھوں کے گرد نیلے نیلے حلقے دکھائی دینے لگے تھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی انا پورنا ہے جو دوروز پہلے کیلے کے چوڑے چوڑے پتوں کے سائے میں جوڑے میں کنول کی گلابی کلیاں سجائے، چاندنی کی شطرنج پر ناچ رہی تھی اور اس کے نیم عریاں شانوں کو چاندنی کے بے شمار ننھے منے ہونٹ چوم رہے تھے۔

شہر چھوڑ کر گاؤں چلے جانے پر میں انا پورنا کو مبارک بادی کا خط لکھنا چاہتا ہوں اور اسی خط میں اسے یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ عنقریب کندر گام پہنچ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ میں نے قلم ایک بار پھر سیاہی میں ڈبویا ہے اور اب درزی کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر باہر دالان میں آ گیا ہے اور نالی پر بیٹھا بھیانک انداز میں کھانسنے لگا ہے۔ مجھے اس کی کھانسی کے ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا ماں پانی مانگ رہی ہے۔

میں اسے پانی پلا رہا ہوں اور لیمپ کی کمزور روشنی میں اس کا بیمار چہرہ بیماروں ایسا دکھائی دے رہا ہے، سپید بالوں پر جیسے کسی نے راکھ ڈال دی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ہم دونوں بھائی چلے گئے تو اس کا کیا بنے گا؟ چھوٹی بہنوں میں سے ایک بڑبڑانے لگی ہے اور خواب میں اپنی کسی سہیلی کو پوری آستین کے سویٹر کا نمونہ بتا رہی ہے۔

میں دوبارہ اپنی میز پر آ بیٹھا ہوں اور اب انا پورنا کا خط پہلے سے زیادہ مدھم ہو گیا ہے اور جھیل نندا پر گرد سی اڑنے لگی ہے اور کنول کے پھول جھیل میں غوطہ لگا گئے ہیں اور بانس کے درختوں کے سارے پتے زمین پر گر پڑے ہیں۔ یہ ایک ہی پل میں کیا سے کیا ہو گیا ہے؟ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں یہ گھر نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ گھر مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ میں انا پورنا کو لکھ دونگا انا پورنا! سنگلد یپ کے پر اسرار جزیرے کی ملکہ! تمہارا آسمان میری زمین کے لیے نہیں ہے۔ تمہارے گیت میرے ساز پر نہیں گائے جا سکتے ہیں۔ تمہارے چشمے میری بنجر زمین پر نہیں پھوٹ سکتے اور تمہارے بھیجے ہوئے کنول کے پھول اس آب و ہوا میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ میں انہیں خشک پتوں کی طشتریوں میں تمہارے جزیرے کی طرف تمہاری جھیلوں کی طرف واپس بھیج رہا ہوں اور میرے بازو تمہاری طرف آخری بار اٹھ کر نیچے گر رہے ہیں۔ بانس کے سایوں میں گذرنے والی پگڈنڈیوں اور چاندنی میں سوئی ہوئی جھیلوں اور بارش میں دھلے ہوئے تازہ پھولوں کے درمیان سدا خوش رہو اور مسکراتی رہو۔ برسات کے بادل جب تمہارے مکان کے قریب سے گزرتے ہوئے تمہارے سنہری ہونٹوں کو چھوئیں تو مجھے بھی یاد کر لینا۔ گہری خاموش جزیرائی رات میں جب ستاروں کے نیلے پھول تاڑ کے نوکیلے پتوں میں سے جھانکیں تو انہیں میرا محبت بھرا اسلام کہنا اور پو پھٹے تازہ ہوا کا پہلا جھونکا جب ملیا کی کلیوں کی مہک لیے تمہارے دروازے پر دستک دے۔ تو اسے کہنا میں وہاں کبھی نہیں آ ؤں گا۔ جھیل نندا کے میلے پر جب سنہال کی ادھ کھلی کنواریاں کنول کے ہار

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہن کر اپنے سیاہ جوڑوں میں موگرہ کی سرخ کلیاں سجانے لگیں تو ان کے ٹخنوں پر بندھے ہوئے نیلے پھولوں کا منہ چوم کر انہیں کہنا کہ ایک جلا وطن ان سے سینکڑوں میل دور درزیوں' موچیوں' نائیوں' کوچوانوں اور گندگی سے بھرے ٹرکوں کے درمیان میز پر لیمپ جلائے بیٹھا ہے اور اس کی پلکوں پر ان کی سہانی یادوں کے آنسو تھر تھرا رہے ہیں۔

میں بجھا ہوا سگریٹ سلگا کر یہ جملے انا پورنا کو لکھنے لگا ہوں۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھ سے کچھ نہیں لکھا جا رہا۔ جیسے یہ کسی اجنبی زبان کے جملے ہوں۔ ایسی زبان جو میں نے کبھی نہ سنی ہو' کبھی نہ پڑھی ہو' کبھی نہ لکھی ہو۔ اس کے باوجود مجھے یہ جملے لکھنے پڑیں گے اور میں ابھی کندرگام نہ جا سکوں گا' کولمبو نہ جا سکوں گا۔ ابھی نیلم اور سعیدہ کا بیاہ رچانا ہے اور زمانہ بڑا نازک ہے۔ ابھی چھوٹے بھائی کو انگریزی کی تعلیم حاصل کرنی ہے کیونکہ انگریزی کے بغیر بجلی کا کام کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ ابھی بیڑیاں پینے والے نیم پاگل کو ہر کوئی مارتا ہے' ابھی درزی نے راتوں کو اٹھ اٹھ کا کھانسنا بند نہیں کیا۔ ابھی وہ زندہ ہے۔ ابھی میری ماں زندہ ہے۔ ابھی دو ماہ سے مکان کا کرایہ ادا نہیں کیا۔ ابھی ایک دفعہ اور مکان تبدیل کرنا ہے۔ میں ابھی کہیں نہیں جا سکتا۔ میں ابھی کہیں کیسے جا سکتا ہوں؟

پھر بھی ------ جانے کیوں' دل میں کسی وقت دفعتاً ایک شعلہ سا بھڑک اٹھتا ہے اور اس کی تیز روشنی میں ہر تاریکی چمک اٹھتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ روشنی کے اس سیلاب میں اپنی ماں' بھائی اور بہنوں کا ہاتھ پکڑ کر لنکا کی طرف لے اڑوں۔ آج سے کئی ہزار سال پہلے اس برِاعظم نے لنکا کی طرف پتھروں کا تحفہ بھیجا تھا' میں روشنی اور پھولوں کے ڈھیر لے کر سنگلدیپ کے جزیرے میں پہنچ جاؤں اور انا پورنا کو کہوں' دیکھو میں اپنی تمام زنجیروں سمیت تمہاری طرف بھاگ آیا ہوں اور یہ میری ماں ہے اور یہ چھوٹی بہن ہے اور یہ بڑی بہن ہے' یہ چھوٹی زنجیر ہے' یہ بڑی زنجیر ہے۔

پھر ہم جھیل کنارے آ جائیں۔ میں اپنے ہاتھ سے کنول کے سپید پھولوں کا تاج بنا کر ماں کے سر پر رکھ دوں اور بہنوں کے گلے میں سرخ کلیوں کا ہار پہنا دوں اور آرٹسٹ بھائی کی کلائیوں پر منیلا کی گلابی کلیاں باندھ دوں اور ایک ہاتھ انا پورنا کو دے کر دوسرے سے اپنے بھائی کو' ماں کو اور بہنوں کو تھام کر رقص کی والہانہ گردشوں میں گم ہو جاؤں۔ ہمارے اوپر بانس کی نوکیلی اور نازک ٹہنیاں ملایا سے آنے والی ہواؤں میں جھول رہی ہوں اور ان کے اوپر ستاروں کے نیلے پھول ہوں اور چاندنی کا نور ہو اور ہمارے قدموں تلے شبنم کے موتی ہوں اور ایک طرف جھیل ہو' ہرے ہرے لمبے لمبے ڈنٹھلوں والے کنول ہوں اور ناریل کے جھنڈ ہوں اور دوسری طرف خوابیدہ جنگل ہوں اور اناناس کے باغ ہوں اور میں ماں سے کہوں ------ ماں رقص کی ہر تھرکن پر زندگی کے درخت سے غم کے گندے پھل جھاڑتی جاؤ۔ ہم بانس اور کیلے کے درختوں کے درمیان آ گئے ہیں۔ ہم رات کو مچھلیاں پکڑ کر کھائیں گے اور صبح کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شہد سے بھی میٹھا ناریل کا رس پئیں گے۔ یہاں کوئی درزی رات بھر اپنی کھانسی سے ہمیں بے چین نہیں کرے گا اور یہاں کوئی مالک مکان مہینے کی پہلی تاریخ کو ہماری سیڑھیوں میں آ کر نہیں بیٹھے گا اور اب ہم کبھی مکان تبدیل نہیں کریں گے۔۔۔۔۔۔۔ دیکھو سہالی دوشیزاؤں نے سنداودیوی کی یاد میں چاندنی کا گیت چھیڑ دیا ہے۔

سنو۔۔۔۔۔۔ سنو ماں!

چاند نکل آیا ہے
بانس کے پتے چمکنے لگے ہیں
سندر کنواریاں ناچ رہی ہیں
ہم تجھے لینے آئی ہیں مسافر
یہ پھول قبول کر
یہ پھول قبول کر
یہ پھول قبول کر

◆◆◆

پیارے دوست

جس وقت تمہیں میرا خط ملے گا۔ میں یہاں سے جا چکا ہوں گا۔

میں یہ خط ایک پہاڑی نالے کے چھوٹے سے پل پر بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ نالے کا نیلا اور شفاف پانی چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹکراتا ہوا گزرتا رہا ہے میرے آس پاس اونچے اونچے اداس درخت کھڑے ہیں۔ ان کے پتے خشک ہو کر سرخ رنگت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ خزاں کا رنگ ہے۔ میرے اوپر نکھرا ہوا گہرا نیلا آسمان ہے اور بادلوں کے سپید ٹکڑے بھوری بھوری پہاڑیوں کی چوٹیوں کو چومتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ دھوپ گرم اور چمکیلی ہے پھر بھی سردی بڑھ رہی ہے۔ پچھلے دو دنوں سے سفر میں ہوں۔ دماغ میں ابھی تک لاری کا انجن چل رہا ہے۔ یہاں سے میرا پہاڑی گاؤں سات کوس کی مسافت پر ہے۔ یہ راستہ خطرناک پہاڑی پگ ڈنڈیوں پر سے ہو کر گزرتا ہے اور مجھے پیدل ہی طے کرنا پڑے گا۔ مجھے اس خیال سے بے اندازہ مسرت ہو رہی ہے کہ آج شام کو سورج غروب ہوتے ہوئے مجھے اپنے دیہاتی گھر میں اپنی نیک دل ماں اور بہنوں کے ساتھ دیکھے گا۔ میرے پاس سوائے چمڑے کے تھیلے کے اور کچھ سامان نہیں۔ اس تھیلے میں دو ایک کتابیں' آدھی ڈبل روٹی اور تمباکو کا ڈبہ ہے۔ تمہیں خط لکھ کر میں اسے سڑک کنارے کے لیٹر بکس میں ڈال دوں گا۔ جھک کر نالے کا نیلا شفاف پانی پیوں گا اور گاؤں کی طرف چل پڑوں گا۔ میں نے اپنی ماں کو آنے کی اطلاع نہیں دی۔ میں نے اسے کوئی خط نہیں لکھا۔ تم میرے کافی ہاؤس سے اچانک غائب ہو جانے پر حیران ہو رہے ہو گے اور وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔

میں ابھی ابھی لاری سے اترا ہوں۔ میں نے اڈے پر' ایک معمولی سے چائے خانے میں چائے کا پیالہ پیا ہے' اور کھلی اور تنہا جگہ پر بیٹھ کر تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ یہ جگہ تمہارے شہر سے کافی دور ہے۔ یہاں پر لاری کا سفر ختم ہو جاتا ہے اور پیدل سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں کافی ہاؤس ختم ہو جاتا ہے اور اصلی دودھ اور مکھن کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ اس سے آگے کوئی باقاعدہ سڑک نہیں۔ صرف ٹیلے ہیں' تنگ و تاریک گھاٹیاں ہیں۔ اونچی اونچی ہیبت ناک چٹانیں ہیں' خطرناک راستے ہیں' دشوار گزار پگ ڈنڈیاں ہیں۔ کوئی مال نہیں' کوئی میکلوڈ نہیں' کوئی انارکلی نہیں' کوئی ٹی ہاؤس اور کیفے ڈی وائیٹ نہیں۔

شہر بہت پیچھے رہ گیا ہے اور میں اپنے چمڑے کے تھیلے سمیت بہت آگے نکل آیا ہوں۔ میں ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹ رہا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوں۔ میں گھنٹیوں کی آوازیں سن رہا ہوں۔ بھولے بسرے راستے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے ہر شے دکھائی دے رہی ہے۔ مجھے ہر بات سنائی دے رہی ہے۔ گرتے پتوں کی سسکیاں' چمکیلا آسمان' بہار کی صبح کا آغاز' سردیوں کی شام کا اختتام' سڑک کنارے اگا ہوا زرد پھول' کسی پرندے کی اڑان اور نیچے لاریوں کے اڈے سے آتی ہوئی لوگوں کی ہلکی آوازیں' میں ایک بار پھر اپنے دروازے پر زندگی کی دستکیں سن رہا ہوں۔ شہر میں بسر کئے ہوئے دن' وقت کی سطح پر مردہ مچھلیوں کی مانند ابھر آئے ہیں مجھے ان دنوں' ہفتوں' مہینوں اور سالوں پر' جو میں نے تمہارے بلند عمارتوں' پرشور بازاروں اور تنگ و تاریک گلیوں والے شہر میں گزارے ہیں' ان قبروں کا گمان ہو رہا ہے جن کے کتبے گر چکے ہوں اور جن پر کبھی کوئی فاتحہ پڑھنے نہ آیا ہو۔ جیسے یہ دن' ہفتے' مہینے اور سال کسی دوسرے شخص کی ملکیت تھے جو کبھی شہر میں رہتا تھا اور ایک عرصہ ہوا مر چکا ہے۔

پہاڑی گاؤں میں' کھیتوں' باغوں چشموں اور گھاٹیوں میں اچھل کود کر گزارے ہوئے بچپن کے علاوہ مجھے ہر یاد غیر حقیقی اور غیر یقینی محسوس ہو رہی ہے۔ مثلاً نرگس سے میری آخری ملاقات!

جب اس نے کیفے وائٹ میں کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم اداس کیوں ہو پال؟ کیپٹن جہانگیر سے میری منگنی کی بات ابھی پکی نہیں ہوئی اور اگر ہو بھی گئی تو اس سے میری محبت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میری محبت اس طرح زندہ رہے گی۔ میں تمہیں اسی گرم جوشی سے چاہتی رہوں گی۔ شادی تو ایک کاروبار ہے۔ محض کاروبار۔۔۔۔۔۔۔ اور تمہارے پاس کوئی کار نہیں۔ کاش تم نے اس دوران میں پیسے جمع کر کے ایک موٹر سائیکل ہی خرید لی ہوتی۔ کم از کم میرے ماں باپ اپنے رشتہ داروں کو یہ تو کہہ سکتے کہ ان کے داماد کے پاس موٹر سائیکل بھی ہے۔ تم تو میرے ڈیڈی کو جانتے ہی ہو۔ وہ کتنے وضع دار ہیں۔۔۔۔۔۔۔ کاش! میرا بیاہ تم سے ہو سکتا کاش میں تمہاری کار میں بیٹھ کر کیفے وائٹ آیا کرتی۔۔۔۔۔۔۔''

یہ ملاقات مجھے الف لیلہ کا کوئی قصہ معلوم ہو رہی ہے۔ میں اس کی بات سن رہا ہوں۔ اسے اپنے سامنے بالوں میں نرگس کے پھول سجائے دیکھ رہا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں جلی ہوئی کافی کے تاریک ڈورے ہیں اور برش کی ہوئی پلکوں پر کانٹوں کا گمان ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ ہوا ہو۔ میرے ذہن میں اس وقت نرگس کی صرف ایک تصویر' صرف ایک موم بتی روشن ہے جب بارہ سال پہلے ہم اپنے گاؤں میں چشمے کے کنارے ایک گرے ہوئے درخت پر بیٹھے تھے۔ ہمارے پاؤں پانی میں تھے اور ہمارے اوپر درختوں کے پتے رقص کرتے گر رہے تھے۔ وہ جھولی میں جمع کی ہوئی کھمبیوں کی چھتریاں بنا رہی تھی اور میں اپنی غلیل کا ٹوٹا ہوا فیتہ جوڑ رہا تھا۔ خزاں کی خشک اور بے رنگ سی ہوا چل رہی تھی اور پانی کی سطح پر گرے ہوئے پتے چکر کھا رہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھے۔ یہ موم بتی اتنی روشن ہے' یہ تصویر میرے اس قدر قریب ہے کہ مجھے یقین نہیں آ رہا یہ بارہ سال پہلے کی بات ہو۔
یہ منظر میری یادوں کی انگشتری میں نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔

میرے پیارے دوست! نرگس دولت مند باپ کی لڑکی ہے۔ اسے واقعی کسی جہانگیر کی ضرورت تھی۔ میں اسے کیا دے سکتا تھا۔ اور پھر کیپٹن جہانگیر اسے چاہتا بھی تھا۔ تمہیں یاد ہے اس روز کلب میں وہ نرگس کی خوبصورتی کی کتنی تعریف کر رہا تھا۔ تمہیں نے تو مجھے بتایا تھا کہ وہ کہہ رہا تھا۔

''نرگس بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ اس کی شکل لائیڈز بنک کی عمارت سے ملتی جلتی ہے'' کیپٹن جہانگیر اس سے زیادہ نرگس کی تعریف نہیں کر سکتا تھا۔ اور میرے خیال میں نرگس کی اس سے زیادہ تعریف ہو بھی نہیں سکتی۔ اس نرگس کی جو محبت نبھانے کا وعدہ مجھ سے کر رہی تھی اور شادی کیپٹن جہانگیر سے۔ جو کافی ہاؤس آنے سے پہلے ڈیڑھ گھنٹہ بھنویں بنانے میں صرف کرتی ہے اور تین مختلف صابنوں سے منہ دھوتی ہے۔ جو اپنی زبان میں اس لیے بات نہیں کرتی کہ لوگ اسے جاہل نہ سمجھ بیٹھیں۔ جو ڈنر کے بعد محض کھانا ہضم کرنے کی خاطر قہقہے لگاتی ہے اور جس کے چہرے پر میکس فیکٹر کی چمک ہے اور بالوں میں پیرا کسائڈ کی سرخی ہے اور آنکھوں میں کاغذ کے پھول ہیں اور گلے میں مصنوعی موتیوں کی مالا ہے۔ اس نرگس میں اور میرے ساتھ مل کر پرندوں کے گھونسلے اجاڑنے والی اور کھمبیوں کی چھتریاں بنانے والی نرگس میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ وہ اگر پھولوں کو چھو کر گزر جانے والی ہوا تھی تو یہ کلب میں پھیلا ہوا تمباکو کو دھواں ہے۔ وہ اگر جھیل میں کھلا ہوا کنول تھی تو یہ کیفے وائیٹ کی میز پر رکھا ہوا ایش ٹرے ہے اور وہ اگر وادیوں سے رخصت ہوتے ہوئے چرواہوں کے الوداعی گیت تھے تو یہ جیومیٹری کا ایک سوال ہے۔

''خط مستقیم پر عمود گراؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ نقطہ میم خط سے باہر ہے' اور عمود کے نیچے سے خط مستقیم کھینچ لو' نقطہ میم خط کے اندر ہے

کافی ہاؤس کی نرگس سر سے پاؤں تک جیومیٹری ہے اور میں اس مضمون میں ہمیشہ کمزور رہا ہوں۔ گاؤں کی نرگس بچوں کی خوبصورت نظم تھی۔ اس کی خاموشی اس کی باتوں سے زیادہ پر اثر تھی۔ اس کی بے علمی اس کے علم سے زیادہ عظیم تھی اور اس کا سکون اس کی حرکت سے زیادہ بامعنی تھا۔ اس نرگس کا خیال میرے ذہن میں گرجا گھروں میں اپنی ملائم روشنی بکھیرنے والی موم بتیوں کی یاد روشن کر دیتا ہے اور کیپٹن جہانگیر کی نرگس سے مجھے تاش کے کھیل دکھانے والوں کا خیال آ جاتا ہے۔

''آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟''

''حکم کی ملکہ''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''پھر دیکھئے''

''اوہ۔۔۔۔۔۔۔یہ تو حکم کا غلام ہے''

''پھر دیکھئے''

''ارے۔۔۔۔۔۔۔یہ تو اینٹ کا یکہ ہے''

ہاں اسی طرح۔۔۔۔۔۔۔بالکل اسی طرح۔۔۔۔۔۔۔کبھی حکم کی ملکہ' کبھی حکم کا غلام اور کبھی اینٹ کا یکہ۔ اور کبھی یکے پر لدی ہوئی اینٹیں' پتھر' کوئلے' کوڑا کرکٹ ابھی کچھ اور ابھی کچھ۔ ابھی زمین پر' ابھی آسمان پر' ابھی طہران میں تو ابھی چک جھمرہ میں۔ ابھی لارنس باغ میں تو ابھی' چنگڑ محلے میں۔ ایک منٹ پہلے گل یاسمن کے ڈبے میں اور ایک منٹ بعد ریل کے انجن میں' فائر مین کے پاس۔۔۔۔۔۔۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔۔۔۔۔۔۔یہ خزاں کے اداس دن ہیں اور چناروں کے پتے خشک ہو کر سرخ' زرد' گلابی اور پیازی ہو جاتے ہیں۔ کچھ گر رہے ہیں اور کچھ گر چکے ہیں۔ ابھی ابھی ایک زرد پتا میری جھولی میں آن گرا ہے' اور مجھے خود بخود وحیدہ کا خیال آ گیا ہے وحیدہ! جو نرگس کے بعد میری زندگی میں داخل ہوئی۔ جسے پہاڑوں پر پھیلی ہوئی نیلی نیلی دھند اور چناروں کو چھو کر گزرنے والے بادلوں سے والہانہ محبت تھی' جو سردیوں کی ٹھٹھرتی راتوں کو گرم لحاف سے نکل کر اپنے کوٹھے پر نیلگوں چاندنی کا نظارہ کرنے جایا کرتی تھی۔

اور جس نے کہا تھا:

''میں سارا یورپ گھومنا چاہتی ہوں۔ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔ ابھی تو سوئٹرز لینڈ کے پہاڑوں' روم کے جزیروں' فرانس کے جنگلوں اور ہنگری کی وادیوں میں آوارہ گردی کرنی ہے۔ کہاں شادی کے چھوہارے اور کہاں روم کے سنگترے۔

میں تو چاہتی ہوں کہ ساری دنیا کا چکر لگاؤں اور جب تھک جاؤں تو ایلپس کے دامن کی کسی پر سکون سرسبز وادی میں بسیرا کر لوں اور ایک چھوٹے سے لکڑی کے خوبصورت کاٹج میں بھیڑ بکریوں' معصوم آنکھوں والے چرواہوں اور انگور کی نازک بیلوں کے درمیاں زندگی کے باقی دن گزار دوں۔ اور اگر شادی کروں تو کسی ایسے لڑکے سے جو میری طرح پھولوں' پہاڑوں ستاروں اور چاندنی راتوں کا شیدائی ہو۔ جو میرا خاوند کم اور دوست زیادہ ہو۔ جو میری آزادی اور خوش فکری میں کبھی مخل نہ ہو۔ جس کے ساتھ مل کر میں اپنی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کا تاج محل تعمیر کر سکوں اور اپنی پژمردہ زندگی کے تمام خاکوں میں شوخ اور تر و تازہ رنگ بھر سکوں۔ ہم گولڈن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کارڈ رائے چلونیں اور وائٹ سپورٹس جرسیاں پہن کر شاداب مرغزاروں اور خوبصورت پہاڑی راستوں پر زندہ دل معصوم بچوں کی مانند دوڑتے پھیریں اور جب لمبے راستوں پیچ دار پگڈنڈیوں اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی جھیلوں کی سیر سے تھک جائیں تو برچ کے جھنڈوں تلے کسی تنہا اور خاموش سے کیفے میں بیٹھ کر تازہ سنہری چائے کا لطف اٹھائیں۔ ہمارے چہروں پر سبزہ زاروں کی تازگی اور شگفتگی ہو اور ہمارے ہونٹوں پر ان شرمیلی کلیوں کے تذکرے ہوں جو بہار کا پیغام دیتی ہیں اور پھر جب رات کا سرد اندھیرا چیڑھ اور برچ کے درختوں کو گھیر لے اور تیز ہوا چلنے لگے تو ہم خوابگاہ کی دھیمی روشنی میں آتشدان کے قریب قالین پر بیٹھ جائیں اور جنوبی روم کے سمندروں سے آنے والی مرطوب ہواؤں اور الپس کی چوٹیوں پر گرنے والی کنواری برف کی باتیں شروع کر دیں۔ اگر باہر بادل گہرے ہو جائیں اور ایک دم مینہ برسنا شروع ہو جائے تو ہم آتشدان کے اوپر لٹکتی ہوئی گرم پانی کی کیتلی میں سبز چائے کی پتیاں ڈال دیں اور ہماری باتیں پہلے سے زیادہ دلچسپ اور رومانوی ہو جائیں۔ ہم جنگل کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھول دیں اور گرم گرم چائے سے لبریز پیالیاں لئے وہاں آن کھڑے ہوں۔ مینہ کی ہلکی پھوار ہمارے چہروں پر اڑنے لگے' باہر سے آنے والی درختوں کی مہک چائے کے فلیور میں گھل مل جائے اور ہمارے چہروں پر انجانی مسرت کے شگوفے ہوں اور کھڑکی پر جھکی ہوئی انگور کی بیل میں رنگین چونچ والا گلدم ہمیں پیار بھری نگاہوں سے دیکھے تکیوں کے سہارے' خوبصورت تصویروں والے البم اور رنگ دار نظموں والے رسالوں کی ورق گردانی شروع کر دیں اور پھر آتشدان میں آگ مدھم ہو جائے۔ ہماری بوجھل پلکوں پر نیند کا سانس گرم ہو جائے اور ہم بچوں کی طرح ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر وہیں لیٹ جائیں اور ہم بہت جلد سو جائیں اور باہر بارش کا زور آہستہ آہستہ کم ہو جائے۔

صبح جب مشرقی افق پر سورج کا دہکتا ہوا گہرا سرخ تھال نمودار ہو تو ہم اس کی اولیں سنہری کرنوں کے ساتھ بیدار ہوں۔ ہمارے دل شگفتہ اور زندگی سے بھرپور ہوں۔ ہم چٹانوں کے پاس کھڑے ہو کر نیچے پھیلی ہوئی وادیوں میں جھانکیں اور خدا کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں زندہ رہنے کے لیے دھوپ میں چمکتا ہوا ایک اور صحت مند دن عطا کیا ہے۔

کچھ عرصہ بعد ہم ایک بڑی پیاری بچی پیدا کریں اور ہر روز اس کے سنہری بالوں میں سوسن کے نیلے اور سفید پھول سجا کر ان پر چشموں کا تازہ پانی چھڑکیں اور پھر اس کے ساتھ مل کر لمبی لمبی نازک گھاس پر خوب کھیلیں!

ہماری ساری زندگی جنگلی بیلوں کے درمیان' چھپ کر بہنے والے ندی کی طرح گزر جائے اور جب موت آئے تو ہم اس کا عید کارڈ لانے والے ڈاکیے کی مانند استقبال کریں اور اپنے اردگرد موم بتیاں روشن کریں' خوشبوئیں جلائیں اور دنیا سے یوں نکل جائیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیسے کوئی بہترین مزاحیہ فلم دیکھ کر سینما حال سے نکل رہے ہوں۔

میں ابھی کیسے شادی کر سکتی ہوں۔ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ میرے لیے ان دونوں کی حیثیت مہمانوں کی ہے اور میں ان دونوں مہمانوں کا اس وقت خیر مقدم کروں گی جب میرے پاؤں پر مصر کے میدانوں کی گرد اور میرے کپڑوں میں خرطوم کے انگوروں کی مہک بس گئی ہوگی

وحیدہ واقعی زندگی سے بھر پور لڑکی تھی۔ وہ زندگی کی عزت کرتی تھی اور ہر چھوٹے سے چھوٹا کام بڑے اہتمام سے کرتی تھی۔ زندگی نے اسے جو کچھ عطا کیا تھا وہ اس کا بہترین مصرف جانتی تھی۔کل کا دن اس کے لیے مداری کے تھیلے سے کم نہ تھا۔کل عجیب و غریب کھیل تماشے ہوں گے' خوبصورت لوگ ملنے کو آئیں گے' چمکدار دھوپ کھلے گی۔۔۔۔۔۔۔اس کی آواز میں پتھروں سے ٹکرا کر اچھلتے ہوئے پانی کا اضطراب تھا۔ باتیں کرتے وقت اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں اور ہونٹوں میں سے لفظ یوں باہر نکلا کرتے جیسے چھٹی کے بعد بچے اسکول سے ہنستے کھیلتے باہر نکلتے ہیں۔ کسی وقت وہ اپنی آنکھیں یوں سکیڑ لیتی جیسے دور پہاڑ کی چوٹی پر کھلے ہوئے کسی نیلے پھول کو دیکھ رہی ہو۔اس کا وہ آخری خط میں کبھی نہیں بھول سکتا جس میں اس نے میرے ساتھ شادی کرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔

یہ خط بڑا طویل ہے۔ میں تمھیں اس کا صرف ایک مختصر سا حصہ سناتا ہوں۔ اس نے لکھا تھا:

جب تم بازار کے موڑ پر جا کر چھپ گئے تو سورج ایک دم غروب ہو گیا اور میرے ارد گرد شام کا اندھیرا پھیل گیا۔ پال! سورج تمہارے چھپنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں تم سے جدا ہو کر سیدھا گھر چلی آئی۔ میں تمہاری ملاقات کی دھیمی دھیمی خوشگوار مہک کو جو میرے سارے بدن میں رچی ہوئی تھی ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں اپنے ارد گرد اس وقت بھی تمہاری باتوں پر محبت لہجے اور دلکش چہرے کا ہالہ محسوس کر رہی ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو انتہائی بیش قیمت چیز سمجھ کر گھر میں بند کر لیا ہے۔ میں ابھی تک تم سے باتیں کر رہی ہوں۔تم ابھی تک میرے سامنے بیٹھے ہو اور مجھے اپنی خوبصورت چمکیلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ میرے ہونٹوں پر ابھی تک تمہارے پہلے پیار کی ہمیشہ رہنے والی نرم اور شیریں آنچ باقی ہے۔ میرے کانوں میں تمہاری آواز کا شہد اسی طرح ہے اور میری انگلیاں تمہارے بالوں کے ریشم میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ میری گردن شگوفوں سے لدی ہوئی ان شاخوں کو یاد کر رہی ہے جو تمہارے بازوؤں کے ساتھ ہی مجھ پر جھک آئی تھیں۔

میری پیشانی پر تمہارے اولین پیار کا نشان سورج بن کر چمک رہا ہے اور میرا چہرہ تمہاری انگلیوں کے اس لمس کو چوم رہا ہے جو چاند کی کرنوں سے زیادہ خنک اور پھول کی پتی سے زیادہ نرم تھا۔ تمہارے جسم کے لطیف جھکاؤ میں چناروں کی گھنی چھاؤں اور

چشموں کی ٹھنڈک تھی۔

سچ مانناتم سے مل کر مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کسی نے اچانک کھل جا سم سم کا نعرہ لگایا ہو اور میرے قدموں پر زرو جواہرات اور لعل و یاقوت کے ڈھیر لگ گئے ہوں۔ میرے محبوب! کیا وہ سچ مچ تم تھے یا چاند اپنی کرنوں کی سیڑھیوں پر سے اتر کر مجھے دھوکہ دینے آ گیا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں' اپنے کانوں اور اپنے ہونٹوں پر اعتبار نہیں آ رہا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے تمہارے بالوں کو چھوا تھا اور اب یہی ہاتھ اس سے منکر ہو رہے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں' سردیوں کی شام کے سنہری بالوں کو کوئی کیسے چھو سکتا ہے۔ تمہارے ہونٹوں نے میرے ہونٹوں پر چمکنے والے شبنمی موتیوں کو چوما تھا اور اب یہی ہونٹ کسی پرانے قلعے کے زنگ آلود دروازے کی مانند بند ہیں۔ مہر لب بہ لب ہیں' ساکت ہیں' جیسے کہہ رہے ہوں۔ پھول کی مہک کوئی نہیں چوم سکا اور ہمالیہ کی وہ چوٹی ابھی تک غیر دریافت شدہ ہے جہاں صدیوں سے مسلسل برف گر رہی ہے۔ میرے کانوں نے تمہاری آواز کی موسیقی کو پیانوں کے سروں میں بیدار ہوتے سنا تھا مگر اب مجھے ان پر بھی شک ہو رہا ہے۔ جیسے انہوں نے خواب میں مجھے کنچن چنگا کی چوٹیوں پر پھوٹنے والے جھرنوں کی موسیقی سنا دی ہو اور کہا ہو کہ یہ پال کی آواز ہے اور اب بیداری کے عالم میں اس سے مکر رہے ہوں۔ پھر تم ہی بتاؤ۔ یہ سب کچھ کیسے اور کیونکر ہو گیا؟

ہائے! آج کا دن اتنی جلدی کیوں گزر گیا؟ آج کے دن کو تو وقت کے اس اہم جنکشن پر کئی دنوں تک رکنا چاہیے تھا۔ آج کے دن ہم کتنی دیر بعد ملے تھے۔ آج صبح کے سورج کی چمک دمک دیکھ کر تو یہ گمان ہوتا تھا کہ یہ اب کبھی غروب نہ ہوگا آج کا دن عین عالم شباب میں ہی مر گیا ہے۔ آؤ ہم اس وقت کے بعد طلوع ہونے والے اور وقت سے پہلے ڈوب جانے والے جوانمرگ روشن دن کے مزار پر افسردہ یادوں کے چراغ روشن کریں۔

آج کی ملاقات نے میرے اندر زندگی سے دست و گریباں ہونے اور حالات سے مقابلہ کرنے کی نئی قوت بھر دی ہے۔ میں اپنے آپ کو بالکل اس کار کی طرح سمجھ رہی ہوں جو پیٹرول پمپ سے ابھی ابھی پیٹرول لے کر نکلی ہو۔ میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی تک کی بازی لگا سکتی ہوں۔ ساری رات چہرہ مجھ پر جھکا رہا اور یہ پہلی رات ہے جو میں نے سنہری بادل کے سائے میں لیٹ کر گزاری ہے۔ میں زندگی کے ہر دور میں تمہاری ساتھ دوں گی۔ میں نرگس نہیں ہوں۔ وحیدہ ہوں۔ مجھے تم سے دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ اگر میرے سامنے کوئی ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے ہاتھ میں سورج لے کر بھی کھڑا ہو جائے تو میں تمہاری طرف ہی آؤں گی اور ان سب کو ٹھکرا دوں گی۔"

لیکن میرے شہر کے دوست!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جب وحیدہ کا باپ ایک ہاتھ میں اپنی پگڑی اور دوسرے ہاتھ میں نکاح نامہ لیے اس کے پاس آیا تو وہ چپکے سے ڈولی میں سوار ہو کر حاجی چراغ دین سراج دین' مچھلی فروشاں' کے گھر چلی گئی۔

اس کا بیاہ مچھلیوں کے ایک بہت بڑا سوداگر کے بیٹے سے ہو گیا اور یوں وہ گیت جنہوں نے الپس لور کنچن چنگا کی برف پوش تنہائیوں میں جنم لیا تھا مچھلی منڈی کے شور میں ڈوب کر مر گئے۔

تمہارے شہر کا یہی قانون ہے دوست اس مچھلی منڈی میں یہی ہوتا ہے۔ یہاں دن کو ہزاروں کے ہجوم میں اخلاقیات کی تبلیغ کرنے والے رات کے اندھیرے میں معصوم عصمتوں پر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ یہاں سیب کے شگوفوں پر بیٹھنے والی مکھیاں دوسرے لمحے گندگی پر منہ مارنے لگتی ہیں۔ یہاں دھوپ میں چٹانوں کی سختی اور پہاڑوں کی سختی اور پہاڑوں کی عظمت پر تقریریں کرنے والے رات کی تاریکی میں موم کی طرح پگھل جاتے ہیں۔ یہاں خوبصورت لباس بیچنے والوں کے جسم ننگے ہوتے ہیں اور عطر بیچنے والوں کے کپڑوں سے بو اٹھتی ہے۔ یہاں ملٹن اور عرفی کے شعروں میں تمباکو کو باندھ کر فروخت کیا جاتا ہے۔ یہاں نیکی کرنے والوں کو دریا میں ڈال دیا جاتا ہے اور یہاں محبت جعلی خطوط سے شروع ہوتی ہے اور ناجائز بچے پر پہنچ کر ضائع ہو جاتی ہے۔ یہاں لوگ آنکھوں سے سنتے ہیں اور کانوں سے دیکھتے ہیں۔ یہاں روشنی دھواں ہے اور اندھیرا چمکتا ہے۔ یہاں خاموشی بولتی ہے اور آوازیں چپ ہیں یہ عجیب دیس ہے! یہ عجیب ملک ہے!

اب میں تمہیں اس ملک کے تیسرے عجائب گھر کی سیر کرواتا ہوں۔

اسی عجائب گھر میں جو سب سے بڑا مجسمہ ہے اس کا نام تسنیم ہے۔ تسنیم میرے کمرے میں اس وقت داخل ہوئی جب وحیدہ باہر نکل رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھ بہت کچھ لائی۔ ان میں نیل پالش کی شیشی' بھنویں بنانے کی پنسل' پلکیں سجانے کا برش اور کئی قسم کے نقاب تھے۔ جس دن اس نے میرے نام محبت کا پہلا خط لکھا اسی دن ایک ڈاکٹر سے اس نے شادی کی پیش کش کی۔ اور جب ڈاکٹر نے اسے یقین دلا دیا کہ وہ بڑے ہسپتال میں ملازمت ملتے ہی اس سے شادی کرے گا تو وہ اپنا سر میرے سینے سے لگا کر کہنے لگی:

''میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی پال! میں بڑی غمزدہ لڑکی ہوں۔ میں نے پھولوں کے عوض کانٹے ہی پائے ہیں۔ میرے دل میں صرف تمہاری محبت کا چاند طلوع ہوا ہے اور میری وادیوں پر صرف تمہاری محبت کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے اور میں تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گی''

تسنیم میری قبر پر کھڑی کسی اور سے ہاتھ ملا رہی تھی۔ مجھے سامنے بٹھلا کر وہ کسی اور کو دیکھ رہی تھی' کسی اور کی پرستش کر رہی تھی۔

اس کے نزدیک میں ایک دروازہ تھا جس میں سے گزر کر وہ کسی دوسرے کی خانقاہ پر فاتحہ پڑھنے جاتی تھی۔ میرا سر گود میں رکھ کر وہ اپنا سر کسی اور کی گود میں رکھ دیتی تھی۔ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر وہ کسی اور کے سینے سے لگ جاتی تھی۔ میری محبت کے گرم آنسوؤں سے وہ کسی دوسرے کی محبت کی پرورش کر رہی تھی اور میرے پیش کیے ہوئے پھولوں سے وہ کسی اور کا تاج سجا رہی تھی۔

میں نے رات کی تاریکی میں اس سے دن کی روشنی اور دھوپ کی چمک کی بات کی تو صبح اٹھ کر اس نے مجھے بیوقوف کے نام سے پکارا۔

میرے خوبصورت جنگلوں کے پھولو! مجھے بتاؤ کہ وہ محبت مجھے کہاں ملے گی جس کے ناخنوں پر کوئی پالش نہ ہوگی' جس کے ہونٹوں پر کسی لپ سٹک کی تہہ نہ ہوگی اور جس کی تلاش میں میرے پاؤں سے خون بہنے لگا ہے اور میرے بدن پر طویل مسافتوں کی گرد جم گئی ہے!

مجھے وحیدہ کا خیال آ رہا ہے! جس نے پہاڑوں سے محبت کی لیکن اپنے اندر پہاڑوں ایسی مضبوطی پیدا نہ کر سکی۔

میرے پیارے دوست! اگر کبھی اس سے ملاقات ہو تو میرا تذکرہ مت کرنا اور میرا ذکر چھڑ جائے تو کوئی اور بات شروع کر دینا۔

نرگس ملے تو اسے میری کوئی بات یاد مت دلانا۔ اچھا کیا جو اس نے مجھے بھلا دیا۔ وہ کیپٹن جہانگیر کے ساتھ اپنے بلند ارادوں کو عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ وہ خوش ہے کہ اس کا خاوند کیپٹن ہے اور اس کا باپ خوش ہے کہ اس کے داماد کے پاس کار بھی ہے۔ خدا کرے کہ ان کی خوش وقتی نہ ہو۔ نرگس کا مستقبل بڑا خوبصورت ہے سٹیٹ بنک کی عمارت سے بھی زیادہ خوبصورت! میں اس کی راہ میں اپنا سایہ ڈال کر اس کی ترقی کی رفتار کو روکنا نہیں چاہتا۔ میں اس کی آواز میں اپنی آواز ملا کر اسے بے سرا نہیں بنانا چاہتا۔ میں نے اسے برف پوش پہاڑوں پر سے جھانکا تھا۔ میں اسے تاریک گھاٹیوں میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ میرا پیار اس کا دشمن نہیں ہے۔

وہ اس کے جوڑے کا پھول ہے' اس کے پاؤں کی زنجیر نہیں!

پیارے دوست! میں آخری بار تمہارے شہر میں نظر ڈال رہا ہوں۔ اس شہر نے میرے دل پر گہرے زخم لگائے ہیں۔ میں نے اس کی طرف نرگس کے پھولوں سے بھرے ہوئے طشت بڑھائے تھے اور اس نے میرے قدموں پر مردہ لاشوں کے انبار لگا دیئے ہیں۔ میں اس کا سگریٹ سلگانے دیا سلائی جلا کر اس کی سمت جھکا تھا اور اس نے اسی دیا سلائی سے میرے کپڑوں میں آگ لگا دی ہے۔ میں کنول کے پیالے میں شہد ڈال کر اس کی طرف آیا تھا اور اس نے میرے حلق میں زہر انڈیل دیا ہے۔ میں نے اس کی گردن میں چنبیلی کے ہار ڈالے تھے اور اس نے مجھے زہریلے سانپوں کے کھڈ میں گرا دیا ہے۔ میں نے ان تاریک گھاٹیوں میں اس قدر جھک

کر پرواز کی ہے کہ میرے بازو زخمی ہو گئے ہیں اور میرا چہرہ خاک میں چھپ گیا ہے۔لیکن اب۔۔۔۔۔۔۔جبکہ میں تم سے جدا ہو رہا ہوں' اے میرے اچھے اور برے لوگو! میرے روشن اور تاریک مجسموں! میں تمہارے شہر کی سب سے بلند عمارت کی چھت پر کھڑے ہو کر تمہیں آوازیں دیتا ہوں کہ میری باتیں مجھے واپس کر دو اور اچھی باتیں فراموش کر دینا۔ میں نے تمہارے گلی کوچوں میں اپنے شب و روز آوارہ گردی میں بسر کئے ہیں۔ میں نے اپنی طویل سرد راتیں ان جگہوں پر لیٹ کر گزاری ہیں جہاں تم دن کے وقت بیٹھ نہیں سکتے۔ اس کے باوجود جب میں صبحدم تمہیں ملا تھا تو میں نے خندہ پیشانی سے تمہارے ہاتھوں کو چوما تھا۔ تم نے اس وقت اپنی خوابگاہوں کے دروازے بند کر لیے تھے جب نیند بھوکے بچے کی طرح میرے سینے سے چمٹی رو رہی تھی اور میں واپس چلا گیا تھا اور میں نے اپنی نیند کو ویران پلیٹ فارموں' ریل کے خالی ڈبوں اور مسجدوں کی سیڑھیوں پر بہلایا۔۔۔۔۔۔۔ اور اب تم اپنی خوابگاہوں کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر لو۔ کیونکہ میری نیند مر چکی ہے اور میں کسی سرد رات کو بارش میں تمہارے دروازوں پر کبھی دستک نہ دوں گا۔

میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔

گھر! ہماری مصیبتوں کا آخری حل۔۔۔۔۔۔۔ہماری آخری پناہ گاہ! ہمارے راستے کا آخری درخت اور ہمارے سفر کی آخری منزل!

ہوا تیز ہو گئی ہے۔ بادلوں نے سورج کو چھپا لیا ہے۔ کچھ دیر پہلے ڈھلوانوں پر دھوپ چمک رہی تھی اور اب بھورے رنگ کے سائے سے جھک آئے ہیں۔ درختوں پر سے پتے تیزی سے گرنے لگے ہیں۔ سردی بڑھ گئی ہے۔ مجھے بھی سردی لگ رہی ہے۔ میں اب لکھنا بند کرتا ہوں۔ ابھی دن کی روشنی باقی ہے اور مجھے شام سے پہلے اپنے گھر پہنچنا ہے۔ جہاں میری ماں' میری بہنیں اور میری نرگس میری منتظر ہے۔ ماں کھڑکی کے پاس بیٹھی کچھ سی رہی ہو گی' بہنیں ادھر ادھر کام کاج میں لگی ہوں گی اور نرگس چشمے کے پاس گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھی کھمبیوں کی چھتریاں بنا رہی ہو گی اور اس کے پاؤں پانی میں ہوں گے اور اس کے اوپر خشک پتے گر رہے ہوں گے۔

خط بند کرنے سے پہلے ایک آخری بات کہنا چاہتا ہوں۔

میرے اچھے دوست! علی الصباح جب سرخ دھوپ مال کی عمارتوں کے آخری کناروں کا منہ چومے اور بہار کے سنہری آسمان تلے فٹ پاتھ کے درختوں پر پھول آئیں تو مجھے بھی یاد کر لینا۔۔۔۔۔۔۔اور اس خیال سے یاد کرنا کہ میں نے ان پھولوں سے محبت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی تھی اور انہوں نے مجھے زخم دیئے تھے۔

میں ان زخموں کی حفاظت کروں گا اور تم میرے پیار کو بھولنے کی کوشش کرنا۔

بادل گہرے ہو گئے ہیں۔ شاید بارش ہو۔

◆◆◆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ ڈالیاں چمن کی

کچہریوں کے سامنے، بڑ کے گنجان درخت تلے ایک پتھر نصب ہے۔ اس پتھر پر سرخ لفظوں میں ''امرتسر پینتیس میل'' لکھا ہے۔ درخت کی پھیلی ہوئی شاخیں اس پر سایہ کئے ہیں۔ یہ پتھر بڑی دیر سے یہاں موجود ہے۔ کبھی یہ سفر کرنے والوں کی رہنمائی کیا کرتا تھا اور انہیں منزل کی خبر دیتا تھا۔ آج یہ خود بھولے بھٹکے مسافر کی طرح سڑک کنارے پڑا ہے اور جیسے راہ گیر کا دامن کھینچ کر اس سے پوچھنا چاہتا ہے:

''میں کہاں ہوں؟''

گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر جاتے ہوئے مجھے دن میں دو بار اس سڑک پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہر بار میں اس پتھر کو سود خور پٹھان کی مانند بڑ کے درخت تلے اپنا منتظر پاتا ہوں۔ میں کئی مہینوں سے اس سڑک پر سے گزر رہا ہوں اور یہ خوار پٹھان بڑی مستعدی سے میرے تعاقب میں ہے۔ کئی دفعہ دل میں یہ خیال آیا کہ اس پتھر کو یہاں سے اٹھوا کر عجائب گھر میں کیوں نہیں رکھ دیا جاتا؟ لارنس کے بت کے ساتھ .... یہ بھی تو ایک مجسمہ ہے۔ تلوار سے حکومت کرنے والے کا نہ سہی، ہندوستان کے نقشے پر تقسیم کی لکیر کھینچنے والے کا سہی۔ اس کی جگہ عجائب گھر ہی میں ہے۔ یہ ہمیشہ محفوظ رکھنے والے بت ہیں۔ یہ کبھی نہ بھولنے والی چیزیں ہیں!

سڑک کنارے بڑ کے پرانے درخت تلے یہ سنگ میل اس شہر کی سمت اشارہ کر رہا ہے جس کی فصیلوں پر جلنے والے چراغ گل ہو چکے ہیں اور جس کے تمام دروازوں پر تالے پڑ گئے ہیں اور جس کی مسافت پینتیس میل نہیں پینتیس ہزار میل ہے پینتیس لاکھ میل ہے۔ یہ خطرے کی جھنڈی ہے۔ یہ گمراہی کا نشان ہے۔ یہ سنگ میل نہیں، سنگ راہ ہے۔ یہ وہ غیر قانونی بچہ ہے جسے اس کی ماں گندے چیتھڑوں میں لپیٹ کر سر راہ پھینک گئی ہو اور میں یہ مردہ بچے کی لاش روز دیکھتا ہوں۔

لیکن کبھی کبھی یہ بڑی پھرتی سے اپنا بھیس تبدیل کر لیتا ہے۔ اس وقت جب میں اس کے قریب سے گزرتا ہوں تو مجھے خواہ مخواہ اس پر کسی خوش مزاج میزبان کا گمان ہوتا ہے جو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا جھک جھک کر مہمانوں سے ہاتھ ملا رہا ہو اور کہہ رہا ہو:

''اندر تشریف لایئے''

اور کئی بار جب اندر تشریف لے گیا تو مجھے یاد آیا کہ امرتسر میں بھی ایک ایسا ہی میزبان تھا، ایسا ہی پتھر کا مخروطی ٹکڑا جامن کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

درخت تلے نصب تھا جس پر ''لاہور پینتیس میل'' لکھا تھا۔ ان دنوں امرتسر واقعی پینتیس میل دور تھا اور اس کے تمام دروازے دن بھر کھلے رہتے تھے اور رات پڑتے ہی فصیلوں پر چمکیلے چراغ جگمگا اٹھتے تھے۔ یہ پتھر ریلوے پل گزر جانے پر بڑے گرجا گھر کے بالکل سامنے تھا۔ گرجا گھر ہمارے پڑوس میں تھا اور اس کے باغ کا بوڑھا مالی ہماری گلی میں رہتا تھا۔ ہماری گلی میں اور لوگ بھی رہتے تھے جن میں ایک نتھو قصاب بھی تھا۔ ادھیڑ عمر کا یہ لمتڑنگ آدمی کسی زمانے میں پہلوانی کرتا تھا۔ اور اب تخی سرور کے تکیئے میں اکھاڑے کے کنارے بیٹھ کر ہدایت اللہ کے معرفتی بیت گنگناتے ہوئے بچوں کو داؤ پیچ سکھایا کرتا تھا۔ پو پھٹے جب وہ اپنے گھر سے نکلتا تو دو تین بھیڑ بکریاں اس کے آگے پیچھے ہوتیں اور ان کا ایک آدھ بچہ اس نے گود میں اٹھایا ہوتا۔ ہم نے اس کا نام یسوع مسیح رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے پھولے ہوئے ٹماٹر نما کان پہلوانی کے نشان تھے۔ بسے گوجر کی دوکان میں رات کو محفل جمتی تو نتھو ہر نامی گرامی پہلوان کو اپنی کشتی کے احوال سنانے لگتا۔ اپنی مٹ میلی مونچھوں کے سرے مروڑتے ہوئے وہ ان دنگلوں کی رام کہانی چھیڑ دیتا جب اس نے اوپر آئے ہوئے امام بخش' کلو یا رسم زماں کو کلا جنگ مار کر کھٹ سے نیچے گرا لیا تھا اور مشہور ریاستی منصف گامن شاہ کن کترے نے اسے چاندی کا گرز تھماتے ہوئے کہا تھا:

''شیر کے بچے ہو پہلوان۔۔۔۔۔۔ مولا بری نظر سے بچائے' داہنی ران پر کوئی تعویز باندھ رکھو!''

اتنا کہتے ہوئے نتھو کی مونچھوں کے بال تن جاتے اور دھندلی آنکھوں میں لطیف افسردگی کا احساس جھلک اٹھتا۔ اسکول میں اس کے نازک بدن منحنی سے لڑکے نے عربی چھوڑ کر سائنس کا مضمون لیا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ لڑکے کو کان سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے نتھو گرجا:

''او عبدالشکور۔۔۔۔۔۔ سور کے سور! تم نے جو عربی شریف چھوڑ کر کتی سائنس لے لی ہے تمہاری ماں کو انجن چلانے تھے کیا؟

اور کمزور دل بیٹے نے دوسرے ہی روز عربی کا قاعدہ پڑھنا شروع کر دیا۔

نتھو قصاب کا بسے گوجر سے بڑا یارانہ تھا۔ بسا گوجرا گرچہ پہلوانی چھوڑ چکا تھا تاہم اس کا چوڑا چکلا جسم سڈول تھا اور وہ ہفتے میں ایک مرتبہ گائے کے دودھ سے غسل کیا کرتا تھا۔ جس قدر خوشنما اس کا جسم تھا اس سے کئی گنا بڑھ کر وہ ڈرپوک تھا۔ اندھیرے میں اس کے پاؤں نہ اٹھتے تھے اور روشنی میں چھپکلی کو دیکھ کر وہ گدی سے اچھل پڑتا تھا۔ دن بھر تو بسا گوجر دوکان پر گدھے کی طرح جتا رہتا اور رات کو شراب کے نشے میں دھت گلی محلوں میں گھوم پھر کر واہی تباہی بکنے لگتا۔ آدھی آدھی رات کو نتھو قصاب اسے گندی نالی یا کسی گڑھے سے اٹھا کر اس کے گھر پہنچا دیا کرتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماسٹر فضل دین درزی بے حد دبلا پتلا آدمی تھا اور بسے گوجر کی دوکان سے روزانہ سیر بھر دودھ پیتا تھا۔ بسا اسے دودھ پیتے دیکھ کر ہمیشہ کہا کرتا:

''ماشٹر کبھی پریکٹ بھی کیا کرو''

''پریکٹ'' سے مراد ''ورزش'' تھی اور یہ لفظ اس کا اپنا تھا۔

لیکن ماسٹر فضل دین ایسا کرنے سے معذور تھا۔ کیونکہ اسے اختلاج قلب کا عارضہ تھا اور نجم الدین عطار نے اسے صاف لفظوں میں کہہ دیتا تھا:

''جس روز تم نے اکھاڑے کا رخ کیا کفن ساتھ لیتے جانا۔

نجم الدین شربت صندل اور عرق گاؤزبان بیچنے کے علاوہ ڈاکٹری میں بھی دخل رکھتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ جب نہال سنگھ پنساری کو ایمہ دیتے وقت اس نے ٹونٹی پھنسا دی اور مریض پاگل بکرے کی طرح ممیانے لگا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس کے بعد نجم دین حکیم نے بورڈ پر سے ''ڈاکٹر'' کا لفظ مٹا دیا۔ علاوہ ازیں وہ ہر تندرست آدمی میں کسی نہ کسی مہلک بیماری کے جراثیم دیکھنے کا عادی تھا۔ بسے گوجر کو بھی پیٹ پر انگلی کے پٹوکے دیتے ہوئے اس نے خبردار کر دیا تھا:

''اگر پندرہ یوم اطریفل زمانی نہ کھایا تو انتڑیاں سوکھنے کا اندیشہ ہے۔'' اور بسا گوجر تین ماہ لگاتار اطریفل زمانی سے ناشتہ کرتا رہا تھا۔

چوہدری نواب دین گول باغ کا ہیڈ مالی تھا اور راہ چلتے ہر آدمی کو سلام کیا کرتا تھا۔ آدھی رات کو وہ اپنے گھر کی چھت پر بیٹھ کر درود شریف کا ورد کر دیتا اور اس کی تیز اور کرخت آواز ہمسایوں کو باقی نصف شب تک بیدار رکھتی۔ اس کی چٹوری اور گول مٹول طرح دار بیوی سلاہی بہشتی کے دام الفت میں گرفتار تھی اور دوپہر کے وقت مکان کی ڈیوڑھی میں اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ سلاہی بہشتی نے اسے بھی سٹے کی عادت ڈال دی تھی۔ چنانچہ دونوں بلاناغہ پیر سٹے باز کے ہاں سٹہ کھیلا کرتے تھے۔

پیر سٹی ان بھلے وقتوں میں جب بجلی ابھی دریافت نہ ہوئی تھی گلی کوچوں کے لیمپ جلایا کرتا تھا۔ وہ سر شام بانس کی سیڑھی کندھے پر رکھ کر گھر سے نکل پڑتا اور محلے محلے گھوم کر سرکاری لیمپ جگایا کرتا۔ اس کے عوض اسے ہر ماہ کی دسویں کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ شہر کی گھٹی ہوئی تاریک گلیوں کو روشن کرتے جب اس کی کمر جھک گئی اور کالے بال سفید پڑنے لگے تو بجلی ایجاد ہوگئی اور پیر کو نوکری سے جواب مل گیا اور اپنے بال بچوں کو پرورش کی خاطر اس نے سٹہ لکھنے کا دھندا شروع کر دیا۔ یہ فعل خلاف قانون نہ تھا لیکن اس کا کھلم کھلا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر چار جرم تھا۔ بسے کی دوکان پیر کا ہیڈ آفس تھی۔ یہیں دہی جمانے والی الماری کی اوٹ میں بوریئے پر بیٹھ کر وہ دن بھر سٹے کی پرچیاں لکھا کرتا تھا۔ اس کے گاہک بظاہر بسے گوجر سے ہمکلام ہوتے مگر پیر تک بھی اپنا پیغام پہنچا دیتے۔

''تین آنے کی بندی۔۔۔۔۔۔۔اور پانچ پیسے کا لڑ کا سات چچا!''

اور چچا بڑی چوکس نگاہوں سے آزو بازو گھورتے ہوئے جھٹ سے لنڈوں میں پرچی بنا ڈالتا۔

ہر رات نو بجے شہر فیروز پور میں لالہ کانشی ناتھ کی بیٹھک پر گھڑے میں سے پرچی نکالی جاتی تھی۔ جو حرف پڑتا اس کی اطلاع بذریعہ ٹیلیفون صوبے بھر میں کر دی جاتی۔ امرتسر کے ہیڈ ایجنٹ سے جیتی ہوئی رقم لے کر پیر بسے گوجر کی دوکان میں آ جاتا اور جن کا حرف نکلا ہوتا ان میں تقسیم کر دیتا۔ محلے کے تینوں سپاہی پیر سے آٹھ آنے یومیہ رشوت لیتے تھے۔ لیکن ایک بار کوئی بگڑا دل تھانیدار گلی میں اچانک آ نکلا اور اس نے پیر سٹی کو بسے کی دوکان میں عین موقع پر گرفتار کر لیا۔ رات حوالات میں گزارنے کے بعد دوسرے روز پیر سٹی پھر پرچیاں لکھ رہا تھا۔ تاہم احتیاطاً اس نے اپنا ہیڈ آفس احدکا کا نانبائی کے تنور پر منتقل کر لیا۔ ٹماٹر کی طرح گول اور سرخ' پستہ قد احدکا کا ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا اور کلچے لگاتے ہوئے اسے تنور پر گرنے کی حد تک جھکنا پڑتا تھا۔ اس کا سر درمیان سے گنجا تھا اور کنپٹیوں پر سپید بالوں کے تار نمایاں تھے۔ مرتے وقت اس کے باپ نے بیس ہزار کی جائیداد چھوڑی تھی جو اس نے سٹے اور جوئے میں ہار دی تھی۔ جب وہ کام میں مشغول ہوتا تو چیزوں کی پرچھائیاں اس کی چمکیلی کھوپڑی میں ہلا کرتیں۔ احدکا کا بڑا شاہ خرچ تھا اور اسے بھانت بھانت کے پکوان پکانے اور انہیں کاریگروں میں بانٹ کر ان کے منہ سے اپنی تعریف سننے کا بڑا شوق تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے ایسی باقر خانی کھلائی جس کے اندر انڈوں کی زردی کمال صفائی سے بھری ہوئی تھی۔ جب میں کھا چکا تو احدکا کا نے گنجے سر پر چپٹی انگلیاں پھیرتے ہوئے آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا:

''کیوں استاد' بھلا بتاؤ انڈا کیونکر بند ہوا؟''

میرے لاعلمی کے اظہار پر وہ موج میں آئے ہوئے گھوڑے کی طرح خرخرا کر بولا:

''اس بھید کو صرف میری خورشید ہی جانتی ہے۔''

خورشید احدکا کا کی بڑی لڑکی تھی' اس کا رنگ سرخ' گال کلچے کی طرح پھولے پھولے اور ڈیڑھ بالشت قد پر سر چقندر کی مانند لگا تھا۔ دور سے اس پر چٹھی ڈالنے والے سرکاری بکس کا گمان ہوتا تھا۔ فرصت کے اوقات میں آئینہ لے کر کھڑکی میں بیٹھ جاتی اور ٹھوڑی اور ماتھے پر اگے ہوئے زائد بال موچنے سے اکھیڑا کرتی۔ اس کی گورے بدن کی بھاری بھرکم ماں رات کو سیر بھر دودھ میں جلیبیاں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھگو کر چٹ کرنے کے بعد پلنگ پر لیٹ جاتی اور دوسرے ہی لمحے اس کے خراٹوں کا بے ہنگم شور در و دیوار ہلانے لگتا۔ کسی وقت وہ بہ نفس نفیس تنور خانے میں تشریف لے آتی اور تازہ' خطائیوں' رسیلے کھانڈ کلچوں سے جیبیں بھر چکنے پر بھدے کولہے مٹکاتی اوپر چلی جاتی۔ وہ کسی کاریگر سے پردہ نہ کرتی تھی۔ احد کا کوزے میں سوکھی کھجوریں بھگوتے ہوئے اسے چھیڑا کرتا۔ وہ میلی آستین سے ناک رگڑتے ہوئے پھٹی ہوئی آواز میں پوچھتا۔

''کیوں میری بلبل! کسی کاریگر پر دل آ گیا ہے؟''

بلبل تھوتھنی پھلا کر اسے ایک عدد موٹی گالی سنا دیتی جس پر احد کا کایوں چٹخارہ بھر کر آنکھیں بند کر لیتا گویا وہ کوئی تر نوالہ ہو۔

کاریگروں کا ٹولہ پورا بھان متی کا کنبہ تھا۔ ان میں سے کسی کی شکل جلی ہوئی باقر خانی سے ملتی تھی تو کوئی بجھے ہوئے سوختے سے مشابہ تھا۔ لال پہلوان کو دوکان میں خاص مرتبہ حاصل تھا اور ہر آدمی اس سے رکھ رکھاؤ برتتا تھا۔ دوکان کے باہر ایک بڑا سا تخت بچھا تھا جس کے نیچے مکڑیوں نے جالا بن رکھا تھا۔ لالو گرمیوں میں صرف لنگوٹ باندھے اور سردیوں میں بھاری لوئی کی بکل مارے اس تخت پر بیٹھا گاہکوں میں کلچے وغیرہ بانٹا کرتا۔ اس کی بڑے مٹکے ایسی پھولی ہوئی توند جھولی میں پڑی ہوتی اور وہ نچلا جبڑا لٹکائے پان کی جگالی کیا کرتا۔ کچھ مدت پہلے وہ بڑا دلیر جواری تھا اور نئی آبادی میں اس کا ایک ذاتی جواخانہ تھا۔ لیکن بڑے لڑکے کی اچانک موت کے بعد وہ توبہ تلہ کر بیٹھا تھا اور اب ہر جمعرات کو پیر ظاہر اولی کے مزار پر پانچ موم بتیاں جلایا کرتا تھا۔ وہ بڑا آلکسی تھا اور اس کی دلکش مسکراہٹ بچوں سے ملتی جلتی تھی۔ گاہکوں سے فراغت ملتے ہی وہ گھٹنے کی کٹوری پر ہاتھ سے طبلہ سا بجاتے ہوئے اپنا مخصوص گیت چھیڑ دیتا:

مورا چھیل چھبیلا چوہا بلی نے مار ڈالا۔۔۔۔۔۔۔

منہ اندھیرے چار کلچے اور بکرے کا پورا سر اس کا لگا بندھا ناشتہ تھا۔

سینڈو جوتا چور' عمر کبابئے کا بیٹا تھا اور وہ دوکان میں ہر آدمی سے اوچھا اور گندا مذاق کرنے کا عادی تھا۔ اس کا قد کاٹھ معمولی تھا لیکن وہ ہر جگہ اپنے تئیں غنڈہ ظاہر کر کے بڑا خوش ہوتا۔ ہر کوئی اس پر پھبتی کستا اور اس کے کام پر نکتہ چینی کرتا جس کا جواب سینڈو ماں بہن کی گالیوں سے دیا کرتا۔ جس روز اسے کوئی چھیڑتا غلیل لے کر بسے گوجر کی دوکان پر آ بیٹھتا اور راہ چلتوں کی کھوپڑیاں اڑانے لگتا۔ ایک آدھ سے اوپر تلے ہونے کے بعد وہ بڑے آرام سے واپس آ کر تاش نکالتا اور کسی نہ کسی کاریگر کو گھیر لیتا:

''اکنی پوائنٹ پر ملی۔۔۔۔۔۔۔ کیوں ہے' صلاح پھر؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے ایک بری عادت تھی۔ وہ کسی شے کو چھونے سے پیشتر انگلیوں کو تھوک سے گیلا کر لیتا تھا۔ یہاں تک کہ میدا گوندھتے اور خمیر اٹھاتے وقت بھی ایسا کرنا کبھی نہ بھولتا تھا۔ کسی روز کمہار مٹی کے لوٹے گدھوں پر لادے گلی میں سے گزرتے تو سینڈو انہیں روک کر بیچ میں جا کھڑا ہوتا۔ لالو پہلوان سے اس کی شرط بدھی ہوتی کہ اگر وہ یکے بعد دیگرے پانچ لوٹے سر پر مار کر توڑ دے گا تو ڈیڑھ سیر دودھ اور پاؤ جلیبیوں کا حقدار ہوگا۔ تمام کاریگر تماشہ دیکھنے تخت پر جمع ہو جاتے۔ سینڈو جھولے میں سے ایک لوٹا نکالتا۔ پھونک مار کر گرد صاف کرتا اور تڑاخ سے اپنے سر پر دے مارتا۔ پانچوں لوٹے توڑنے کے بعد وہ سر پر ہاتھ پھیرتا' گردن اکڑائے پالا مار کر آئے ہوئے بٹیر کی دوکان میں داخل ہوتا۔ لالو پہلوان کمہار کے ہاتھ میں چونی تھما کر بادل نخواستہ بیسے گوجر کو دور سے آواز دیتا:

''ڈیڑھ سیر دودھ بھیج دینا سرکاری سانڈ کے لیے''

اپنی طاقت کے اس غیر قدرتی مظاہرے سے اس کا مدعا کاریگروں میں اپنی برتری کا رعب گانٹھنا ہوتا تھا۔ پیچھے کوٹھڑیوں میں کسی کے اندر میدے کی بوریاں اور سوکھی کھجوروں کے پلندے چھت تک لگے تھے اور کہیں لکڑی کے کندوں اور جھاڑ جھنکاڑ کے انبار پڑے تھے۔ دھواں کھائی دیواریں سیاہ پڑ گئی تھیں اور سیلے کونوں میں چوہوں کے گروہ کے گروہ رہائش پذیر تھے۔ کوٹھڑیوں کے سامنے بھنچے ہوئے نیم روشن آنگن میں پمپ لگا تھا۔ سینڈو جوتا چور بٹھلوں میں پانی بھرتے ہوئے بار بار اندھیری کوٹھڑیوں کی طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کرتا۔ وہ یوں چوکنا رہتا گویا پتا کھڑکتے ہی بھاگ کھڑا ہوگا۔

ایک روز لالو پہلوان نے کاکا اور دوسرے کاریگروں سے مل کر سینڈو سے ایک خطرناک مذاق کھیلا۔ طے یہ پایا کہ سینڈو کا ڈر دور کیا جائے۔ سینڈو علی الصبح میدا لینے جس کوٹھڑی میں جایا کرتا تھا لالو منہ پر جلا ہوا کلچہ باندھ کر اسی کوٹھڑی میں بوریوں کے پیچھے جا چھپا۔ اس نے سیاہ کلچے پر میدے کے پاؤڈر سے دو آنکھیں بنا رکھی تھی اور باقی جسم کالے کمبل میں ڈھانپ لیا تھا۔ سینڈو حسب معمول منہ اندھیرے اٹھ کر بظاہر گنگناتے لیکن ڈرتے ڈرتے میدا لینے کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ دوسرے ہی لمحے میں ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی اور پھر خموشی چھا گئی۔ لالو چھلانگ لگا کر آنگن میں کود پڑا اور جلدی جلدی کلچے کا نقاب اتارنے لگا۔ اوپر منڈیر پر احد کاکا کی گنجی کھوپڑی نمودار ہوئی:

''ارے اس کی خبر تو لو!''

تھوڑی دیر بعد سینڈو کو بے ہوشی کے عالم میں میدا گوندھنے والی میز پر لٹا دیا گیا اور احد کاکا گلاب دانی کی تلاش میں لنگڑی ٹانگ پر دوکان کے چکرے کاٹنے لگا۔ سینڈو نے ایک مرتبہ آنکھیں کھولیں۔ لالو پہلوان نے ہمدردی سے اس پر جھک کر کہا:

''میری جان ہوش کرو''

لیکن سینڈو ایک بار پھر چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ ڈیڑھ ماہ بیمار رہنے کے بعد تندرست ہوتے ہی سینڈو نے تنور خانے کو خیر باد کہا اور اپنے باپ کے ساتھ مل کر کباب لگانے شروع کر دیے۔

سینڈو جوتا چور کی جگہ شیر خان نامی ایک سینہ دراز سفید ریش پٹھان نے لے لی جو پہلے ہینگ اور بادیان خطائی کا دھندا کرتا تھا لیکن دلے جوار یے کی بیٹھک میں ہنگ کے سارے بورے ہارنے کے بعد کچھ دنوں سے تخی سرور کے تکیئے میں چرس پی کر پشتو گیت گایا کرتا تھا۔ جس روز وہ دوکان میں وارد ہوا پیر سیٹھی تنور پر اکڑوں بیٹھا سٹے کی پرچیاں لکھ رہا تھا۔ شیر خان نے چھوٹتے ہی لاغر بدن پیر کو گردن سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔

''خو پیر چو۔۔۔۔۔۔۔ جس کا کھاتا ہے اسی پر سوار ہوتا ہے۔''

پیر نمکین کلچوں کی الماریوں تلے لڑھک گیا اور وہیں پڑے پڑے خان کو مٹر مٹر گھورنے لگا۔ بعد میں جب اس نے شیر خان کو بتلایا کہ وہ جوتا اتار کر بیٹھا تھا تو خان نے واسکٹ الٹ کر جیب میں سے ڈبیا نکالی اور پیر کو نسوار پیش کر دی۔

''خالص پیشور'' پشاور'' کا مال اے بابا''

شیر خان کی عمر کافی تھی۔ بال سفید پڑے گئے تھے لیکن جسم بڑا مضبوط تھا اور تانبے میں ڈھلا ہوا چہرہ سلگتا سا تھا۔ بھدی انگلیوں کے چوڑے چوڑے بدوضع ناخن نسواری تھے اور ناس دانی کا ہلاس سونگھتے نتھنے چوڑے پڑ گئے تھے۔ تنور میں کلچہ لگاتے ہوئے کبھی کبھی وہ بے اختیار پکار اٹھتا:

''خوائے دنیا تنور میں لگا کلچہ ہے یارو!''

اس دم بڈھے خان کا چہرہ دلکش دکھائی دینے لگتا اور آنکھوں میں اس کے دل کی نیلی جھلک اٹھتی۔ اپنے میلے کچیلے پیش بندے سے ناک صاف کرتے ہوئے وہ پھر کام میں لگ جاتا۔

لمتڑنگ کشمیری کاریگر اسد جو بڑا ہنس مکھ اور رنگین مزاج تھا۔ وہ بے تحاشا لمبا تھا اور ہر آدمی سے جھک کر بات کرتا تھا۔ عورتوں کی گفتگو اس کا من بھاتا موضوع تھا اور اس کی بو دس گز کی دوری سے سونگھ لیتا تھا۔ موٹی تازہ عورتیں اسے بہت پسند تھیں اور ان کا ذکر وہ اس ذوق وشوق سے کرتا گویا کوئی آیت دہرا رہا ہو۔

اس سے اس کی بھوری آنکھوں میں عجیب سے گرمی اور روشنی آ جاتی اور نمکین چائے ایک ہی گھونٹ میں چڑھا کر وہ ہونٹ چاٹتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئے چٹخارہ بھرتا۔

''موٹی عورتوں اور کھانڈ کلچوں میں کوئی فرق نہیں۔

اس کے میل سے جمے ہوئے کپڑوں سے ہر دم سرکے کی بو آیا کرتی تھی۔ اس کی اپنی بیوی اور بچے پہلگام سے پچاس میل دور کسی گاؤں میں مقیم تھے جن کے نام وہ ہر ماہ پندرہ روپے منی آرڈر کر دیا کرتا تھا۔ اسد جو کو اپنی بیوی سے بڑا پیار تھا۔ وہ ہر عورت میں اسی کی جھلک دیکھتا اور پھر کاریگروں میں اپنے پیار و محبت کی طوطا کہانی چھیڑ دیتا۔

''ہمارا بیاہ لڑکپن ہی میں ہو گیا تھا۔ زینو جب میرے گھر آئی تو اس کی گڈیاں بھی صندوق میں بند تھیں او خ! کیا مزے کے دن تھے! کل اگر پانچ کا حرف نکل آیا تو زینو کو ایک ولائتی کنگھی ضرور بھیجوں گا۔''

رات کے خموش و پرسکوں لمحات میں جب سماوار سبز چائے ابلنے لگتی تو اسد جو لمبا سانس کھینچ کر اس کی مہک سونگھتا اور فرید و نا جی کے کندھے پر جھک کر کہتا:

''سبز چائے کا مزہ جب ہے کہ چناروں پر برف گر رہی ہو''

اس وقت اسد جو کے لاپرواپر شکن چہرے پر خواب آگیں کیفیت طاری ہو جاتی اور گھڑی دو گھڑی کے لیے وہ گرتی برف میں پہلگام کی وادیوں میں نکل جاتا اور ان غیر ہموار پہاڑی پگ ڈنڈیوں پر ہو لیتا جن کے اوپر گنجان چناروں کو برف پوش ٹہنیاں اپنے مرمریں بازو پھیلائے ہوتیں اور نیچے سرمئی دھند میں ڈوبی ہوئی وادیوں پر برف کی بتیاں بڑے سکون سے گر رہی ہوتیں۔ پھر اس کا گاؤں آ جاتا گھر آ جاتا اور وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ گھر کے پچھواڑے رک کر اندر جھانک کر دیکھتا کہ چولہے میں گیلی لکڑیاں سلگ رہی ہیں۔ اس کے بچے اس کے گرد بیٹھے ہیں اور انہیں سردی لگ رہی ہے اور اس کی زینو گندے فرن سے پاؤں ڈھانپے بچوں کے پاس بیٹھی ان کے لیے مونجھ کے جوتے بن رہی ہے۔

زینو! میں آ گیا ہوں۔۔۔۔۔۔

زینو! دیکھو چنار برف سے لد گئے ہیں اور بند دروازوں کے اندر سماوار گرم ہو گئے ہیں

تم بھی اٹھو! تمہارا سماوار کہاں ہے؟

لیکن زینو اسی طرح سر جھکائے مونجھ کے جوتے بنتی رہتی اور کوٹھڑی دھوئیں سے بھری رہتی اور اس کے بچے سردی سے ٹھٹھرتے رہتے اور پھر یہ سب سب کچھ برف اور دھند میں تحلیل ہو جاتا اور اسد جو تنور پر بیٹھے بیٹھے اپنا غمگین اور بوجھل سر جھکا لیتا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دن کے وقت جب وہ اپنی آستین کہنیوں تک الٹ کر میدا گوندھنا شروع کرتا تو بہت جلد پسینے میں شرابور ہو جاتا اور اس کا سانس دھونکنی کی مانند چلنے لگتا۔ مضبوط بازوؤں کی مچھلیاں اوپر تلے ہونے لگتیں اور گردن کی رگیں تن جاتیں۔ اس وقت نہ اسے اپنی زینو کا خیال ستاتا اور نہ پہلگام کے برف آلو چناروں کا جسمانی محنت کے اس بپھرتے سیلاب میں ہوائی قلعوں کے طلسمی جال خس و خاشاک بن کر بہہ جاتے۔ زینو اور چنار ریت اور جھاگ' پانی اور بلبلے!

اسد جو کی پیشانی' ناک' گال' گردن' اور ٹھوڑی پر پسینے کے موتی لٹکنے لگتے اور یوں محسوس ہوتا جیسے وہ صرف میدا گوندھنے کشمیر سے امرتسر آیا ہے اور اگر اس کا ہاتھ نہ روکا گیا تو وہ سارا دن' ساری رات' سارا سال میدا گوندھتا رہے گا میدا گوندھ کر وہ بوریوں پر گر کر نچر کی طرح ہانپنے لگتا اور اس کی پسلیاں پھٹی ہوئی قمیض میں سے اوپر نیچے ہوتی دکھائی دیتیں۔

اسد جو تین سال سے کشمیر جانے کا جتن کر رہا تھا۔ وہ اپنے زینو کے لیے دل کی پیاس کا سوٹ اور ولایتی کنگھیوں کی پوری درجن لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے پاس ان چیزوں کے لئے کبھی پیسے جمع نہ ہوئے تھے۔ جو تھوڑا بہت جمع ہوتا اور وہ یکمشت موٹی رقم ہاتھ لگنے کے لالچ میں پیرسٹی کی نذر ہو جاتا اور اسد جو ایک بار پھر تنور پر بیٹھ کر پہلگام کی وادیوں میں گم ہو جاتا۔ سٹے کی عادت اس سے بھوت بن کر چمٹی ہوئی تھی اور نکلنے والی پرچی کا نمبر معلوم کرنے کے لیے اس نے بلاقی شاہ کے قبرستان میں رات رات بھر پرانی قبروں میں لیٹ کر چلے کمائے تھے۔

شیر خان نے کئی بار پیشن گوئی کی تھی۔

خود بھائی صاحب تمہارا موت کالے پانی میں لکھا ہے"

جس کے جواب میں اسد جو نے راز بھرے لہجے میں ہمیشہ یہی کہا تھا:

''خان! اب اگر لڑکا آٹھ نہ آئے تو گردن کٹوا دوں گا۔ رات پیر صاحب خواب میں کہہ گئے ہیں۔''

یہ خیالی پیر صاحب ہر دوسرے تیسرے اسد جو کو کوئی نہ کوئی نمبر بتا جاتے کو کبھی نہ پڑتا۔ پیر کو جھوٹا کہنے کی بجائے اسد جو ہمیشہ اپنی تقدیر کے پیچھے لٹھ لیے پڑا رہتا۔ اگر اتفاق سے کبھی حرف پڑ جاتا۔ تو وہ سب سے پہلے پیر کے نام پر بچوں میں شیرینی بانٹتا اور باقی پیسوں کا پھر سٹہ کھیل دیتا۔ رات کو میدے کی بوریوں پر' نیلے چکٹ لحاف میں گھس کر اسد جو اپنے خالی پیر کو یاد کرتا اور پھر اتنا کہہ کر موٹی عورتوں کے خواب دیکھنے لگتا۔

''ہر تدبیر الٹی پڑ رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ سوجا گنہگار بندے''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دبلے پتلے ناجی کو کاریگروں نے نیپو لیوژ کا خطاب دے رکھا تھا۔ وہ جگت ماموں تھا اور ہر ایک کا صلاح کار کوئی بھی معاملہ ہو وہ اس میں پنچ بن جاتا اور اپنی رائے دینے سے نہ چوکتا۔ لالو پہلوان کی ناک میں پھنسی نکل آئی تو اس نے مشورہ دیا:

''اس پر کھجور کی پلٹس باندھو''

ناجی کے لاغر بدن پر خستہ کپڑے جھولا کرتے اور گنجان بال سدا میلے رومال میں بندھے رہتے۔ اس کا لمبی تھوتھنی والا چہرہ کسی پہاڑی بکرے سے ملتا جلتا تھا اور گاجر نما ناک آگے کو نکلتی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ احد کاکا نے پوچھا:

اور ناجی! تمہاری ناک اتنی لمبی کیوں ہے؟''

اور ناجی ناک کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا:

''یہ مجھے ورثے میں ملی ہے کاکا جی! ہمارے خاندان کے پاس سوائے اس کے اور رکھا ہی کیا ہے؟''

ناجی کی آنکھیں بڑی چوکس رہا کرتیں اور چلتے وقت وہ یوں مڑ مڑ کر دیکھا کرتا گویا کوئی اس کے تعاقب میں ہو۔ پھرتی میں وہ سرکس کے بندر سے کم نہ تھا اور گھڑے ہوئے کلچوں پر کھجوروں کا پانی اور تل لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ مشین کی طرح چلا کرتے تھے۔ جس کوٹھڑی میں وہ شب باشی کرتا تھا اس میں صرف ایک روشندان تھا اور وہ میدے کی خالی بوریوں سے بھری ہوئی تھی۔ رات کو انہی بوریوں میں گھس کر ناجی سو رہتا اور اس کے اوپر تل چٹے رینگا کرتے۔ اسے تمام کاریگروں سے پہلے بیدار ہونا پڑتا تھا۔ اس کا کام تڑکے ہی اٹھ کر تنور میں لکڑیاں جوڑ کر آگ سلگانا تختوں پر سے سوکھا ہوا میدہ کھرچنا، بٹھلوں میں پانی بھرنا، چھڑکاؤ کے بعد دوکان میں جھاڑو دینا اور احد کاکا کے سارے کنبے کے لیے غسل کا پانی گرم کرنا تھا۔ وہ نیند بھری سرخ آنکھیں ملتے ہوئے بوریوں کے نیچے سے نکل کر لمبی چوڑی انگڑائی لیتا اور لڑکھڑاتے قدموں سے یوں روز کے دھندوں میں لگ جاتا گویا نیند کے عالم میں ہو۔ بلا ناغہ رات گئے سونے اور پو پھٹے اٹھ بیٹھنے سے نیند اس کی باندی بن گئی تھی۔ وہ کھڑا ہو یا بیٹھا، کلچے گھڑ رہا ہو یا باقرخانیوں کے لیے میدے میں چربی ملا رہا ہو، لالو پہلوان سے کالی بلی کے کبوتر ہضم کر جانے کی راگنی سن رہا ہو یا اسد جو کے ساتھ پہلگام کے چناروں کی سیر کر رہا ہو۔ جب بھی، جس وقت چاہے سو سکتا تھا۔ صرف پلک جھپکنے کی دیر ہوتی کہ نیند کی پریاں اسے اپنے بازوؤں پر اٹھا کر گمنام جزیروں کی طرف لے اڑتیں۔ نیند زر خرید کنیز کی طرح ہر وقت اس کے حکم کی منتظر رہتی۔ ناجی کا دبلا بدن کسی مہلک جنسی بیماری کے داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ داغ اگرچہ مدھم تھے لیکن قریب سے دیکھنے پر تانبے کے پیسوں کی مانند صاف نظر آتے تھے۔ برسات کے دنوں میں جب میلے در و دیوار عجیب قسم کی مرطوب بو چھوڑتے ناجی کے داغ زخم بن کر رسنا شروع کر دیتے اور کام کرتے ہوئے بار

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بار جسم کھجلایا کرتا۔ ان ایام کے لیے اس نے خاص قسم کی مرہم بنوا کر رکھ چھوڑ دی تھی جس کے لیپ سے زخم خشک ہو جاتے تھے۔ لیکن خارش بدستور رہتی تھی۔

ناجی کا شیر دل ناگی گویے کاریگر سے خاص دوستانہ تھا اور وہ دونوں سردیوں کی لمبی راتوں کو تنور پر بیٹھ کر بمبئی بھاگنے کا پروگرام بنایا کرتے تھے۔ شیر دل بمبئی جا کر رنجیت فلم کمپنی میں بلی موریا ایکٹر کی جگہ ہیرو کا کام کرنا چاہتا تھا' اور ناجی کو بمبئی کی وہ مسجد دیکھنے کا شوق تھا جو جھیل کے وسط میں بنی ہوئی ہے اور جس کا پل ہر دم لرزتا رہتا ہے۔ شیر دل بجھی ہوئی بیڑی سلگا کر ترنگ میں آ کر کہتا:

''فلم کمپنی کا سیٹھ مجھے بلی موریے کی جگہ رکھ لے گا کیونکہ بلی موریا راگ واری نہیں جانتا۔

ناجی آنکھیں بند کر کے جھیل والی مسجد کا تصور باندھتا اور شیر دل سے کہتا:

''بمبئی پہنچ کر پہلا جمعہ اسی مسجد میں پڑھیں گے۔ کیا خیال ہے؟''

بلی موریے کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔ ہمیں اس کی دلجوئی کرنا ہی پڑے گی۔''

''لیکن یار وہ تو یہودی ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟ یہودی اصل میں مسلمان ہی ہوتے ہیں۔

تمہیں کیا پتہ وہ گھروں میں نماز پڑھتے ہیں۔''

ناجی چپکا ہو رہا اور شیر دل اپنی بلی موریا مارکہ مونچھوں پر شہادت کی انگلی پھیرنے لگا۔ شیر دل کو لیلیٰ مجنوں' شیریں فرہاد' ہریش چندر' حاتم طائی اور نقش سلیمانی کے بیشتر گیت یاد تھے۔ اپنے تمام پسندیدہ گیت اس نے ایک کاپی میں جمع کر رکھے تھے جس کی جلد پر موٹے حرفوں میں ماسٹر غلام حسن امرتسری عرف شیر دل' لکھا تھا۔ شیر دل کو راگ واری سے زیادہ واقفیت نہیں تھی اور اس کی آواز میں کوئی خاص رچاؤ بھی نہ تھا۔ اس کے باوجود اس کے گلے سے نکلے ہوئے بول ہر ایک کو غم آشنا بنا دیتے اور ہر آدمی اپنے آپ میں کھو جاتا۔ اس کے سنگیت کا اشارہ تھا کہ ہر ست خموشی ہو۔ گاتے سمے۔ وہ عقیدت سے یوں آنکھیں بند کر لیتا جیسے عبادت کر رہا ہو۔ ناجی تخت پر جلی ہوئی باقر خوانیوں کی ڈھیری لگاتے ہوئے موج میں آ کر نخچر ایسا سر ہلانے لگتا۔ نیک دل پٹھان بوریوں پر بیٹھا صدری کی مرمت کرتے ہوئے اپنے آپ ''نوشے'' کا نعرہ بلند کرتا اور صدری کی تہہ میں رینگتی ہوئی کسی جوں کو وہیں کچل دیتا۔ لالو تنور پر بیٹھے بیٹھے لوئی کی بکل میں نیم باز آنکھوں سے کسی نقطے کو گھورنے لگتا۔ اس پر بظاہر موسیقی کا سب سے زیادہ اثر ہوتا تھا۔ کسی وقت وہ گلہ آمیز لہجے میں بول اٹھتا:

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''قسمت میں جب کلچہ فروشی لکھی ہو تو راگ داری کہاں سے آئے؟ ہمارا کاتب تقدیر تو کوئی نابائی معلوم ہوتا ہے۔''

عقب میں ٹاٹ کا پردہ ایک طرف ہٹتا اور اسد جو گرم سماوار اٹھائے تنور خانے میں داخل ہوتا۔ سماوار تنور کے اوپر رکھ کر وہ بند مٹھی فضا میں لہراتے ہوئے اعلان کرتا:

''او گامی کنجر! اٹھا لے اپنی ڈھولک یہاں سے''

اور گامی اسد جو کو موٹی سی گالی دے کر ڈھولک ایک طرف کر لیتا۔

گامی ڈھولک بجانے میں ماہر تھا اور یہ فن اس نے کلیر شریف کے عرس پر کلانور کے ایک مشہور ہیجڑے سے سیکھا تھا۔ اس کے ڈھولک کی سنگت میں شیر دل کے گیت کئی گنا سہانے معلوم ہوتے۔ تال دیتے وقت گامی کی چھوہاروں ایسی آنکھیں بند ہوتیں اور وہ یوں دوہرا چوہرا ہو کر بدن کو پیچ و خم دیتا گویا اس کا انگ انگ کھجلا رہا ہو۔ گیت ختم ہونے پر وہ حقے کا طویل کش کھینچتا اور دھوئیں کا غبار چھوڑتے ہوئے تھوک کر کہتا:

''مسٹر لالو پہلوان کبھی بجایا کرتے تھے ڈھولک۔۔۔۔۔۔۔ اب تو انگلیوں میں وہ دم نہیں رہا اللہ بخش جلی میراثی نے ہاتھ چوم کر کہا تھا' پتر گا تک نہیں لیکن ناتک ضرور ہے۔''

شیر دل ناک سے سیٹی بجاتے ہوئے لمبا سانس لیتا اور چپکا رہتا۔ تاجی لالو کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہتا۔''پہلوان ایک شاعر نے خیال باندھا ہے کہ

اگر میں باغباں ہوتا تو گلشن کو لٹا دیتا
پکڑ کر ہاتھ مجنوں کا میں لیلیٰ سے ملا دیتا

گامی کی سج دھج میں عورتوں ایسا بانکپن تھا۔ وہ چاند خان پٹواری کے آئینے کے آگے کھڑا ہو کر دیر تک اپنی خاکی رنگ کی بادبانی شلوار کے بل درست کیا کرتا اور پھر یوں سنبھل سنبھل کر گلی میں ٹہلنے لگتا جیسے کیلے کے چھلکوں پر چل رہا ہو۔ اس کی نیلی قمیض دھلتے دھلتے خستہ ہو گئی تھی اور جگہ جگہ سے رنگ اڑ گیا تھا۔ تاش کی بازی میں جب وہ ہارنے لگتا تو ایک دم پتے بیچ میں پھینک کر اٹھ کھڑا ہوتا۔

''یہ بلف بازی نہیں چلے گی مسٹر''

اس نے انگریزی کے دو تین لفظ رٹ رکھے تھے جنہیں بگاڑ کر وہ ہر جگہ ٹھونس دیا کرتا پیر ستی نے فیروز کو کین فروش کی گرفتاری کا حال سنایا تو گامی جوتا جھاڑ کر بولا:

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

"چچا برے کاموں کے ہمیشہ برے لزلٹ ہوتے ہیں۔"

اس کے علاوہ اسے قصّے کہانیاں سنانے میں بھی کافی مہارت حاصل تھی۔ داستان امیر حمزہ اس نے پوری کی پوری حفظ کر رکھی تھی۔ جاڑے کی لمبی راتوں میں جب اندھیرا ہوتے ہی گلی کوچوں میں ٹھنڈ اتر آتی اور آسمان پر دھوئیں اور گرد کی اوٹ میں پیلے پیلے ستارے ٹمٹمانے لگتے اور تنور خانے کا دروازہ ذرا اگر بند کر دیا جاتا تو دوکان بہت جلد گرم حمام بن جاتی۔ تمام کاریگر تنور پر آن جمع ہوتے۔ اسد جو آنگن سے گرم گرم بھوبھل کا بیلچہ بھر کر لے آتا اور زمین پر رکھ کر ہاتھ پاؤں سینکنے لگتا۔ پیر سنتی پرانے کمبل میں لپٹا کونے میں دبک جاتا اور اپنی پیازی آنکھوں سے شیر خان کو پشاوری حقے کے لمبے کش لگاتے دیکھنے لگتا۔ پورے کھلے جبڑوں سے دھوئیں کے بادل اگلتے ہوئے خان کی آنکھوں میں پانی آ جاتا اور وہ انہیں گندی آستین سے پونچھتے ہوئے فتویٰ دیتا:

"پشاوری تمباکو سے بینائی تیز ہوتی ہے۔"

گامی میلا کچیلا تولیہ سر پر لپیٹے آلتی پالتی مارے تنور کنارے بیٹھا ہوتا۔ وہ کھنکار کر پراسرار آواز میں کوئی نہ کوئی رام کہانی چھیڑ دیتا۔

"ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، خدا کا بھیجا رسول بادشاہ اور پیارے رسول کا یہ عاجز غلام اس قصے کو یوں شروع کرتا ہے کہ شاہ افراسیاب پر جب غنچہ جادوگرنی کا جادو چل گیا تو ایک رات اس نے موچنے سے بادشاہ کی داہنی مونچھ کا بال اکھیڑنے کی کوشش کی۔ افراسیاب ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا اور یوں کلام کیا کہ

"غنچہ جان یہ کیسی دلگی؟"

غنچہ جان بھی احد کاکا کی بیوی سے کم حاضر جواب نہ تھی۔ فوراً مجرا بجالائی اور طہماسپ گرزما کا یہ مصرعہ پڑھ ڈالا کہ

دلگی ہی دلگی میں دل گیا
مجھ کو دل لگانے کا لزلٹ مل گیا

کہانی کہتے وقت اس کی آنکھوں کی سیاہی زیادہ شگفتہ ہو جاتی اور گنجان بھنویں بیقراری سے اوپر تلے ہونے لگتیں۔ کسی وقت اگر اس میں شاہ افراسیاب کا جلال آ جاتا تو دوسرے ہی لمحہ غنچہ جادوگرنی کے روپ میں وہ طوطے ایسی گردن اٹھا کر یوں معشوقانہ انداز میں تکتا گویا ابھی اس کے دام الفت میں گرفتار ہوں۔ شراب و طعام کی شاہانہ ضیافتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کے منہ میں پانی بھر آتا اور وہ جھوٹ موٹ ڈکار مار کر آنکھیں بند کر لیتا اور پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگتا۔ وہ پنجابی زبان کا راجہ تھا اور اپنے بیان میں ایسے برمحل

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

الفاظ استعمال کرتا کہ پورا سماں بندھ جاتا اور ہر شخص اس میں کھو جاتا۔ اگرچہ اس کی اکثر کہانیاں بے پر کی ہوتی تھیں۔ لیکن ان کا بے تکا پن بھی مزہ دے جاتا۔ بعض اوقات داستان کہتے کہتے وہ درمیان میں سے ایکا ایکی کوئی اور بات چھیڑ دیتا اور سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔

''اب تینوں شہزادے گل یاسمین کی تلاش میں پاؤں پیدل چل پڑے۔۔۔۔۔۔۔ جنگل بیاباں ہو کا عالم۔ رات یوں کالی تھی جیسے کسی حبشی نے سیاہ اچکن زیب تن کر رکھی ہو۔ مسٹر اسد جو! اب کے عید پر پھر کالی اچکن ہی ڈٹے۔ کیا خیال ہے۔ مگر یار قم کی بڑی ڈیف کلٹیاں ہیں۔''

کاریگر کہانی کے بہاؤ میں بہہ رہے ہوتے اور انہیں تبدیلی موضوع کا بالکل احساس نہ ہوتا۔ اسد جو یہی خیال کرتا کہ شاید پہلا شہزادہ دوسرے شہزادے سے اچکن سلانے کا مشورہ کر رہا ہے۔ لیکن جب گامی اس کی ران پر زور سے ہاتھ مار کر غراتا:

''او ہاتو کی اولاد! کتھے ہوندیں؟''

تو اسد جو اس کی ٹانگ کھینچ کر اوپر سوار ہو جاتا۔

''تیری ماں کی ملائی برف بناؤں۔ یہ کہانی سنا رہے تھے؟''

گامی نیچے پڑے پڑے اس کی منت سماجت شروع کر دیتا۔''

''او گڈ مین کی لالٹین، تم تو ہمارا پاپا ہے۔۔۔۔۔۔۔ بے لو پاپا!''

نیک دل خان گھوڑے کی طرح ہنہناتے ہوئے سر مارنے لگتا۔

''کھولو چاآدمی اے۔۔۔۔۔۔۔ اس کا بھرکس نکال دو۔''

پیرے گرم کمبل اوڑھے سو گیا ہوتا۔ تنور پر دھما چوکڑی مچتے ہی وہ جاگ پڑتا۔ ایک آنکھ کھول کر وہ گامی اور اسد جو کو آپس میں اوپر تلے دیکھتا اور ناک سے خوں خوں کی آواز پیدا کرتے ہوئے منہ لپیٹ کر سو جاتا۔

شیر دل بیڑے سلگائے تاجی کے پاس بیٹھا ڈھولک کے چھلے کس رہا ہوتا۔ تاجی لحاف میں سے کدو ایسا سر نکال کر دنگا کرنے والوں سے یوں خطاب کرتا۔

''باز آجاؤ، باز آجاؤ سور کے جنو!''

اس کے بعد لحاف کے پلے سے ناک صاف کرتے ہوئے وہ شیر دل کی طرف آنکھیں اٹھاتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ایک یہ امیر کھسرے کی اولاد میرے سرہانے بیٹھی ہے۔''

''اوتخم حرام اور کچھ نہیں تو درباری کا خیال ہی اڑ جائے۔''

شیر دل کو بس کہنے کی دیر ہوتی۔ وہ کبوتر کی طرح جھٹ آنکھیں بند کر لیتا اور ہریش چندر فلم کا مشہور گیت الاپنے لگتا۔

شام نہیں آئے

تڑپت جیارا

اس کی اداس اداس آواز صلح کی پیامی بن کر لڑنے والوں کے ہاتھ تھام لیتی اور ہر آدمی اپنی اپنی جگہ پر یوں چپکا ہو بیٹھتا گویا ایک مدت سے گوش بر آواز ہو۔ وہاں صرف سماوار کی مسلسل سرسراہٹ کی آواز سنائی دیتی جو گانے والے کے افسردہ سروں میں مخل نہ ہوتی۔ کڑوے تیل کے چراغ کی زرد لو طاق میں ٹمٹما رہی ہوتی۔ ایسے میں کاریگروں کے آگ میں جھلسے ہوئے کرخت چہروں پر ایک دل آویز معصومیت جھلکنے لگتی۔ معلوم ہوتا وہ کمسن بچے ہیں جو کھیل کود سے فارغ ہو کر آتشدان کے پاس بیٹھے بوڑھے دادا سے مہر و محبت کی حکایات سن رہے ہیں۔ باہر غضب کا پالا ہوتا۔ گلی سنسان ہوتی اور کتے دوکانوں کے تختوں تلے گٹھڑی بنے سو رہے ہوتے۔ دھواں کھائے روشندان اور نمدے کے سوراخوں میں سے سرما کی نیلگوں چاندنی اندر جھانکنے لگتی اور اس کی کافوری چمک میں جھکی ہوئی گردنوں پر خواہ مخواہ بوسیدہ کتبوں کا گمان ہونے لگتا۔ شیر دل گیت ختم کر کے پل بھر چپ رہتا اور آنکھیں بند کر کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگتا۔

''گانا تو جادو ہے بھائیو۔۔۔۔۔۔۔ اس کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔''

اتنا کہہ کر ناجی لحاف سے باہر نکل آتا اور سر سے لپٹا سڑا بسا تولیہ ٹھیک کرنے لگتا۔ اسد جو گردن اٹھا کر ڈکار مارتا اور آنکھیں میچا کر کہتا:

''بھیج مولا کوئی چلبلی عورت۔۔۔۔۔۔۔ ارے مولا صاحب تیرے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے۔''

اور سماوار سے کشمیری چائے پیالیوں میں انڈیلنے لگتا۔ کوٹھڑی چائے کی گرم اور خوشگوار مہک سے بھر جاتی۔ نیک دل خان میٹھی خطائیوں کے صندوق پر بیٹھے بیٹھے سو گیا ہوتا۔ سماوار سے پیالیوں کے ٹکرانے کی آواز پر وہ ایک دم چوکنا ہو جاتا اور نسوار کی چٹکی منہ میں رکھتے ہوئے نعرہ لگاتا:

''خو چائی تو کہاں سے آئی؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر خود ہی اس کا جواب بول اٹھتا:

''خو پیشور''پشاور'' سے آئی لالہ!

اس کے بعد وہاں نمکین چائے کا دور شروع ہوتا۔

شیر دل چائے میں سوکھا کلچہ ڈال کر گامی سے ہمکلام ہوتا:

''ابھی ابھی میں گن کلی گا رہا تھا۔ یہ بھیرویں ٹھاٹھ کا راگ ہے اور جانور پر بھی اثر کر جاتا ہے۔ فلم کمپنی کے سیٹھ کو یہی راگ سناؤں گا۔ تمہیں چاہیے کہ یہ راگ ڈھولک پر اچھی طرح پکا لو۔''

گامی چائے میں جلی ہوئی باقر خوانی بھگوتے ہوئے حامی بھرتا۔

''نیور مین'' (نیور مائینڈ)

کچھ دیر کے لیے تنور خانے میں خاموشی چھا جاتی اور اس خموشی میں صرف چائے پینے کی سسکاریں سنائی دیتیں۔ اسد جو دوسری پیالی غٹا غٹ چڑھاتے ہوئے بولتا:

''دوستو! اگلی بہار میں تم سب میرے ساتھ کشمیر چلو۔ گشتابہ پکانے میں میری زینو کشمیر بھر میں ایک ہے۔''

ناجی چائے حلق میں انڈیل کر اپنے بوجھل لحاف میں جا گھستا اور ٹانگیں گرم تنور پر پھیلا دیتا۔ لالو پہلوان منہ پونچھتے ہوئے اٹھتا اور پنیر کی پوٹلی پر چھتی سے لٹکاتے ہوئے اپنے آپ بول اٹھتا:

''آج تو غضب کا پالا پڑ رہا ہے۔''

اس پر اسد جو سماوار کی راکھ جھاڑتے ہوئے فوراً گرہ لگاتا:

''ہونہ ہو کل گیارہ کا حرف پڑے گا۔''

سماوار ایک طرف رکھنے کے بعد اسد جو مٹی کے کوزے میں سوکھی کھجوریں بھگوتا۔ لکڑی کے سیلے کندے تنور کی دیوار کے ساتھ لگاتا اور لوئی کندھے پر ڈال کر اپنی کوٹھری کا رخ پکڑتا۔ کچھ دیر بعد اس کی نیند بھری آواز سنائی دیتی:

''سو جا گنہگار بندے۔۔۔۔۔۔۔ یا پیر دستگیر بلا اپنے روضے پر''

پیر سائیں گہری نیند میں یوں خوں خوں کر رہا ہوتا گویا خواب میں کسی بچے کو ڈرا رہا ہو۔ ناجی نیو نچوڑ لحاف میں گھستے ہی بے ہنگم خراٹے بھرنے لگتا۔ نیک دل خان ناس دانی میں سے دو تین بار ہلاس سونگھتا۔ گھنی سپید داڑھی میں بھدی انگلیوں کی کنگھی پھیرتا اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صدری کے اندر ہاتھ ڈال کر پسلیاں کھجلاتا لکڑیوں سے بھری ہوئی خوابگاہ کی طرف ہو لیتا۔ لالو پہلوان میدا گوندھنے والا تختہ صاف کر کے اس پر بستر جماتا اور کمبل اوپر کھینچ کر "کالی بلی کبوتر کھا گئی رے"

گنگناتے یوں بے سدھ ہو کر سو جاتا جیسے کئی برسوں سے جاگ رہا ہو۔ تنور خانے میں اب صرف شیر دل اور گامی رہ جاتے۔ شیر دل بیڑی پیتے ہوئے اسے بتانے لگتا کہ راگ ودیا کی جستجو میں اس نے در در کی خاک چھانی اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ تین سال تک شہر بنارس میں وہ ایک پنڈت راگی کو اپنی جیب سے گانجا پلاتا رہا اور ایک روز جب پنڈت جی ترنگ میں آئے تو فرمایا:

راگ ودیا تیرے بس کا روگ نہیں مورکھ! اس کے لیے من مارنا پڑتا ہے۔ مانس سو سال تک سنگیت سنے' سو سال ریاضت کرے پھر سو سال اسے گائے۔۔۔۔۔۔۔ جب کہیں جا کر اس علم کا سراغ ملتا ہے۔"

پھر کسی طرح اس نے پنڈت جی کو خیر باد کہی اور اپنے گھر آ گیا۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اجاڑ میدانوں میں نکل جاتا اور خالی گھڑے میں منہ ڈال کر آوازیں لگایا کرتا۔

"وہ بڑے بھلے سے تھے گامی بھائی! سر پر کسی کا بوجھ نہ تھا۔ ماں مردے نہلایا کرتی تھی۔ باپ دہلی والوں کے دوائی خانے میں دوائیاں گھوٹنے پر ملازم تھا۔ گھر میں اچار مربوں کی کمی نہ تھی۔ کفن میں سے جو لٹھا بچ رہتا ماں گھر لے آتی۔ میں ہر دسویں پندرھویں نئی شلوار بناتا تھا۔ آج گھر کا دھندا بمشکل چل رہا ہے۔ وہ لوگ آنکھ اوجھل کیا ہوئے ہر شے نے اپنی کایا پلٹ دی۔ اب جینے میں کیا رکھا ہے۔ پھر بھی اس کا شکر ہے۔ غم کر کے اپنے پلے سے ہی کچھ کھونا پڑتا ہے۔ کچھ ہنستے گاتے گزر گئی ہے۔ کچھ ہنستے گاتے گزر جائے گی۔"

شیر دل کی آواز بھاری ہو کر رک جاتی۔ اس کی انگلیوں میں بیڑی بجھ گئی ہوتی۔ وہ اداس نگاہوں سے بجھی ہوئی بیڑی کو تکنے لگتا۔ گامی سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا:

"جو دم گزر جائے وہی اچھا۔"

پھر وہ پاؤں تنور کی موری میں ڈال کر وہیں بورئیے پر لیٹ جاتا اور لوئی اوپر کرتے ہوئے نیند بھری آواز میں شیر دل کو سو جانے کا مشورہ دیتا:

"سو جاؤ شیر بھائی' سو جاؤ۔۔۔۔۔۔۔ تڑکے پھر اٹھنا ہے۔"

طاق میں جلتے ہوئے دیے کی لو مدھم پڑ جاتی اور اندھیرے کونوں میں چھپکلیاں بولنے لگتیں۔ گامی پہلو بدل کر نیند میں کھو جاتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شیر دل کاپی گھٹنوں پر کھول کر اس پر جھک جاتا اور چراغ کی دھیمی روشنی میں فلمی گیتوں کی تلاوت شروع کر دیتا۔ کسی وقت پچھلی کوٹھڑی سے اسد جو کے سوتے میں بڑبڑانے کی آواز سنائی دیتی:

تاؤ کم ہے حرامی! دو کندے اور ڈال دو۔۔۔۔۔۔"

شیر دل کی آنکھیں بوجھل ہونے لگتیں اور پلکیں اپنے آپ بند ہو جاتیں۔ کاپی صدری کی جیب میں ڈال کر وہ غنودگی کے عالم میں اٹھتا اور جمائیاں لیتا عقبی کوٹھڑیوں کے اندھیروں میں گم ہو جاتا۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ باہر دسمبر کی سرد رات بادلوں میں چھپ گئی ہے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ دور تک خالی گلی کا پتھریلا فرش بھیگا ہوا ہے۔ دروازے پر گرا ہوا نمدار ہوا میں بادبان کی طرح پھول رہا ہے۔ بارش کے قطرے ٹین کے سائبان میں ٹپاٹپ گر رہے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بھولا بھٹکا اجنبی دروازے پر دستک دے رہا ہو۔

ٹپ ٹپ۔۔۔۔۔۔ٹپاٹپ۔۔۔۔۔۔

مجھے اندر بلا لو مجھے اندر بلا لو

باہر سردی ہے اور مینہ پڑ رہا ہے۔

اور میرے کپڑے گیلے ہیں

ٹپ ٹپ۔۔۔۔۔۔ٹپ ٹپ۔۔۔۔۔۔

لیکن اندر کوئی نہیں۔ دیوار گیر میں چراغ دھیما پڑ گیا ہے۔ سماوار تنور پر بجھا پڑا ہے۔ دن بھر کے تھکے ہارے کاریگر گہری نیند میں کھو چکے ہیں۔ تاجی لحاف کے اندر خراٹے بھر رہا ہے۔ نیک دل خان کا منہ نیند کی دیوی نے چوم لیا ہے اور وہ کھلے کا کھلا رہ گیا ہے اور سانس لینے سے اس کی مونچھوں کے سپید بال ہل رہے ہیں۔ گامی کے پاؤں تنور میں ہیں۔ باقی جسم لوئی میں لپٹا ہے۔ پیر بخش تنور پر گٹھڑی بنا خوں خوں کر رہا ہے۔ اسد جو میدے کی خالی بوریوں میں گھس پہلگام کے خواب دیکھ رہا ہے اور باہر مینہ کی دھیمی پھوار میں ٹین کے سائبان پر بوندوں کی غمگین دستک رک گئی ہے۔ ویران گلی میں مرطوب دھند اٹھنے لگی ہے اور بجلی کے تاروں پر بارش کے موتی قطار در قطار لٹک رہے ہیں اور صبح کے انتظار میں، روشنی سورج اور چمکیلی دھوپ کے انتظار میں کانپ رہے ہیں۔ جھکے ہوئے چھجوں اور بند دروازوں والے مکانوں کے اندر روشنیاں بجھ چکی ہیں اور شریر بچے، مہربان مائیں، معصوم بہنیں اور نیک دل بھائی گرم لحافوں میں دبکے بھیگتی سرمائی رات کی نیند میں مگن ہیں اور ان گھٹی ہوئی پر پیچ گلیوں سے اوپر کٹے پھٹے سرمئی بادلوں کی اوٹ میں نیلے ستارے اپنی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھیگی پلکیں جھپکا رہے ہیں اور اس کی شفاف آنکھوں میں برفانی صبحوں کی نغمگی تھرتھرا رہی ہے اور ان گلیوں سے دور شہر سے باہر میدانوں میں کہر کے لطیف گالے اتر آئے ہیں۔ کھیتوں پر زرد زرد دھند تیر رہی ہے۔ گیلے سائے درختوں میں سمٹ آئے ہیں اور ان کے درمیان سے ہو کر گزرنے والی نازک پگڈنڈیاں بارش میں بھیگ گئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے نالے مترنم آواز کے ساتھ کھیتوں میں گر رہے ہیں۔ ان کا سرد اور تازہ پانی پھول پتوں کو تازگی اور توانائی بخش رہا ہے۔ یہ بہتی ہوئی چاندی۔۔۔۔۔۔۔ جو برف آلود چوٹیوں سے پگھل کر آ رہی ہے۔ یہ ٹھنڈا پانی' جس میں ریت اور مٹی کی آمیزش ہے اور جسے کسی مشین نے صاف نہیں کیا اور جو پیاسوں سے کوئی ٹیکس نہیں مانگتا۔ اس کی بڑھتی' رکتی' اچھلتی لہروں نے پہاڑوں سے میدانوں تک آتے ہوئے راہ میں ان گنت درختوں کی جھولتی شاخوں کا منہ چوما اور کئی نازک اندام شرمیلی بیلوں کو آغوش میں لے کر چھوڑ دیا ہے اور پھر انہیں بھلا دیا ہے۔ اور وہ اس متحرک آئینے میں ٹہنیوں پر سے جھک کر کتنی ہی نوزائیدہ کلیوں نے اپنا عکس دیکھا ہے اور شرما کر پتیوں کو گھونگھٹ نکال لیا ہے۔ یہ دھرتی کا دودھ ہے' یہ پگھلا ہوا سونا ہے' یہ برف پوش بلندیوں کا مہمان ہے اور تاریک جنگلوں کا سفیر ہے۔

یہاں پر سکون چپ چاپ ہے' لطیف آسودگی ہے' بے داغ محبت ہے' پاکیزگی ہے۔ یہاں پھول کھلتے ہیں' نیلے پیلے' خوش رنگ' اوس میں شرابور' نازک ڈنٹھلوں والے کومل پتیوں والے یہاں پھولوں کی مہک ہے۔ گھاس کی بو ہے' درختوں کی بو ہے۔ یہ کون سی سر زمین ہے؟ یہ کونسا محلہ ہے؟ یہ کونسا کلچر ہے؟

آسمان پر نیلگوں جھلکیاں نمودار ہو رہی ہیں۔ یہ طلوع ہونے والی عظیم روشنی کے نشانات ہیں۔ یہ زرفشاں عماری میں بیٹھ کر آنے والی شہزادی کی پیش رو کنیزیں ہیں اور یہ بیدار ہونے والی کرنوں کا سانس ہے اور کسی آسمانی کتب کا زمردی پیش لفظ ہے۔۔۔۔۔۔۔ مشرق میں سیال نور کا جوالا مکھی پھوٹ بہا ہے۔ تازہ دم نرمل سنہری کرنیں شبنمی پھولوں سے ہم آغوش ہو گئی ہیں اور شفق کو دیکھتے ہی ندی نالوں کا منہ سرخ پڑ گیا ہے۔ پگھلا سونا پیڑ پودوں کو چھو کر گزر رہا ہے۔ ایک جگہ لوکاٹوں کا ادھ پکا زرد گچھا ندی پر جھک گیا ہے وہ اسے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے لہروں کا منہ حیا سے دمکنے لگتا ہے اور وہ سمٹ کر تیزی سے آگے نکل جاتی ہیں۔

یہ لوکاٹوں کا نوعمر گچھا' یہ درخت کا بیٹا' کنواری لہروں سے کیا کہہ رہا ہے؟ میں دبے پاؤں قریب جا کر اس کی پریم کویتا سننا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ میری آہٹ سے شاید قوس قزح کا ریشمی طلسم ٹوٹ جائے۔ میں بجلی آگ بھاپ کی سرزمین کا باشندہ ہوں۔ مجھے بھوک نے جنم دیا ہے اور میں دن کو بھوک پیدا کرتا ہوں اور رات کو بچے میں ایک خوفناک بھوت ہوں اور میری آمد

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی خبر پا کر خوبصورت پریاں اپنے محبوب کو کھیاں بنا کر دیوار سے چپٹا دیا کرتی ہیں۔ مجھے شرمیلی لہروں اور درخت کے بیٹے کی پریم کہانی میں مخل نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔۔۔۔۔۔۔گزر جانا چاہیے۔

اب دن نکل آیا ہے۔ روشن اور گرم دھوپ مکانوں کی گیلی منڈیروں سے دھندلی گلیوں میں جھانک رہی ہے۔ نمازی جوتے جھاڑتے' کمبل سنبھالتے مسجدوں سے باہر نکل رہے ہیں۔ نھو قصائی دو تین بھیڑیں ساتھ لیے ایک گودی میں اٹھائے سردی میں ٹھٹرتا گھر سے باہر نکل رہا ہے۔ بسا گوجرا انگیٹھی میں آگ جلا رہا ہے اور اس کی دکان دھوئیں سے بھر گئی ہے۔ بکریوں کا دودھ بیچنے والے گڈریے ریوڑ ہانکتے گلیوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ ورکشاپ میں کام کرنے والے مزدور نمدا بنے گرم کوٹوں اور کمبلوں میں لپٹے تیز تیز گلی میں سے گزر رہے ہیں۔ ان کے منہ سے بھاپ نکل رہی ہے اور پالے سے ناک سرخ ہو رہے ہیں۔ احد کاکا کی دوکان میں تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ نیک دل شیر خان منہ میں نسوار کی چٹکی رکھے بڑی پھرتی سے کلچے گھڑ رہا ہے اسد جو گندھے ہوئے میدے کو گول گول پیڑے بنا رہا ہے۔ احد کاکا بار بار لنگڑی ٹانگ اٹھا کر تنور میں کلچے لگا رہا ہے۔ فرید ونا جی لوہے کی چھڑیاں ہاتھوں میں لیے لگے ہوئے کلچوں کا جائزہ لے رہا ہے۔ کسی وقت وہ چھڑی اندر ڈال کر تنور پر جھکتا ہے اور پکا ہوا سرخ کلچہ باہر نکال لاتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے اور وہ انہیں آستین سے پونچھتا بھی جاتا ہے۔ دوکان کا نمدا ایک طرف سے اوپر اٹھا ہے اور باہر تخت پر بیٹھا ہوا لالو پہلوان سر پر گلوبند لپیٹے گاہکوں سے نپٹ رہا ہے۔ گامی آنگن میں کلہاڑی سے لکڑی کے کندے پھاڑ رہا ہے۔ شیر دل چابکدستی سے کلچوں پر تل لگا رہا ہے۔ تنور خانہ گرم ہے اور فضا میں پکے ہوئے خمیرے میدے کی خوشبو پھیلی ہے۔ ہر آدمی ایک دوسرے سے بے خبر اپنے اپنے کام میں مگن ہے۔ گامی کی ڈھولک کونے میں دیوار سے لٹک رہی ہے۔ شیر دل کی گیتوں بھری کاپی صدری کی جیب میں بند پڑی ہے۔ اسد جو کا ساوار سرد ہے۔ شیر خاں کا پشاوری کلیان الماری کے پاس بجھا پڑا ہے۔ گامی کی جادو بھری کہانیوں کے لب منجمد ہیں۔ تنور خانے پر کسی ایسی مشین کا گمان ہو رہا ہے جس کا ہر پرزہ اپنی جگہ پر درستی سے کام کر رہا ہو۔ جھکی ہوئی دھواں کھائی چھتوں اور جلی ہوئی بوسیدہ دیواروں والی اس دوکان میں تنومندی جفاکشی اور انتھک محنت کا دن طلوع ہوا ہے۔ اب کوئی سو نہیں رہا' کوئی خراٹے نہیں بھر رہا' گیت ڈھولک میں بند کر دیے گئے ہیں' نیند بستروں کے ساتھ ہی لپیٹ دی گئی ہے اور جلے ہوئے ہاتھوں' جھلسے ہوئے چہروں اور سوجی ہوئی آنکھوں والے کرخت اور بھدے انسان امن و آسودگی کی کینچلی سے باہر نکل آئے ہیں اور ان کے بے ڈھنگے جسم آتش پاروں کی طرح تنور کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔

کام' کام کام

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

احد کا کا کی نمدے سے ڈھکی ہوئی دوکان کے اندر بڑی سرگرمی سے کام ہو رہا ہے۔ ایسی سینکڑوں' ہزاروں' لاکھوں دوکانوں کے اندر کام ہوتا رہا' دروازوں پر نمدے پڑے رہے اور پنجاب تقسیم ہو گیا اور دوکانیں تنور بن گئیں اور انسان بے زبان کلچوں کی مانند اس جہنمی آگ میں بھسم ہو کر رہ گئے اور جب ملبہ اٹھایا گیا تو جلی ہوئی لاشوں میں کہیں شیر دل کے گیت تھے' کہیں گامی کی ڈھولک تھی اور کہیں اسد جو کا پہلگام تھا!

اسد جو اپنی جان بچا کا بھاگا اور چھہرڑ کے پاس ایک برساتی نالہ عبور کرتے ہوئے مارا گیا اور چناروں پر گرتی برف کے پھول دیکھنے کی حسرت بھی اس کے ساتھ ہی مر گئی ہے۔ شاید اس کی زینو گندے فرن کے اندر کانگڑی چھپائے' پہلگام سے میلوں دور کسی بادام کے درخت تلے اب بھی اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ اس کا لمبا فرن ہوا میں پھڑ پھڑاتا ہو گا۔ اور درخت پر سے زرد پتے اس کے اوپر گر رہے ہوں گے اور اس کے ہونٹ کسی ویران قلعے کے دروازے کی مانند بند ہوں گے اور اس میں دروازے پر لکھا ہو گا:

''میرے اسد جو! میرے شیر! خزاں پھر آ گئی' تم کب آؤ گے؟''

ہاں خزاں آ گئی ہے اور اس کے بعد بہار بھی آئے گی لیکن اسد جو کبھی نہیں آئے گا۔ کبھی کشمیر' کبھی پنجاب اور کبھی بہار میں انتظار کرنے والی زینو! تیرا اسد جو مندروں کے چبوتروں' مسجدوں کی سیڑھیوں' گردواروں کے استھانوں' ریل کے ڈبوں' گندے جوہڑوں اور برساتی نالوں میں قتل کر دیا گیا ہے اور اس کا جسم گدھیں نوچ لے گئی ہیں اور اب وہ تیرے پاس کبھی نہیں آئے گا کبھی نہیں!

گامی پاکستان پہنچتے ہی کراچی نکل گیا۔

فرید و تاجی ایک سال تک لاہور کے مہاجرین کیمپوں کے چکر کاٹتا رہا۔ بیکاری سے تنگ آ کر اس نے داتا صاحب کے روضے کے باہر دعائے گنج العرش اور دعائے قنوت کے تعویذ بیچنے شروع کر دیئے۔ جب اس ڈھونگ سے بھی روزی کی کوئی سبیل نہ بنی تو ایک روز اس نے تمام تعویذ مفت بانٹ دیئے اور خود قلقلی شاہ کا مرید ہو کر عقبی تکیے چلا گیا۔ وہ اب بھی وہیں ہے۔ وہ ہر دم بھنگ اور چرس کے نشے میں دھت رہتا ہے۔ جو روکھی سوکھی ملتی ہے وہیں کھا کر علی حیدر کا بھرپور نعرہ لگاتا ہے اور وہیں کسی درخت کے نیچے پڑ کر سو رہتا ہے۔ اس کے بال بے تحاشا بڑھ گئے ہیں اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہے۔ برسات کے دنوں میں رونما ہونے والی مہلک جنسی بیماری کے لیے اب اس کے پاس کوئی مرہم نہیں اور آتشک کے داغ پھر سے زخموں میں تبدیل ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

شیر دل کچھ مدت والٹن کیمپ میں رہا اور پھر اسے گمٹی بازار میں ایک مکان الاٹ ہو گیا۔ اس مکان کا پچھلا حصہ گرا ہوا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برسات لگی تو اس کا اگلا حصہ بھی ڈھے گیا۔ وہ اپنے کنبے سمیت راولپنڈی چلا گیا اور کسی ہوٹل میں بیرہ گری شروع کر دی۔ وہاں اس کی بیوی اکثر بیمار رہنے لگی۔ شیر دل کو پھر بوریا بستر اٹھا لاہور آنا پڑا اور آج کل وہ سوتر منڈی میں دستگیر نانبائی کی دکان پر دو روپے روز پر ملازم ہے۔ بیوی بچے دوکان کے پیچھے ایک گھٹی ہوئی کوٹھڑی میں رہتے ہیں۔ نانبائی تنخواہ میں اس کوٹھڑی کے بھی پانچ روپے کاٹ لیتا ہے۔ شیر دل اپنے تمام گیت بھول چکا ہے۔ وہ گن کلی بھی بھلا بیٹھا ہے جو بھیرویں ٹھاٹھ کا راگ ہے اور جسے وہ رنجیت فلم کمپنی کے سیٹھ کو سنا کر بلی موریئے کی جگہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے کام میں مگن رہتا ہے اور بہت کم کسی سے بات کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ تکیہ قلقلی شاہ میں ناجی سے ملنے چلا جاتا ہے۔ ناجی چرس میں دھت سرخ آنکھیں اٹھا کر شیر دل کو دیکھتا اور راکھ ملے لمبے بالوں کو جھٹک کر سر جھکا لیتا ہے۔ شیر دل اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور بیڑی کا کش لگاتے ہوئے کسی وقت خود بخود بول اٹھتا ہے:

اور ناجی لاپرواہ لیکن اداس لہجے میں اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے:

''کچھ گزر گئی ہے' کچھ گزر جائے گی بھائی۔

پیر سخی کا اپنا دھندا یہاں بالکل نہیں چل سکا۔ وہ پچھلے تین سال سے دلی دروازے کے باہر دھوتیاں اور کھدر کی سلی ہوئی قمیص بیچتا ہے۔ دھوتیاں اور قمیص کندھوں پر ڈالے لوگوں کے ہجوم میں سڑک کنارے چپ چاپ کھڑا رہتا ہے اور یوں اجنبی نگاہوں سے ادھر ادھر تکتا رہتا ہے۔ جیسے راستہ بھول کر کسی ناواقف جگہ نکل آیا ہو۔ ایک ایسی جگہ جہاں کوئی اس کا دوست نہ ہو اور کسی کو اس سے بات کرنے کی فرصت نہ ہو۔ اس کی دونوں لڑکیاں جوان ہو چلی ہیں۔ یہ کنبہ گوالمنڈی میں کسی مکان کے تہہ خانے میں مقیم ہے۔ یہ تہہ خانہ چوہوں سے بھرا ہوا ہے اور یہاں سورج کی روشنی کبھی نہیں آئی اور یہاں دن کو لالٹین جلانا پڑتی ہے۔ پیر سخی کی بیوی دن بھر چارپائی پر پڑی کھانستی رہتی ہے اور اس کی دونوں بیٹیاں اپنی پھٹی ہوئی شلواروں کو پیوند لگایا کرتی ہیں۔ پیر سخی ایک عرصے سے دلی دروازے کے باہر دھوتیاں بیچ رہا ہے اور اس کے سر کی پگڑی ڈھلک گئی ہے اور اس کے گھر ہر دوسرے تیسرے دن فاقہ آ جاتا ہے اور اس کے دونوں لڑکیاں جوان ہو چلی ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کسی روز وہ دھوتیوں کے ساتھ اپنی پگڑی کا بھی سودا نہ کر بیٹھے۔

کراچی میں گامی کا جی نہ لگ سکا تو وہ لاہور آ گیا۔ شروع شروع میں وہ بھوکوں مرنے لگا اور نوبت کپڑے بیچنے تک آ گئی۔ لیکن خدا بڑا کارساز ہے۔ وہ اپنے نیک بندوں کی عین وقت پر مدد کرتا ہے۔ گامی صوبہ سرحد سے چرس خرید کر اسے موٹر کے مڈگارڈوں پر لیپ کر کے لاہور پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ اب وہ یہی دھندا کرتا ہے۔ ہیرا منڈی میں اس کی اپنی بیٹھک ہے جہاں جوا ہوتا ہے' چرس بکتی ہے' کوکین بکتی ہے اور گامی کا چمکیلا پمپ شو چلتے وقت آواز پیدا کرتا اور ریشمی دھوتی کے پلو زمین پر جھاڑو سا دیتے ہیں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ ہر روز سر میں دہی ڈال کر نہاتا ہے اور پمپ شو کو مکھن سے چمکاتا ہے۔ لالو پہلوان پیر اشراقی شاہ کے مزار پر مجاوروں کی منڈلی میں شامل ہو گیا ہے اور آٹھوں پہر بھنگ کی ترنگ میں ڈوبا رہتا ہے۔ نتھی ڈومنی کے ساتھ مل کر وہ مال اور میکلوڈ روڈ کے ہوٹلوں کو لڑکیاں بھی سپلائی کرتا ہے اور پہلے سے زیادہ موٹا ہو گیا ہے۔ اور تھوکتے وقت زیادہ آگے نہیں جھک سکتا۔ جس کی وجہ سے اس کے کپڑوں پر جا بجا پان کی پیک کے دھبے پڑے رہتے ہیں۔ ان دھبوں کے خوں رنگ نشان اس پتھر پر بھی ہیں جس پر امرتسر پینتیس میل لکھا ہے۔ بڑ کے گنجان درخت تلے یہ پتھر کچہریوں کے بالکل سامنے نصب ہے۔ میں دن میں دو بار اس سڑک پر سے گزرتا ہوں۔ مجھے اس پتھر سے محبت بھی ہے اور نفرت بھی۔ یہ سود خور پٹھان کی طرح میرا پیچھا بھی کرتا ہے اور فرطِ مسرت سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کا خیر مقدم بھی کرتا ہوں۔ یہ خطرے کی جھنڈی بھی ہے اور تاریک سڑک کے بحرِ اسود میں وہ تنہا جزیرہ بھی' جس کے ہرے بھرے درختوں کی جھلک راہ گم کردہ ملاحوں کو امن و سلامتی کی خبر دیتی ہے۔

گوتم بدھ کو بڑ کے درخت تلے گیان نصیب ہوا تھا اور کبھی کبھی یہ سنگ میل مجھے مہاتما بدھ کے روپ میں نظر آتا ہے۔ جس کی آنکھیں بند ہوں اور انگلی ہوا میں اٹھی ہو۔ ایک منجمد معمہ! ایک سنگین سوال! کب حل ہو گا یہ سوال؟ مردہ یادوں کے مدفن پر لگا ہوا۔ یہ بے جان کتبہ مجھے ان لوگوں کی یاد دلاتا ہے جو اچھے بھی تھے اور برے بھی جنھوں نے زندگی کے اس کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جو ایک زمانہ گزرا احد کا کانا نبائی اور بسے گوجر کی دوکان میں مر کھپ گئے۔

کسی وقت کچہریوں کے سامنے اس سڑک پر سے گزرتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ کدال ہاتھ میں لے کر اس پتھر کو اکھاڑ کر پرے لڑھکا دوں اور زمین کھودنا شروع کر دوں اور پھر اس تاریک گڑھے میں سے گامی' فریدو ناجی' شیر دل اور اسد جو اور پیر ستی کو باہر کھینچ لوں۔ اسد جو کے آگے سماوار' گامی کے سامنے ڈھولک اور شیر دل کے گھٹنوں پر گیتوں بھری کاپی رکھ دوں اور خود پالتی مار کر مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ جاؤں اور اسے کہوں:

پیارے شیر دل! وہ تم کونسا گیت گایا کرتے تھے؟

شام نہیں آئے۔ تڑپت جیارا۔

◆◆◆

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ناریل کے سائے

رنگون سے مانڈلے جانے والی گاڑی میں مسافر کو جگہ مل گئی۔

دوسری جنگ عظیم چھڑ چکی تھی۔ لیکن جاپان نے ابھی لڑائی کا اعلان نہیں کیا تھا۔ اتحادیوں کو اس کی خطرناک خموشی کا بھرپور احساس تھا۔ چنانچہ برما کے ہر بڑے شہر میں ہوائی حملے سے بچاؤ کے لیے زمین دوز پناہ گاہیں کھودی جا رہی تھیں۔ امریکی برطانوی اور ہندوستانی سپاہیوں سے بھرے ہوئے بحری جہاز رنگون کی جیٹی پر لنگر انداز ہو رہے تھے۔ اور زناون لا من جی آن اور تھیالی ٹاکن کے تیل کے ذخیرہ کو ہر لحاظ سے محفوظ کیا جا رہا تھا۔ رنگون کی منڈیوں میں اجناس کے بھاؤ ایک دم چڑھ گئے تھے۔ بڑے بڑے بیوپاریوں نے اپنا سرمایہ غیر ملکی بنکوں میں جمع کرانا شروع کر دیا تھا۔ رنگون سیکرٹریٹ کے گرداگرد خاردار باڑ لگوانے کے بعد ملازموں میں شناختی کارڈ بانٹ دیئے گئے اور دروازوں پر مسلح گارڈ کا پہرہ لگا دیا۔ پٹرول اور گولہ بارود سے لدے ہوئے ٹرکوں کو سیلز بیرک سے نکال کر بڑے گرجا اور رنگون کالج کے پچھواڑے ''کیموفلاج'' کر دیا گیا۔ حکومت برما نے فوجی بھرتی کا کام بھی تیز کر دیا تھا اور کئی ایک سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کو غیر معین عرصے کے لیے نظر بند کر دیا تھا۔

مسافر گاڑی کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔

پلیٹ فارم پر کوئی خاص رش نہیں تھا۔ چند ایک برمی عورتیں ململ کی سفید کرتیوں اور سبز سرخ' گلابی لہنگوں میں ملبوس ٹی سٹال پر کھڑی لکڑی کے پیالوں میں کتھی رنگ کی چائے پی رہی تھیں۔ دو لڑکیاں تیزی سے گزر گئیں۔ ایک کے ہاتھ میں بانس کا چھوٹا سا صندوق تھا اور دوسری پھولدار چھتری اٹھائے ہوئے۔ ایک برمی لڑکا جامنی رنگ کے لہنگے کے ساتھ سبز فلیٹ سر پر رکھے ہر ڈبے کے اندر سر ڈال کر متجسس نگاہوں سے مسافروں کو تک رہا تھا۔ گارڈ صاحب سگار پی رہے تھے اور جھنڈیاں بغل میں دبائے اصیل مرغ کی مانند پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ آسمان بادلوں میں گھرا ہوا تھا اور پلیٹ فارم کی آہنی چھت پر بارش کا ہلکا ہلکا شور پیدا ہو رہا تھا۔ یہ چھت کئی جگہوں سے ٹپک رہی تھی اور فرش گیلا ہو رہا تھا۔ ڈبہ بھرا ہوا تھا۔ مسافر کے عین سامنے ایک برمی بوڑھی عورت لمبا سا چٹا یعنی سگار پی رہی تھی۔ سگار کا دھواں کڑوا اور نیلا تھا۔ کش کھینچتے ہوئے بڑھیا کے جھریوں بھرے گال اور پچک جاتے۔ ساتھ والی عورت جوانی کی منزل عبور کر چکی تھی تاہم اس کے سیاہ بال چمکیلے تھے اور جوڑے میں سفید کلیاں سج رہی تھیں۔ برمی عورتوں کا حسن لمبے بالوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

اور جلد کی ملائمت اور چمک میں پوشیدہ ہے۔ ان کا رنگ عام طور پر زرد ہوتا ہے۔ نقوش چوڑے اور چپٹے ہوتے ہیں۔ لیکن چہروں کی جلد میں بلا کی چمک اور تازگی ہوتی ہے اور ان کے مختصر گداز جسم سنبل کے تکیوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ نرم' گرم' آرام دہ' اور دیر پا۔۔۔۔۔۔ چہرے کی ملائمت کے لیے برمی عورتیں ایک خاص قسم کی بوٹی کا ست استعمال کرتی ہیں جسے برمی زبان میں تنا کھا کہا جاتا ہے۔ ہر عورت تنا کھا مل کر سوتی ہے اور صبح منہ دھونے کے بعد چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے اور جلدیوں چمکنے لگتی ہے گویا سفید ابر پاروں کے عقب سے سورج طلوع ہو رہا ہو۔ اس کے باوجود جب وہ آپ کے بالمقابل بیٹھ کر سگار سلگاتی ہیں تو دل بے اختیار انہیں بھون کر کھا جانے کو چاہتا ہے۔

مسافر نے سامنے والی عورت کو بھون ڈالنے کا خیال دل سے نکالنے کے لیے جیب سے وائٹ ہارس کا سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اسی ڈبے میں زرد کپڑوں اور منڈے ہوئے سروں والے تین چار برمی پھنگی "بدھی بھکشو" بھی بیٹھے تھے۔ فضا میں گھٹیا قسم کے تمباکو کی بو میں ناریل کے تیل کی بو مخلوط ہو رہی تھی۔ انجن نے آخری بار وسل دیا۔ گارڈ نے سیٹی بجا کر سبز جھنڈی لہرائی اور گاڑی کھسکنے لگی۔ پلیٹ فارم کے گھٹے ہوئے ماحول سے باہر نکلتے ہی مرطوب ہوا کے جھونکے لہرانے لگے۔ بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا اور اب صرف ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ سرسبز ٹیلوں کی ڈھلوانوں پر ناریل اور تاڑ کے لمبے لمبے درخت کھڑے تھے۔ دھان کے کھیتوں میں پانی ہی پانی تھا اور کہیں کہیں نازک خوشے سر باہر نکالے ہوا میں جھوم رہے تھے۔ چھوٹی لائن کے ساتھ ساتھ بانس کے گہرے سبز جھنڈ اگے ہوئے تھے جن کے درمیان چھوٹے چھوٹے برساتی نالے بہہ رہے تھے۔ پتلی پگڈنڈی پر کہیں کوئی کسان بانس کا لمبا چوڑا ہیٹ پہنے پھاوڑا ننگے کندھے پر اٹھائے مل جاتا اور کہیں کوئی مزدور پان کا ٹوکرا اور کیلوں کے گچھے اٹھائے دکھائی دیتا۔ موں پن۔ پیانگ اور ڈھالی کئی چھوٹے چھوٹے قصباتی سٹیشن گزر گئے۔ شوگان سٹیشن سے گاڑی گزر رہی تھی کہ مسافر نے سرخ بجری والے گیلے پلیٹ فارم پر ایک برمی لڑکی کو دیکھا جو زرد زرد کیلوں کا گچھا ہاتھ میں لیے آہنی بنچ پر بیٹھی تھی۔ مسافر کو یوں معلوم ہوا گویا لڑکی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ بھی اس لڑکی کو دیکھ کر مسکرایا اور گاڑی تیزی سے گزر گئی۔ اب پھر وہی بانس کے جھنڈ تھے اور برساتی نالے۔۔۔۔۔۔ مسافر نے وائٹ ہارس کے کش لگاتے ہوئے سوچا زندگی کے ہر اسٹیشن پر کوئی نہ کوئی لڑکی معصوم مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کرتی ہے اور پھر بھول جاتی ہے۔ گویا کہہ رہی ہو مسکراؤ اور بھول جاؤ' یہی زندگی ہے۔۔۔۔۔۔ کیا بڑے سٹیشن پر بھی کوئی مہربان مسکراہٹ ہمارا انتظار کر رہی ہے؟

مسافر دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ وہ برمی عورت بدستور چنا پی رہی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وین ڈاؤں کے سٹیشن سے گاڑی چھوٹی تو مسافر سگریٹ پھینک کر اٹھا اور گاڑی کے کوریڈور میں چہل قدمی کرنے لگا۔ گاڑی ان جھیلوں کے قریب سے گزر رہی تھی جن کی سطح کنول کے گلابی ہلکے زرد پھولوں اور چوڑے پتوں نے ڈھانپ رکھی تھی۔ جھیلوں پر ناریل' تاڑ بانس اور کیلے کے درختوں کا سایہ تھا اور کنول کے پھولوں کی نازک گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ بے معلوم انداز میں ڈول رہے تھے۔ کئی چھوٹے چھوٹے دیہات۔۔۔۔۔۔ لائن کیساتھ آباد تھے۔ ناریل کی چھتریوں سے ڈھکے ہوئے ڈھلوانی چھتوں والے جھونپڑوں کے باہر دیہاتی مرد اور عورتیں ادھر ادھر کام میں مشغول تھیں۔ ایک بوڑھا دیہاتی کھیت میں گھٹنوں تک پانی میں ڈوبا جھک کر دھان کی پنیری بو رہا تھا۔ انجن کا شور سن کر اس نے سر اٹھایا۔ مسکرا کر گاڑی کو دیکھا' یونہی ہاتھ لہرا کر رخصتی سلام کیا اور پھر کام میں جٹ گیا زندہ باد برمی کسان۔۔۔۔۔۔ مگر یہ دھان کس لیے بو رہے ہو؟ جنگ چھڑ چکی ہے' گاڑی برق رفتاری سے مانڈلے کی سمت اڑی جا رہی ہے اور تم گھٹنوں تک پانی میں ڈوبے ہو اور تمہاری بوڑھی کمر پر کئی انسانوں کا بوجھ ہے اور پچھلے سے پچھلے سٹیشن پر تمہاری بیٹی کیلوں کا گچھا تھامے مسکرا رہی تھی۔ اس کے پاؤں ننگے تھے اور تمہاری پیٹھ ننگی ہے مگر تم دونوں مانڈلے جانے والی گاڑیوں کو سلام کر رہے ہو۔ کیا تم ہر گاڑی کو سلام کرتے ہو؟

Do not cross me

You idiot you stupid you------

مسافر چونک پڑا اس نے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ اتفاق سے وہ سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کے آگے کھڑا تھا جس کی داہنی کھڑکی کا پٹ گرا ہوا تھا اور اندر ایک گورا سپاہی خاکی وردی پہنے' نشے میں دھت کسی موٹی تازی چقندر ایسے گالوں والی یورپین لڑکی کو بغل میں دبوچے' اس کے سر پر شراب کی بوتل انڈیل رہا تھا۔ لڑکی گالیوں کی بوچھاڑ میں اس کے چنگل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ گورا سپاہی پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا اور لڑکی کے گیلے بال اس کے گالوں سے چپک رہے تھے اور ریشمی سایہ بھیگ کر اس کے نتھنے سے پیٹ سے چپٹ گیا تھا' اور ابھی جاپان نے اعلان جنگ نہیں کیا تھا۔ گاڑی برما کے گہرے گنجان اور تاریک جنگلوں میں سے گزر رہی تھی۔

مسافر پیگو کے جنکشن پر اتر گیا۔ کیونکہ اسے وہیں اترنا تھا۔

پیگو' رنگون سے مانڈلے کی جانب پہلا شہر ہے اور چائے اور کوکو کی کاشت کے لیے مشہور ہے۔ مسافر یہاں صرف چائے اور کوکو پینے نہیں آیا تھا بلکہ رنگون ریڈیو کی طرف سے اسے یہاں کی زرعی صنعتی پیداوار پر درجن بھر فیچر لکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اردو

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پروگرام کے انچارج مسٹر ملک نے مسافر کو پیگو کے کسی پنجابی تاجر کے نام چٹھی لکھ دی تھی اور ہدایت کر دی تھی کہ وہ کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کے بجائے اسی تاجر کے ہاں ٹھہرے۔

کہنے کو تو پیگو ایک بڑا شہر ہے مگر یہاں سوائے چند ایک بڑی سڑکوں دو تین اسکولوں اور ہوٹلوں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ شہر سے باہر البتہ اونچے ٹیلوں اور جھیلوں کے کنارے لکڑی کی یک منزلہ خوبصورت کوٹھیوں کے سلسلے ضرور بکھرے ہوئے تھے۔ مسافر اٹیچی کیس ہاتھ میں لیے سٹیشن سے باہر نکلا تو رکھشا والوں نے حملہ کر دیا۔ مسافر نے اٹیچی کیس جلدی سے زمین پر رکھ دیا اور بدھی بھکشوؤں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ رکھشا بان زیادہ تر مدراسی تھے۔ جن کی آنکھیں سرخ تھیں اور دبلے پتلے جسموں پر کالی کھال چمک رہی تھی۔ وہ ایک دم رک گئے اور مسافر کو تعجب سے دیکھنے لگے۔

ایک آدمی بیڑی بجھا کر کان میں اڑاتے ہوئے آگے بڑھا:

"بابو۔۔۔۔۔۔۔ ایک دم چڑھائی پر جائے گا۔ تین تالی لے گا۔"

تین تالی سے مراد تین مرتبہ دونوں ہاتھوں کا ملنا یعنی۔۔۔۔۔۔۔ "نو آنے" تھے۔ مسافر جلدی سے رکھشا میں گھس گیا۔ رکھشا بان نے رکھشا کے بازو اٹھائے اور گھنٹی بجاتا سڑک پر چل پڑا' مسافر جیب سے مسٹر ملک کو خط نکال کر ایڈریس پڑھنے لگا۔

لاشیور لین بنگلہ نمبر ۱۳ اے

بنگلہ نمبر ۱۳ اے کے پھاٹک پر اترتے ہی مسافر نے رکھشا بان کو رخصت کر دیا اور خود ایک طرف کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ اندر کیوں کر داخل ہو۔ سامنے سے کوئی مدراسی عورت آ رہی تھی۔ جب وہ بالکل قریب آئی تو مسافر نے خالص ہندوستانی میں پوچھا:

"حاجی علم دین کھوکھر کا باڑی کدر اے؟"

عورت رک گئی۔ سرخ رنگ کی میلی دھوتی کا ایک پلو اس کی چھاتیوں کو ڈھانپتا ہوا اس کے کندھے کی طرف نکل گیا تھا۔ پاؤں کی کالی کالی چپٹی انگلیوں میں لوہے کے چھلے پڑے تھے۔ دانت پان کھانے کی وجہ سے گندے تھے اور جسم سے کچے چمڑے کی بو آ رہی تھی۔ پہلے تو اس عورت نے لال لال آنکھیں گھما کر مسافر کو غور سے دیکھا پھر دھوتی کا پلو درست کرتے ہوئے بولی:

ہنڈری ام ڈوڈوم گوڈاڑی"

مسافر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا کسی نے اس کے اوپر خالی ڈبوں کا ڈھیر الٹ دیا ہو۔ جب وہ عورت چلی گئی تو اس نے اپنے آپ کو خالی ڈبوں کے ڈھیرے میں سے باہر نکالا اور چاروں ناچار کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ کوٹھی کشادہ اور خوبصورت تھی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کی تکونی چھتوں نے اس میں بدھی مندروں ایسی بزرگی پیدا کر دی تھی۔ سامنے باغ تھا۔ گھاس تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ کیلے کے چوڑے پتوں والے درختوں کی قطار تھی۔ مینگوستین' تاڑ اور ناریل اور دریان کے پیڑ جا بجا کھڑے تھے۔ کوٹھی کے مغربی حصے کی نصف دیوار رتا کلی کی بیل میں چھپی ہوئی تھی۔ جہاں گلاس نما سرخ پھول مسکرا رہے تھے۔ وہ پورٹیکو میں کھڑا کسی ملازم کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ پرلی طرف سے چھ سات سال کی پیاری سی بچی' تتلی کی طرح پھولدار قمیص کے ریشمی فیتے اور سرخ بال اڑاتی آئی ایک اجنبی کو وہاں دیکھ کر فوراً رک گئی۔ مسافر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔ پہلے تو وہ جھجکی لیکن پھر ننھے منھے قدم اٹھاتی مسافر کے قریب آ گئی۔ لڑکی یورپین تھی۔ اس کے گھنگھریالے بالوں کا رنگ سرخ تھا اور نیلی نیلی چمکدار آنکھوں میں زندگی کا بے داغ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ مسافر کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ کسی غلط کوٹھی میں آ گیا ہے' لیکن اب۔۔۔۔۔۔۔ وہ اندر داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس نے خفت مٹانے کے لیے پوچھا:

''پیاری جل پری۔۔۔۔۔۔۔۔ حاجی علم دین کھوکھر کی۔۔۔۔۔۔''

جل پری جلدی سے بولی:

''یو وانٹ مسٹر کھوکھر؟''

اور تیزی سے اندر بھاگ گئی۔ اس کے سرخ بالوں کی لٹیں شعلوں کی طرح اس کی سپید گردن پر لہرا رہی تھیں۔ مسافر یونہی خالی الذہن سا ہو کر کھڑا تھا کہ کوٹھی کے مغربی حصے کا دروازہ کھلا۔ پردہ ایک طرف ہٹا اور ایک لڑکی یا عورت نمودار ہوئی۔ شانوں پر گرے ہوئے بھورے رنگ کے اڑے اڑے سے بال' زرد رنگت' ہلکے فاختائی رنگ کا پھولدار سایہ ہونٹ پھیکے اور پتلے' نیم سبز آنکھوں میں پروقار تنہائی' خاموشی' ویرانی اور بھیگی بھیگی چمک مختصر اور متوازن چال سے وہ برآمدے میں آ کر رک گئی۔ ننھی جل پری بھی اس کے ہمراہ تھی۔

''آپ مسٹر کھوکھر سے ملنا چاہتے ہیں؟''

اس کی آواز نرم اور لہجہ اس سے بھی زیادہ نرم تھا۔ یہ جملہ اس نے یوں ادا کیا گویا شیکسپیئر کے کسی ڈرامے کا مصرعہ پڑھ رہی ہو۔ اس کے انگریزی تلفظ سے مسافر کو اندازہ ہو گیا کہ وہ غیر انگریز ہے۔ وہ جلدی سے سنبھل کر بولا:

''جی ہاں مجھے انہیں سے ملنا ہے' میں رنگون سے آ رہا ہوں۔''

اس لڑکی یا عورت نے بڑی بے روح دلچسپی سے مسافر کو دیکھا اور بولی:

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''آپ کو ان کا انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ لوگ باہر گئے ہوئے ہیں۔''

مسافر کو ایک سادہ مگر خوبصورت کمرے میں بٹھلا دیا گیا۔

''آپ کو پیاس تو نہیں لگی؟''

''جی نہیں شکریہ!

وہ لڑکی یا عورت بغیر مسکرائے یا سر ہلائے بچی کو ساتھ لیے دوسرے کمرے میں نکل گئی۔ دیواروں پر پھولدار کاغذ چڑھا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر ہلکے سبز رنگ کے ریشمی پردے گرے تھے۔ کارنس پر شکاری کی تصویر رکھی تھی جو جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا بندوق سے مرغابیوں کا نشانہ باندھ رہا تھا۔ پاس ہی تپائی پر چاندی کا چھوٹا سا ہرن قلانچ بھر رہا تھا۔ مسافر سگریٹ سلگا کر صوفے میں دھنس گیا اور اپنے آپ سے اس بری لڑکی کا خیال آ گیا جو شوگان کے قصباتی اسٹیشن پر اس کی طرف دیکھ کر مسکرا اٹھی تھی اور جس کے ہاتھ میں زرد کیلوں کا گچھا تھا۔ کیا جانے وہ پھر زندگی بھر اس لڑکی کو نہ دیکھ سکے۔

کھڑکی کے جالی دار ریشمی پردے چنے ہوئے تھے۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ گیلی ہوا ناریل کی مہک سے لبریز تھی۔ کسی وقت ہوا کا جھونکا اندر آ نکلتا تو مسافر کو یوں محسوس ہوتا گویا وہ ناریل کا میٹھا پانی پی رہا ہو۔ وہ سوچنے لگا وہ گمنام لڑکی کہاں ہوگی؟ اس کا دل چاہا کہ وہ اسی وقت سیدھا سٹیشن پر پہنچ کر گاڑی میں سوار ہو جائے اور شوگان سٹیشن پر اتر کر اس لڑکی کے پاس بنچ پر بیٹھ جائے اور کیلوں کا گچھا تھام کر اسے کہے اسے کیا کہے۔

مسافر کیلوں کا گچھا ہاتھ میں لیے اس معصوم لڑکی کو مخاطب کرنے کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش کر رہا تھا کہ بھدی سی مینڈک نما کار پورٹیکو میں آن رکی۔ اس نے کیلوں کا گچھا نیچے رکھا اور غور سے باہر دیکھنے لگا۔

کسی نے پاؤں مار کر کار کا دروازہ کھولا اور ایک بھاری بھر کم مہندی رنگی ڈاڑھی سفید پگڑی والا آدمی پھولی ہوئی توند سنبھالتا باہر نکلا۔ مسافر نے حاجی علم دین کھوکھر کو فوراً پہچان لیا۔ مسافر کے میزبان نے دلکش مگر اداس آواز میں اس کا تعارف کرایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اسلام علیکم

وعلیکم اسلام حاجی علم دین نے ڈاڑھی کے جنگل میں انگلیاں گھماتے ہوئے مسافر کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھٹے ہوئے ڈھول ایسی آواز میں بولا:

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''بھائیا جی آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

مسافر نے جیب سے مسٹر ملک کا خط نکالا۔ حاجی صاحب خط پڑھ کر مسکرائے اور ان کے اگلے سیاہ دانت نمودار ہو گئے۔

''اچھا جی۔۔۔۔۔۔آپ لوگ پھر ریڈیو پر کام کرتے ہیں۔ ملک صاحب کی کھجلی' کا کیا حال ہے۔ میں نے انہیں گندھک کے پانی میں نہانے کو کہا تھا۔ بھئی یہ بڑا نامراد مرض ہوتا ہے مگر تم باہر کیوں کھڑے ہو' بھئی اندر آ جاؤ''

حاجی علم دین کھوکھر لالیاں ضلع جھنگ کے چک 92 الف ب کے رہنے والے تھے۔ شروع شروع میں وہ خالی کھوکھے بیچنے کا دھندا کرتے تھے۔ کوئٹہ شہر بھونچال سے تباہ ہوا تو آپ نے ملبہ ہٹانے کا ٹھیکہ لے لیا اور خوب ہاتھ رنگے۔ جن دنوں بنگال میں قحط پڑا آپ اتفاق سے کلکتے میں مونج کا کاروبار کر رہے تھے۔ آپ نے دوسرے بیوپاروں کی طرح ہزاروں من چاول سٹاک کر لیا اور جب چاول کے ایک ایک دانے کے عوض عصمتیں بکنے لگیں تو آپ نے بارہ روپے سیر کے حساب سے چاول بھوکے لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ اس کے فوراً بعد آپ حج کرنے حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ برما میں ان کے عزیز کوئلے اور چائے کا کاروبار کرتے تھے۔ حاجی صاحب نے ان کی وساطت سے رنگون میں آتے ہی ٹھیکیداری کا کام شروع کر دیا اور جنگ چھڑنے سے تھوڑی دیر پہلے پیگو میں بنگلہ نمبر ۱۳ اے بنوا لیا اور علمو سے حاجی علمی دین کھوکھر کہلانے لگے۔ ویسے بعض لوگ اسے مسٹر کھوکھا بھی کہتے تھے۔

مسافر کو رہنے کے لیے جو کمرہ ملا وہ کوٹھی کی پشت پر باورچی خانے کے ساتھ تھا۔ اس کی کھڑکیاں مرغیوں کے ڈربوں کی طرف کھلتی تھیں۔ کونے والی کھڑکی نے موتگرہ کلی کی بیل کا گھونگھٹ کاڑھ رکھا تھا اور اس کے سائے میں سکون اور مدھم خنکی تھی۔ رات آرام کرنے کے بعد صبح سویرے باہر ڈربوں میں مرغے نے سینہ پھلا کر اذان دی تو مسافر کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی صرف پانچ ہی بجے تھے۔ مسافر نے تکیے کے نیچے سر گھسیڑ کر پھر نیند کی دیوی سے ہم آغوش ہونا چاہا مگر مرغ بار بار کڑکڑا رہا تھا۔ چار و ناچار اٹھا اور سگریٹ سلگا کر کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔ بھورے بھورے بادلوں کی چادر میں صبح کا پھیکا پھیکا اجالا پھیل رہا تھا اور تازہ ہوا میں موتگرہ کلی کی پتیاں ہل رہی تھیں۔ کوئی جھینگر لمبی گھاس میں کہیں چھپا بول رہا تھا اور تاڑ اور دریان کے چھریرے درخت چپ چاپ کھڑے صبح کے نور کو بیدار ہوتے دیکھ رہے تھے۔ کیلے کے قرمزی پود اور گھاس کے خوشے شبنم کی دھند میں زرد ہو رہے تھے۔ ڈربے کے اندر مرغ باری باری نازک اندام مرغیوں کو دبوچ رہا تھا اور وہ شور مچا رہی تھیں۔ باورچی خانے میں برتنوں کے الٹنے پلٹنے کی آوازیں آ رہی تھی۔ مسافر نے سگریٹ باہر پھینکا۔ بازو کھول کر بھرپور انگڑائی لی اور بھاگ کر بستر میں گھس گیا۔ عین اس وقت دروازہ کھلا اور ملازم لڑکا چائے لے آیا۔ اب تو اٹھنا ہی پڑے گا۔ مسافر نے سوچا اور وہ تیری گھڑی کو لا گا چور مسافر جاگ ذرا' گنگناتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئے اٹھ بیٹھا

جب دن چڑھ آیا تو مسافر پیکو میں زرعی اور صنعتی ترقیات کا جائزہ لینے نکل پڑا۔ وہاں کی سب سے بڑی صنعت چنے ''سگار'' تھے جو ڈیڑھ فٹ لمبے ہوتے اور جنہیں عورتیں دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیتی تھیں۔ دوسری شے بانس کے کھوکھلے گیند تھے۔ بری لڑکے ان سے بازار کے عین بیچ میں کھیلا کرتے اور خوشی خوشی موٹر یا چھکڑے کے نیچے آ کر مر جاتے تھے۔ مسافر کو زرعی ترقیات کا جائزہ لینے کی ہمت نہ ہوئی اس نے ایک بک سٹال سے پیکو پر ایک نیم سرکاری کتابچہ خریدا اور گھر بیٹھ کر ریڈیو مضامین کے لیے اس میں سے نوٹ لینے لگا۔

حاجی علم دین کھوکھر کی صرف ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام روجی تھا۔ روجی بڑی بے روح لڑکی تھی۔ جس کا علم مسافر کو بعد میں ہوا۔ اس کی عمر اٹھائیس سال کے قریب تھی اور ابھی تک کنواری تھی۔ مسافر نے سوچا رومانس لڑانے کا نادر موقع ہے۔ حاجی صاحب پابند صوم وصلوٰۃ تھے اور ان کی موٹی بیوی بوڑھے ڈرائیور سے بھی پردہ کرتی تھی۔ تاہم ایک روز مسافر نے روجی کو دیکھ لیا اور وہ افسوس کرنے لگا کہ اس نے اسے کیوں دیکھا۔

روجی باورچی خانے میں چولہے کے سامنے کھڑی تیل میں پکوڑے تل رہی تھی اور مسافر دروازے کے ساتھ لگا اسے دیکھ رہا تھا۔ روجی بار بار ناک چڑھا رہی تھی اور پکوڑوں سے اس قسم کی باتیں کر رہی تھی۔

''آخر بچ کر کہاں جاؤ گے؟ لاکھ روؤ۔ پیٹو' تمہیں تو میں چٹنی بنا کر کھا جاؤں گی۔۔۔۔۔۔۔ ہوں' ہوں۔۔۔۔۔۔۔ پکوڑوں کی چٹنی' چٹنی کے پکوڑے' کھا جاؤں گی۔۔۔۔۔۔۔ کھا جاؤں گی''

مسافر سہم گیا۔ لیکن جلدی ہی اس نے محسوس کیا کہ روجی کا جسم گداز تھا اور سینے پر دوپٹہ یوں آگے کو ابھرا ہوا تھا گویا اس نے قمیص کے اندر خربوزے چھپا رکھے ہوں۔

۔۔۔۔۔۔۔ ہائے گوجرانوالہ کے خربوزے! مسافر کو پنجاب' اپنا وطن یاد آ گیا' اور اس کا جی چاہا کہ وہ خربوزوں کو چھلکوں سمیت کھا جائے۔ وہ دوسری طرف سے باورچی خانے میں داخل ہوا اور کھا جاؤں گا' کھا جاؤں گا کہتے ہوئے اس نے تھالی میں سے گرم گرم پکوڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔

''نمک ذرا تیز ہے'' اس نے بڑی مشکل سے منہ کھول کر کہا۔

روجی نے پہلے تو سر ڈھانپا۔ پھر پکوڑوں والی تھالی اٹھائی اور آخری بار ناک چڑھاتے ہوئے باہر نکل گئی اور مسافر کو معلوم ہوا کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روحی کی ناک اس پکوڑے سے بالکل ملتی جلتی تھی جو اس نے کھایا تھا۔ دوسرے روز وہ کھڑا مرغیوں کو ہیر وارث شاہ کا وہ حصہ سنا رہا تھا جہاں ''گفتگو کردن رانجھا بانیکہ'' لکھا ہے کہ روحی پیالی میں گوندھا ہوا آٹا لیے آئی اور اس کی گولیاں بنا کر مرغیوں کو ڈالنے لگی۔ مسافر نے ادھر ادھر دیکھا پھر گلا صاف کر کے بولا:

''آپ کی مرغیاں مجھ سے پردہ کیوں کرتی ہیں؟''

روحی نے بھی پہلے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ناک صاف کر کے بولی:

آپ کو تو ذرا شرم نہیں آتی' کل اگر کوئی ہمیں وہاں دیکھ لیتا تو پھر کیا ہوتا۔''

مسافر جلدی سے بولا:

''تو پھر میں تمہیں کہاں ملا کروں روحی؟''

روحی پرے ہٹ گئی۔ مسافر نے دیکھا کہ روحی کی مونچھیں بھی تھیں اور اس کی گردن پر جلی ہوئی کھال کا لمبا سا داغ تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد ہمت شکن حقائق کا انکشاف ہو رہا تھا۔ لیکن مسافر ثابت قدمی سے اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ کیونکہ اسے گوجرانوالے کے خربوزے بے حد پسند تھے۔

روحی کے ہونٹ رس گلوں کی طرح موٹے اور پھولے ہوئے تھے۔

''روحی میں کیا کروں مجھے دل پر اختیار نہیں رہا۔ وہ یوں درد کر رہا ہے گویا اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو''

روحی ہنس پڑی۔

مسافر سمجھا' وہ رونے لگی ہے۔

''روحی رو ؤ مت' حوصلہ کرو۔۔۔۔۔۔۔نہیں تو میں بھی رو پڑوں گا۔''

روحی کے پھیلے ہوئے نتھنے پھڑکنے لگے اور وہ غصے میں زمین پر پاؤں مار کر وہاں سے چلی گئی۔

کچھ روز بعد روحی مسافر کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی اور وہ خربوزے کھا رہا تھا۔

''روحی۔۔۔۔۔۔۔روحی۔۔۔۔۔۔۔میرے سپنوں کی رانی۔''

روحی کو جیسے بھڑ نے کاٹ کھایا۔ وہ چہک کر بولی:

''ہائے میں مر گئی۔ یہ گانا تو شاہ جہاں میں تھا۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ہائے میں مر گیا۔تم بھی تو شا ہے جہاں ہو روحی''

روحی ہنسنے لگی اور اس کے ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے دانت نمودار ہو گئے۔

''وہ کیسے' وہ تو آدمی تھا۔''

مسافر نے اس کی مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا:

''تم بھی آدمی ہو روحی''

چلو ہٹو' تم زیادہ مذاق نہ کیا کرو''

''روحی حج کرنے کب جا رہی ہو؟''

''اگلے سال بھایا جی کے ساتھ قرآن ختم کر کے جاؤں گی''

''ابھی کون سے پارے پر ہو؟''

''ابھی تو گیارھویں پارے پر ہوں۔''

روحی سورہ یٰسین سناؤ''

''اللہ رحم کرے' سورہ یٰسین سنیں تمہارے دشمن' مسافر نے ایک رس گلہ بڑی تکلیف سے نگلتے ہوئے کہا۔

''روحی تم نانا فرنویس کی لڑکی ہو' تم شاہ پفنا توس کی پھوپھی ہو۔ روحی نے بھینس کی طرح پوری آنکھیں کھول دیں۔

''زبان سنبھال کر بات کرو۔۔۔۔۔۔۔۔کون تھے یہ لوگ؟''

''تمہارے رشتے دار۔۔۔۔۔۔۔۔روحی عقل موٹی ہوتی ہے یا خربوزے؟''

روحی جلدی سے بولی۔

''خربوزے''

مسافر نے سر پکڑ لیا۔

''روحی تم کھوکھر ہو۔۔۔۔۔۔۔۔بلکہ کھوکھا ہو۔۔۔۔۔۔۔۔محض کھوکھا۔''

روحی گردن اٹھا کر بولی:

''اس میں کیا شک ہے۔ میں کھوکھر ہوں اور ہماری ذات کے لوگوں کا کاروبار تو سنگاپور تک پھیلا ہوا ہے اور چک نمبر 92 الف

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے تو کھوکھروں کی بستی ہے۔''

''روحی تم میری روح قبض کر رہی ہو' تم روح قبض ہو' پیش قبض ہو' محض قبض ہو۔'' مسافر کمرے کے باہر اٹھ بھاگا۔ روحی کچھ دیر حیرت کے عالم میں وہاں بیٹھی رہی پھر وہ بھی اٹھی اور باورچی خانے کی طرف نکل گئی' لیکن اس کے بعد وہ مسافر کے کمرہ میں کبھی نہ آئی۔ حاجی علم دین کھوکھر نے بنگلہ نمبر 3 اے کا آدھا حصہ کرائے پر دے رکھا تھا۔

مشرقی حصے میں وہ اپنے کنبے سمیت رہتا تھا اور مغربی حصہ اس یورپین عورت کی تحویل میں تھا۔ جس کے ڈرائنگ روم میں مسافر نے کچھ وقت گزارا تھا۔ جب صبح ہوتی تو حاجی صاحب مشرقی حصے میں اللہ ہو کا ورد شروع کر دیتے۔ روحی بھونڈی اور اونچی آواز میں قرآن شریف کی تلاوت کرنے لگتی اور مغربی حصے میں پیانوں کے مدہم اور خوابگوں سر جاگ اٹھتے۔ مسافر کی آنکھ کھل جاتی۔

بستر میں لیٹے لیٹے اسے ہر بار یہی محسوس ہوتا کہ دو آدمی اس کے سرہانے بیٹھے ہیں جن میں سے ایک اس کا ہاتھ بہت محبت سے سہلا رہا ہے اور دوسرا اس کی کھوپڑی کا طبلہ بجا رہا ہے۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ یا تو حاجی علم دین کا گلا گھونٹ دے اور یا پیانو کے اوپر چڑھ کر کودنا شروع کر دے اور اس وقت نیچے اترے جب چھوٹے سے چھوٹے سر کا بھی کچومر نکل گیا ہو۔ مسافر کو پورا یقین تھا کہ پیانوں وہی دبلی پتلی سی عورت بجاتی ہے کیونکہ ان کے گھر میں سوائے ماں بیٹی کے اور کوئی شخص نہ رہتا تھا۔ وہ عورت بھی بہت کم باہر نکلتی۔ اس کی سرخ بالوں والی لڑکی دن بھر باغ میں لکڑی کے گھوڑے اور ہوائی جہازوں سے کھیلتی رہتی تھی۔ مسافر نے کئی بار بچی سے گھلنے کی کوشش کی لیکن وہ اس قدر شرمیلی تھی کہ ایک اجنبی کو اپنے قریب پا کر جلد ہی گھبرا جاتی اور یا تو سر جھکائے اپنے کھیل میں مگن رہتی اور یا پھر لکڑی کا گھوڑا اور ہوائی جہاز اٹھا کر اندر چلی جاتی۔ اس کی نیم سبز آنکھوں والی ماں بھی شاید اندر لکڑی کے گھوڑوں سے کھیلتی رہتی تھی۔ پھر وہ اکیلی اندر بیٹھی کیا کرتی رہتی تھی؟''

مسافر نے پیکو کی زرعی اور صنعتی ترقیات پر اپنے فیچر تقریباً مکمل کر لیے تھے اور اب اسے وائٹ ہارس کے سگریٹ پینے اور پیکو کے گھٹیا قسم کے ہوٹلوں میں بیٹھ کر میلی کیلی چائے پینے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔ ہوٹلوں سے وہ جلد بیزار ہو گیا۔ کیونکہ ہوٹل والے اپنے گاہکوں سے جلد بیزار ہو جاتے تھے۔ کافی یا چائے کا پیالہ ختم ہوتے ہی ملازم لڑکا سر پر آن کھڑا ہوتا۔

''اور کیا چاہیے جناب؟

پیکو کی وہ سڑکیں جو شہر سے باہر باغوں کی طرف نکل گئی تھیں۔ کافی خوبصورت تھیں اور ان پر آم' دریان' ناریل اور بانس کے درخت جھکے ہوئے تھے۔ تاہم ان پر سیر گشت پریشان کن تھی۔ کیونکہ وہاں موسم کا کوئی اعتبار نہ تھا اردو اخبارات کی پالیسی کی طرح۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ اگر پل میں کچھ تھا تو گھڑی میں کچھ اور ہو جاتا تھا۔ ابھی حبس ہو رہا ہے تو ابھی چھپر پھاڑ کر مینہ برسنے لگا ہے۔ وہاں ہر آدمی کندھے پر چھتری لٹکا کر گھر سے نکلتا تھا اور مسافر کے پاس نہ چھتری تھی اور برساتی۔ کچھ روز سڑکوں پر سر سے لے کر پاؤں تک بھیگنے اور آوارہ گردی کرنے کے بعد مسافر اکتا گیا۔ وہ دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا' لیٹا اپنی نیم سبز آنکھوں والی ہمسائی سے ربط پیدا کرنے کے متعلق سوچتا رہتا۔ وہ اپنی باقی ماندہ چھٹیوں میں رنگ بھرنا چاہتا تھا اور روحی محض کھوکھا ثابت ہوئی تھی۔

کوٹھیوں کے عقبی حصے عام طور پر کباڑ خانہ بنے ہوتے ہیں۔ لیکن بنگلہ نمبر ۱۳ اے کے پچھواڑے بھی چھوٹا سا باغیچہ تھا جہاں ترناری اور شبو کے پھول عجیب بہار دیا کرتے تھے۔ سامنے پشت والی دیوار کے ساتھ کیلے کے ہرے بھرے ستون کھڑے تھے جن کے چوڑے چوڑے پتوں میں قرمزی رنگ کے جھومر لٹک رہے تھے۔ مسافر کے کمرے کا چھوٹا دروازہ اس نیم سبز آنکھوں والی عوت کے دروازے کی طرف کھلتا تھا۔ ان دونوں دروازوں کے درمیان بنگلے کا عقبی برآمدہ تھا' جس کے فرش پر ٹائیلوں کے سرخ پھول مدھم پڑ رہے تھے۔ ہر دروازے کے باہر ایک ایک چوڑی سی آرام دہ کرسی بچھی رہتی تھی۔ ایک روز شام کے وقت مسافر نے سگریٹ اٹھائے اور باہر برآمدے میں آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ ہوا بند تھی' بارش زور سے ہو رہی تھی۔ درختوں میں اندھیرا ہو رہا تھا' چھت اور مرغی کے ڈربوں کے ٹین پر گرتی بارش کا شور گونج رہا تھا اور مسافر کو یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی ریلوے انجن قریب سٹیم کھولے کھڑا ہو۔ جب مسافر کئی سگریٹ پھونک چکا تو بارش تھم گئی اور ایک دم خاموشی کے شامیانے سے تن گئے۔ مسافر یونہی سامنے کیلے کے درختوں کو تک رہا تھا۔ چھت پر سے رکا ہوا پانی ٹپ ٹپ نیچے گر رہا تھا کہ کسی نے دوسری آرام کرسی کو ذرا آگے گھسیٹا اور پھر اس پر بیٹھ گیا' مسافر پہلے تو چپکا ہو رہا پھر اس نے آہستہ سے گردن گھما کر دیکھا کہ اس کی ہمسائی۔۔۔۔۔۔۔ نیک سبز آنکھوں' زرد چہرے اور بھورے بالوں والی دبلی پتلی عورت آرام کرسی میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں بازو کرسی کے چوڑے بازوؤں پر تھکے ہارے مزدوروں کی طرح آرام کر رہے تھے اور ایک پاؤں دوسرے پاؤں کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا اور رات کے اولین مرطوب سائے برآمدے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مسافر کو اس عورت کا ہلکا سا خاکہ ہی نظر آ رہا تھا۔ معاً باورچی خانے میں کسی نے تڑکا لگایا اور مسافر کو پہلے پکوڑوں اور پھر روحی کا خیال آ گیا۔ اس کے بعد پھر خاموشی۔۔۔۔۔۔۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ رنگون شہر میں بلکہ کسی بھی شہر میں مسافر کو اس گہری' عظیم اور بیکراں خاموشی کا کبھی احساس نہ ہوا تھا' وہاں تمام رات سڑکوں پر موٹریں چھکڑے اور گھوڑا گاڑیاں دوڑتی رہتی تھیں اور یہاں سر شام آوازوں کے لنگر سمندر کے ڈونگے پانیوں میں اتر گئے تھے۔ ناریل اور تاڑ کے درخت ان عظیم پیغمبروں کی اوپر اٹھتی ہوئی مقدس انگلیاں تھیں جنھوں نے انسانوں کو اس ازلی و ابدی اکائی کا یقین دلایا جو

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کائنات کی ہر دہائی کا ناگزیر جزو ہے۔ درخت ہمیں دوستی اور خودداری کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اگتے ہیں لیکن ایک دوسرے کے سائے میں نہیں اگتے۔ ہمدرد' پر قار' تنہا' خاموش۔۔۔۔۔۔۔ چھت پر سے کوئی رکا ہوا قطرہ نیچے گرتا تو محسوس ہوتا کسی نے پیانو کے پردے پر آہستہ سے انگلی رکھ دی ہے' مسافر نے سگریٹ سلگانا چاہا۔ لیکن وہ رک گیا۔ دیا سلائی رگڑنے کے شور سے ایک بڑی نازک اور لطیف شے چکنا چور ہو جائے گی۔ اس کے ہاتھ اپنی جگہ سے نہ ہل سکے گویا وہ کسی بت کے ہاتھ ہوں سنگین اور جامد۔۔۔۔۔۔ سکوت اور گہرا سکوت:

ایکا ایکی خاموشی کے اس سمندر میں کسی مچھلی نے اچھل کر غوطہ لگایا۔ مسافر کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے قریب ہی سے آہستہ سے ٹھنڈا سانس بھرا ہو۔ اس کے بدن میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ اب تنہائی زیادہ شدید ہو گئی تھی فضا میں چپ چاپ اندھیروں کے بھنورے سے لپکنے لگے تھے مسافر نے بڑی احتیاط سے گردن گھمائی

دوسری آرام کرسی خالی پڑی تھی۔

اگلی شام پھر اس نے سگریٹ اٹھائے اور برآمدے میں آ گیا' وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا لیکن وہ عورت باہر نہ آئی۔ جب اندھیرا زیادہ گہرا ہو چلا تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دوسری شام برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز وہ ساتھ والے کمروں سے نکلتی ہوئی پیانو کی موسیقی سنتا رہا۔ کوئی بڑے سکون سے پیانو بجا رہا تھا۔ کسی وقت کوئی سر چھوٹی مچھلی کی مانند تڑپ کر پیانو سے باہر نکل پڑتا اور ساتھ ہی دوسرا بوجھل سر یوں اٹھتا گویا گہری نیند سے بیدار ہو رہا ہو۔ یہ سر کاہل بھی تھے اور ان میں سیماب ایسی تڑپ بھی تھی۔ مسافر کو ان سروں میں کوئی ربط اور آہنگ محسوس نہ ہوا پھر بھی وہ کھڑکی کے پردوں کے عقب میں سے کھلے ہوئے بازوؤں کی طرح اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بڑی بے ربطگی سے موسیقی اچانک رک گئی۔ کچھ دیر بعد کوئی شخص مختصر اور متوازن قدم اٹھائے سامنے والے کمرے سے باہر نکلا اور آرام کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ مسافر نے ایک نازک اور نیم گرم جسم کی حرارت محسوس کی اور وہ گفتگو چھیڑنے کے لیے کوئی موضوع ڈھونڈنے لگا اس کے ذہن میں کئی ایک انگریزی اور فرانسیسی ناولوں کے وہ جملے پھر گئے جو ہیرو اور ہیروئن کی گہری دوستی کا باعث بنے۔ لیکن اس کے منہ سے صرف یہی نکل سکا:

''آج پھر گرمی ہے'' اسے اپنی آواز پر کسی دوسرے کی آواز کا دھوکا ہوا۔ لمحہ بھر خاموشی طاری رہی۔ پھر وہی پہلے روز والی نرم اور دھیمی سی آواز سنائی دی۔

''ہاں آج گرمی ہے''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسافر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے اس کا پیش کیا ہوا سگریٹ اسے واپس کر دیا گیا ہو۔ اس نے وائٹ ہارس کا کش لگایا اور اپنے لہجے میں کئی وائٹ ہارس پاور پیدا کر کے بولا۔

''شاید رات بارش ہو''

''شاید''

پھر وہی خاموشی اور تنہائی۔۔۔۔۔۔۔ اے دل تو بھی خوش ہو جا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن نہیں خوشی گناہ ہے تھوڑا سا توقف کرنے کے بعد وہ پھر بولا:

''آپ پیانو کافی اچھا بجالیتی ہیں''

''معمولی''

مسافر نے سوچا۔ اس لفظ سے ہر بات واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی میرے لیے یہ معمولی بات ہے اور مجھے تمہاری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر مسافر وہاں دلچسپی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ پیکو پر اپنے تمام فیچر مکمل کر چکا تھا اور ابھی آدھی چھٹیاں باقی پڑی تھیں اور روحی محض پکوڑے اور خربوزے پیش کر سکتی تھی۔ مسافر نے باتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا:

''مجھے مغربی موسیقی کا بالکل علم نہیں' لیکن اور اصناف کی نسبت مجھے کلاسیکل موسیقی زیادہ پسند ہے۔ اس کی وجہ محض سر اور لے ہے جو ہمارے جذبات کے اظہار کا بڑا سیدھا سادا ذریعہ ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

''شاید''

مسافر نے سگریٹ سامنے گھاس پر پھینک دیا۔

''اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھیے''

''کیا آپ انجیل کی تفسیر لکھ رہی ہیں؟''

''کیوں؟''

''تو پھر آپ اندر کیوں بند رہتی ہیں؟''

عورت ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی اور مسافر کو یوں محسوس ہوا گویا تپائی پر رکھا ہوا چاندی کا راکھ دان فرش پر گر پڑا ہو۔ اگر مسافر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کے قریب ہوتا تو وہ اس کے خوبصورت دانت چمکتے دیکھ سکتا تھا۔

''مجھے تنہائی بھلی لگتی ہے''

''آپ کی بچی بھی کم آمیز ہے''

''ہاں۔۔۔۔۔۔ایلس شرمیلی ہے''

''ایلس۔۔۔۔۔۔خوبصورت نام ہے اس کی والدہ کا نام تو اس سے بھی اچھا ہوگا۔''

''او نہیں۔۔۔۔۔۔میرا نام محض کرسٹین ہے''

''کرسٹین! یہ آپ کا نہیں بلکہ پیانو کے کسی سر کا نام معلوم ہوتا ہے۔ غالباً آپ فرانس میں پیدا ہوئی تھیں''

وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے یوں پہلو بدلا گویا زیادہ گفتگو نے اسے پریشان کر دیا ہو۔ چند لمحے چپ رہنے کے بعد وہ نہایت مدھم لہجے میں بولی:

''جی ہاں۔۔۔۔۔۔لیکن میری ماں ہالینڈ کی رہنے والی تھی''

''برما آپ کو پسند ہے؟''

''اس میں پسند کی کیا بات ہے۔ دنیا کی ہر جگہ تھوڑی بہت خوبصورتی چھپائے رکھتی ہے۔''

اس کے بعد اس نے بڑی ملائمت سے شب بخیر کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مسافر دیر تک وہاں اکیلا بیٹھا کرسٹین کے ان مختصر الفاظ کو ذہن میں دہراتا رہا جو اس نے اپنی نرم و نازک آواز کی طشتری میں رکھ کر مسافر کے دل تک پہنچائے تھے۔

اب وہ ہر شام ملنے لگے۔ دن ڈوبتے ہی وہ دونوں برآمدے میں آجاتے اور آرام کرسیوں پر بیٹھے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک دوسرے سے ہمکلام رہتے۔ یہاں تک کہ اندھیرا گہرا ہونے لگتا۔ پھر وہ بڑی نرمی سے ایک دوسرے کو شب بخیر کہتے اور اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے۔ اس دوران میں کرسٹین کی مختصر گوئی میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور مسافر کو ہر ملاقات پر یہی گمان ہوتا کہ وہ اس سے پہلی مرتبہ مل رہا ہے۔ ایک شام مسافر سگریٹ لیے برآمدے میں آیا تو اس نے ایلس کو کرسی پر چپ چاپ بیٹھے دیکھا۔ ایلس کا چہرہ غمگین تھا اور اس کا لکڑی کا گھوڑا زمین پر الٹا پڑا تھا۔ مسافر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر دیا سلائی گھاس پر پھینکتے ہوئے پوچھا:

''ننھی ایلس غمگین کیوں ہے؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ کچھ نہ بولی۔

''آج بے چاری ایلس کا گھوڑا بیمار ہے۔''

ایلس روکھی آواز میں بولی:

''آج میری امی بیمار ہے جناب!''

مسافر ٹھٹھک گیا۔۔۔۔۔۔کرسٹین بیمار ہے؟ جب ہی دو روز سے وہ غائب تھی۔ لیکن وہ سوگوار روح کیوں بیمار ہے؟ مسافر ایلس کے پاس کرسی کے بازو پر بیٹھ گیا اور بڑی محبت سے اس کے سرخ بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''ایلس تمہاری امی کہاں ہے''

''اپنے کمرے میں' میرے نانا جان بھی وہیں ہیں''

''ایلس اپنی امی سے کہو میں انہیں ملنا چاہتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد مسافر کرسٹین کی خوابگاہ میں تھا۔

کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ دیواروں کا رنگ ہلکا زرد تھا اور کئی ایک جگہ آئل پینٹنگز سلیقے سے آویزاں تھیں۔ کرسٹین ایک بڑے سے پلنگ پر بستر میں لیٹی تھی۔ انگوری رنگ کا کمبل اس کے جسم کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ قریب ہی کرسی پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے ننگے سر پر کالے اور سفید بالوں کا جنگل سا اگا تھا۔ گھنی ڈاڑھی میں بھی سفید بالوں کی کثرت تھی۔ بوڑھی آنکھوں پر بھنوؤں کا ایک چھجا جھکا ہوا تھا۔ وہ اڑے ہوئے نسواری رنگ کے ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں ملبوس تھا اور یوں آگے کو جھکا بیٹھا تھا جیسے کوئی راز کی بات سنا رہا ہو۔ کرسٹین نے پژمردہ سے تبسم کے ساتھ مسافر کو دیکھا اس کا چہرہ ایک دم کملا گیا تھا اور آنکھیں ڈوب سی گئی تھیں۔ کمرے میں ڈیٹول کی ہلکی ہلکی بو تیر رہی تھی۔ کرسٹین نے مسافر کو اپنے نانا سے متعارف کرایا اور افسردگی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

مسافر نے دیکھا کرسٹین کی آنکھوں کے سبز جنگلوں میں شام ہو رہی تھی۔

''کاش میں ڈاکٹر ہوتا''

بوڑھا بھدی اور سپاٹ آواز میں بولا:

''ڈاکٹر ابھی گیا ہے۔ کرسٹی صبح تک اچھی ہو جائے گی''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرسٹین نے آنکھیں بند کر لیں۔ نیم سبز آنکھوں پلکوں کی چھاؤں میں آرام کرنے لگیں اور ویران جنگلوں کی تنہائی غم کی دھند میں تحلیل ہونے لگی۔ بوڑھا گھٹنوں پر ہتھیلیاں ٹکا کر آہستہ آہستہ سے اٹھا اور مسافر کے ساتھ باہر گیا۔

برآمدے میں پہنچ کر وہ بیٹھ گیا۔ مسافر نے سگریٹ نکالے

شکریہ۔۔۔۔۔۔۔ میں پائپ پیتا ہوں۔"

بوڑھے نے ڈھیلی صدری کی جیب میں سے سیاہ رنگ کا بھدا سا پائپ نکالا اور چرمی تھیلی میں سے سیلا تمبا کو اس میں بھرنے لگا۔

"خدا میری بچی کو صحت دے۔ وہ زیادہ سکھی نہیں"

پائپ سلگاتے وقت اس کے گہرے بادامی چہرے کی لکیریں چمک اٹھیں۔ دیا سلائی بجھتے ہی برآمدے میں اندھیرا گہرا ہو گیا اور فضا میں تمباکو کی لطیف سی مہک پھیل گئی۔ بوڑھا آرام کرسی پر اچھی طرح پھیلتے ہوئے بولا

"پیگو میں کرسٹی عموماً بیمار رہتی ہے حالانکہ یہ جگہ اس نے اپنے لیے منتخب کی تھی"

"برسات میں یہاں ملیریا عام ہو جاتا ہے"

"خدا اسے آرام دے میں روز روز یہاں نہیں آسکتا۔ یہ تو اتفاق سے کل یہاں پہنچا تو وہ بستر میں پڑی تھی۔"

"آپ غالباً رنگون میں ہوتے ہیں"

"دراصل میرا کاروبار وہیں ہے۔ لیکن سال کا بیشتر حصہ مجھے رنگون سے باہر گزارنا پڑتا ہے"

"آپ تو دیر سے یہاں رہ رہے ہوں گے"

بوڑھا پائپ کی ڈنڈی سے سر کھجاتے ہوئے گردن ٹیڑھی کر کے بولا:

"میرے بچے میں پندرہ سال سے اس دیس میں ہوں۔"

"کیا آپ کو اپنا وطن یاد نہیں آتا؟"

بوڑھے کی بھنویں جھک گئیں۔ وہ انگوٹھے سے تمبا کو دبانے لگا۔

"وطن؟ فرانس کو نہیں بھولا۔ کوئی فرانسیسی اسے نہیں بھول سکتا۔ تاہم اب برما ہی میرا وطن ہے اور پھر کاروبار میں گم ہو کر آدمی ان جھمیلوں سے باہر نکل آتا ہے۔"

مسافر نے سوچا۔ پیگو کی وہ شام پیرس کی باتیں کرتے ہی بسر ہو۔ سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے اس نے پوچھا:

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''کیا یہ درست ہے کہ فرانس میں مصور اس زمرے میں شامل نہیں ہے۔ ذرا سوچو رمبراں کے ساتھ کئی اور مصور مفلسی اور تنگدستی کا مقابلہ کر رہے تھے لیکن شہرت صرف رمبراں ہی کو نصیب ہوئی۔''

''کیا دوسرے لوگ واقعی اس بدنصیبی اور محرومی کے مستحق تھے؟''

''یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں ممکن ہے وہ بڑے مصور ہوں۔ ان کے آرٹ میں پختگی اور سچائی کی کمی ہو۔ ممکن ہے ان میں وثیقہ نویس بننے کی صلاحیت ہو اور انہوں نے اپنے تئیں غلط سمجھا ہو اگر رمبراں جینئس تھا اور اپنی صلاحیتوں کے بہترین استعمال سے واقف تھا تو پھر اسے میری یا تمہاری رائے زنی کی کیا پروا؟ دشمن کے مورچے کی طرف بڑھنے والا سپاہی راہ میں پڑی ہوئی لاشوں پر آنسو نہیں بہائے گا اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اسے گورکنی کا پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس میں سپاہی بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ لیکن آزاد ملک اپنے فنکاروں کی پرورش کرتے ہیں۔''

''کون کہتا ہے فرانس آزاد ملک ہے؟ آزادی سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ کئی اور چیزوں کی طرح آجکل آزادی کا معیار بھی بدل چکا ہے۔ دنیا میں صرف دو ایک ملک ہی آزاد ہیں باقی سب شطرنج کے مہرے ہیں۔ جن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں اور جو شاطر کی مرضی کے پابند ہیں اور پھر فنکار کبھی حکومتوں کا ساتھ نہیں دیا کرتے۔ اس لیے کہ حکومتیں ہمیشہ دھوکہ دیتی ہیں۔ ان کی بنیاد وہی فریب کاری پر استوار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فنکار عموماً تنہا رہتے ہیں اور تنہا مر جاتے ہیں۔ حکومتیں سیاسی جوڑ توڑ کا نتیجہ ہوتی ہیں اور فنکار سچائی اور کائناتی خلوص کا نقیب ہوتا ہے کل کے سیاست دان آج کے وزیر آنے والی کل کے سیاستدان ہوں گے۔ یہ لوگ اپنے ملک کے باشندوں کو اسی طرح جانتے ہیں جس طرح ٹڈیاں گندم کے خوشوں کو۔۔۔۔۔۔۔ جب خوشوں کی جیب گندم سے بھر جاتی ہے تو وہ شور مچاتی ہوئی آتی ہیں اور آن کی آن میں انہیں چٹ کر جاتی ہیں۔ لیکن تم نے شہد کی مکھیوں کو بھی دیکھا ہوگا جو دور دور سے رنگ اور مٹھاس لا کر اپنے چھتوں میں محض اس لیے جمع کرتی ہیں کہ لوگ ان کی شبانہ روز محنت کو آپس میں بانٹ لیں۔ فنکار شہد کی مکھیاں ہی تو ہیں۔ ان کی دیکھ بھال ہو یا نہ ہو وہ اپنے کام سے کبھی غافل نہیں بیٹھتے۔''

''میرے بیٹے! حکومت خواص کی ہو یا عوام کی۔۔۔۔۔۔۔ حکومت کرنے والا گروہ ہمیشہ ان دونوں طبقوں سے بلند رہتا ہے اور اس کی سیاست ٹڈی دل کی سیاست ہوتی ہے۔ ٹڈی اور شہد کی مکھی میں دوستانہ محال ہے۔ یہ افتادِ طبع کا معاملہ ہے۔''

''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ فرانس آرٹسٹوں کی ماں ہے۔''

بوڑھا طنزاً ہنسا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ماں نہیں داشتہ پڑھا ہوگا۔۔۔۔۔۔۔بہر حال یہ اچھا جملہ ہے۔اسے تم اپنی ڈائری میں نقل کر سکتے ہو۔یورپ کو اگر تم بڑا ہوٹل سمجھو تو فرانس اس ہوٹل کی مشترکہ نشست گاہ ہے جہاں فرصت کے سمے ہر قماش کا آدمی کچھ دیر بیٹھ کر اپنے مستقبل پر غور کرتا ہے۔''

''مگر میرے خیال میں ہیوگو کے بعد فرانس کا ذہن پھر بیدار ہو رہا ہے۔''

''میرے بیٹے ایک بات پلے سے باندھ لو۔جب خیال پر اظہار خیال کو ترجیح دی جائے تو گالیاں بھی مزہ دے جاتی ہیں۔فرانس کا ذہن آج کل یہی مزے لے رہا ہے۔''

بوڑھا خاموش ہو گیا وہ بھنویں سکیٹر کر پائپ کے کش لینے لگا' مسافر سگریٹ ختم کر چکا تھا اور اندھیرے میں اسے پائپ میں سلگتی ہوئی آگ کی مدھم سی چمک دکھائی دے رہی تھی۔بوڑھا آہستہ سے اٹھا۔مسافر کو شب بخیر کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ روز بعد آسمان تھوڑی دیر کے لیے کھلا اور کوٹھیوں کی ڈھلوان سرخ چھتوں پر سنہری دھوپ چمکنے لگی۔خوش رنگ کلیاں رتنا کلی کی بیلوں میں چمکنے لگیں۔بھیگے ہوئے پیڑ پودے نیم گرم دھوپ میں گویا پرسکون سانس لینے لگے۔باغ کے لمبے گھاس میں ہرے ہرے ٹڈے پھدکنے لگے تھے اور شبو کے دودھیا پھول سورج کی طرف منہ اٹھائے مسکرا رہے تھے۔کرسٹین کا بوڑھا باپ پائپ منہ میں دبائے پورٹیکو میں بڑھے گھاس کو قینچی سے کاٹ رہا تھا۔اس کے بازو کہنیوں تک ننگے تھے اور تھیلا سی پتلون کے فیتے ڈھیلے ہو رہے تھے۔حاجی علم دین کھوکھر اپنے کمرے سے تہمد سنبھالتا ہوا باہر نکلا اور بوڑھے کو گھاس کاٹتے دیکھ کر بولا:

''بھائیا جی گھاس کھو در ہے ہیں واوا۔''

بوڑھا پنجابی زبان سے ناواقف تھا پھر بھی ہنسنے لگا۔مسافر کرسٹین کے لیے رتنا کلی اور شبو کے پھول چن رہا تھا۔جب حاجی صاحب بنگلے سے باہر نکل گئے تو بوڑھے نے پوچھا:

''مسٹر کھوکھا کیا کہہ رہے تھے؟''

اور جب مسافر نے مسٹر کھوکھا کے جملے کا ترجمہ سنایا تو بوڑھا ہنستے ہوئے بولا:

''مسٹر کھوکھا معقول آدمی ہے اور امیر بھی۔۔۔۔۔۔کیا تضاد ہے''

جب گھاس کی کتر بیونت ہو چکی تو بوڑھا پسینہ پونچھتا ہوا سیدھا کھڑا ہو گیا۔قینچی ایک طرف رکھی۔برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھا اور تھیلی میں سے تمباکو نکال کر ہتھیلی پر ملنے لگا۔مسافر قریب ہی پودوں پر جھکا ہوا تھا۔

''برما پھولوں کی بستی ہے'' بوڑھا چہک کر بولا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسافر لمبے ڈنٹھل والا پھول توڑتے ہوئے زیر لب مسکرایا۔

''ہاں۔۔۔۔۔۔۔لیکن بعض لوگ ان پھولوں میں پیٹرول کی بو سونگھتے ہیں۔''

''ان کا مذاق طبعی درست نہیں۔''

''درست نہ سہی مگر کامیاب ضرور ہے۔ ان لوگوں کو ان پھولوں کی خوشبو ہزار میلوں سے یہاں کھینچ لائی ہے۔''

''ہوسکتا ہے لیکن ایک فرانسیسی پھول کو پھول ہی کہے گا خواہ وہ پیٹرول کے تالاب میں تیر رہا ہو۔''

''اس میں کیا شک ہے۔ اہل فرانس بڑے باذوق ہوتے ہیں۔ انہوں نے کئی ایک ملکوں کو ذوق صحیح کی تعلیم دی ہے ان میں مراکو تیونس الجیریا اور فرنچ انڈو چائنا خاص طور قابل ذکر ہیں۔''

بوڑھا پائپ میں تمباکو کو بھرتے ہوئے زیر لب ہنسنے لگا۔

''تم بڑے چابک دست ہو۔ لیکن میرے بیٹے میں پھر کہوں گا تم نے اہل فرانس کا ذکر کرتے ہوئے ان لوگوں کے ذوق پر طعنہ زنی کی ہے جن کا فرانس۔۔۔۔۔۔۔میرا مطلب ہے وہاں کے سکول ماسٹروں' موچیوں طالب علموں' نانبائیوں' کلرکوں' لوہاروں۔ ہوٹل کے ادنیٰ ملازموں' ادیبوں' مصوروں' موسیقاروں' اور شراب کشید کرنے والوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ تم ٹڈی دل کی بات کر رہے ہو میں شہد کی مکھیوں کا ذکر کر رہا تھا۔ تم اگر فرانس کے حقیقی باشندوں سے ملو تو تمہیں محسوس ہوگا کہ تم انہیں دیر سے جانتے ہو۔ تم نے انہیں برما کے کھیتوں میں دھان بوتے اور سیلون کے چائے کے باغات میں کام کرتے دیکھا ہے' میری طرف دیکھو۔۔۔۔۔۔۔ہم دونوں میں کونسی شے غیر مشترک ہے؟ زبان۔۔۔۔۔۔۔اور برخوردار زبان اظہار جذبات کا ایک ذریعہ ہے اصل شے تو جذبات ہیں جو بعض مخصوص حالات میں ہزارہا میل کی دوری کے باوجود یکساں ہوتے ہیں۔ ہوسکتا تھا میں ہندوستان میں پیدا ہوتا اور تو فرانس میں جنم لیتا پھر ہم اور تم میں فرق ہی کیا ہوا؟ محض ایک اتفاق اور حادثے پر قوم پرستی کے قطب مینار کا سنگ بنیاد رکھنا کہاں کی بالغ نظری ہے۔ اور پھر یہ زمانہ قطب میناروں کا نہیں بلکہ ہوٹلوں کا ہے جہاں ہر خطہ ارض کا آدمی آرام کے ساتھ رات بسر کرسکتا ہے۔ میرا ایک بیٹا تھا جو فوج میں چلا گیا اور سیگاؤں میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ خدا اسے معاف کرے۔''

بوڑھا برآمدے کی سیڑھیوں سے اٹھا۔ قینچی سنبھالی اور پھر کام میں مشغول ہوتے ہوئے بولا:

''جنگ بری شے ہے لیکن بڑھی ہوئی گھاس کی کتر بیونت ضروری ہونی چاہیے۔''

شبو کے سفید پھولوں میں رتنا کلی کی سرخ کلیاں سجا کر مسافر کرشین کے کمرے کی طرف بڑھا تو اس نے دیکھا کہ روتی اپنے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دروازے میں تھی۔ مسافر قریب پہنچ کر رکا اور چہرے کو مغموم بناتے ہوئے بولا:

''روجی مجھے تم سے محبت ہے''

روجی چمک اٹھی

''چلو ہٹو باتیں بنانا بہت جانتے ہو۔ اس حرامزادی انگریزن کے لیے پھول چنتے ہو اور مجھے کبھی سوکھی گھاس میں بھی لا کر نہیں دی۔ میں بھائیا جی سے کہہ کر اسے یہاں سے نکال باہر کروں گی۔''

مسافر کو ایکا ایک محسوس ہوا کہ اس نے روجی سے بات کرنے کے لیے غلط موضوع اختیار کیا ہے۔

''روجی۔۔۔۔۔۔ گیارھواں پارہ ختم کیا یا نہیں؟''

روجی جلدی سے بولی:

''ابھی کہاں۔۔۔۔۔۔ گھر کے کام کام سے فرصت نہیں ملتی۔ اگر اس سال قرآن شریف ختم کیا تو بھائیاں جی مجھے حج پر ساتھ نہ لے جائیں گے۔''

مسافر نے شبو کے پھولوں میں کرسٹین کے بالوں کی خوشبو سونگھتے ہوئے کہا:

''اچھا روجی میں یہ پھول اس انگریزن کو دے آؤں تمہارے لیے ابھی گھاس کھود کر لاتا ہوں۔''

روجی کی موٹی ناک سرخ ہوگئی اور اس نے تڑاخ سے دروازہ بند کر دیا۔

کرسٹین اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی' اس کا سر آرام کرسی کی پشت سے لگا تھا اور باہر پھیلی ہوئی دھوپ کی چمک کمرے میں آ رہی تھی پردے چنے ہوئے تھے اور فضا میں تازگی اور بشاشت تھی۔ کرسٹین کے بھورے بال سفید تکیے پر پھیلے ہوئے تھے اور نیم سبز آنکھوں میں زندگی اور مسرت کی چمک تھی۔ زردی مائل چہرے پر تر و تازہ ہریاول کا صحت مند عکس جھلک رہا تھا۔ اس نے متبسم نگاہوں سے مسافر کو دیکھا اور بولی:

''ایلس بھی پھول لینے گئی ہے۔ یہ تو بڑے خوبصورت پھول ہیں۔''

مسافر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کرسٹین کے چہرے پر مسرت کی قندیلیں روشن دیکھیں کرسٹین نے گلدستہ ہاتھوں میں لے لیا اور اس کی آنکھوں کی جھیلوں پر سے بادلوں کے سائے سرک گئے۔

''اس ملک میں ہر پھول خوشبو دیتا ہے۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

''یہ دیوتاؤں اور دیوداسیوں کا ملک ہے۔ کرسٹین! یہاں رات کو شبنم کے ساتھ خوشبو کی پھوار برستی ہے اور پھولوں کے نازک ریشے اس خوشبو سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ ایسے پھول لندن میں ہیں اور نہ پیرس میں' جاپانی بھی پھولوں پر جان دیتے ہیں اور میرا خیال ہے وہ لوگ عنقریب اعلان جنگ کر دیں گے۔''

کرسٹین کی آنکھوں میں سائے گہرے ہو گئے وہ کھڑکی سے باہر دھوپ میں نہائے ہوئے ناریل کے نوکیلے پتوں کو تکنے لگی۔ اس کے منہ سے خود بخود نکل گیا:

''جنگ بڑی گھناؤنی شے ہے۔''

''ہاں۔۔۔۔۔۔خاص طور سے جب ناریل کے پتوں پر دھوپ سو رہی ہو اور رتناکلی کی بیلوں میں چڑیاں چہچہا رہی ہوں۔

کرسٹین نے ہلکی سی آہ بھری۔

''ہمارا ملک بھی جنگ میں دھکیل دیا گیا ہے۔ میں نہیں جانتی یہ لڑائی کس مقصد کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میری ماں ہالینڈ کی رہنے والی تھی۔ اس کی قبر فرانس میں ہے میرا بھائی سائگاؤں کے جنگلوں میں مارا گیا اور میں پیکو میں بیمار پڑی ہوئی ہوں۔

ہم کہاں کے باشندے ہیں؟ ہمارا وطن کہاں ہے؟ ہم کہاں سے چلے تھے اور کہاں آ گئے ہیں؟''

کرسٹین خاموش ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مسافر بھی چپ ہو گیا۔ یہ خاموشی کسی ویران جزیرے سے آئی تھی جس کے بے زبان بستر پر آوازیں معصوم بچوں کی طرح منہ کھولے چپ چاپ رواں تھی۔ نیم سبز گھاس میں سورج کی سنہری کرنیں آرام کر رہی تھیں اور جرمن طیارے مارسیلز پر بم برسا رہے تھے اور بے خانماں عورتوں اور خوفزدہ بچوں سے بھرے ہوئے جہاز نامعلوم مقامات کی طرف کوچ کر رہے تھے اور برلن کی پناہ گاہوں میں بوڑھے مرد' بوڑھی عورتیں' نوجوان مرد اور نوجوان عورتیں سہمی ہوئی دہشت زدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے اور امریکن طیارے شہر پر بمباری کر رہے تھے۔ کرسٹین کی آنکھیں بند تھیں اور اس کی انگلیوں پر رتناکلی اور شبو کے پھول اسے معصوم نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ مسافر سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر دیکھنے لگا۔ جھاڑ جھنکاڑ میں سے نکلا ہوا توپ کا دہانہ۔۔۔۔۔۔توپ کے منہ پر کسی چڑیا نے گھونسلا بنا رکھا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو دانہ دنکا کھلا رہی ہے۔ نیچے لکھا تھا۔ ''امن'' کرسٹین کو یہ تصویر بہت پسند تھی۔ پال نے یہ تصویر زندگی کے آخری دنوں میں بنائی تھی اپنی خراب صحت کے باوجود اس تصویر پر پورا ایک مہینہ کام کرتا رہا تھا۔ کافی کی تلخ پیالی کے ساتھ روٹی کا ایک ٹکڑا کھانے کے بعد وہ سٹینڈ کے سامنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سٹول پر بیٹھا گھنٹوں اس تصویر میں رنگ آمیزی کرتا رہتا اور کرسٹین آتش دان کے پاس بیٹھی اس کی پھٹی ہوئی قمیض یا پتلون کی مرمت میں مشغول رہتی اور ننھی بچی ایلس فرش پر کھیل رہی ہوتی۔ کام سے فارغ ہو کر جب وہ کافی رات گئے بستر پر گرتا تو فوراً گہری نیند میں کھو جاتا۔ تقریباً ہر بار کرسٹین کو پال کے بوٹ اتار کر ٹانگوں پر کمبل ڈالنا پڑتا۔ پھر وہ سونے والے پژمردہ چہرے کو رحم بھری ہمدرد نگاہوں سے دیکھتی اور پلکوں تک آئے ہوئے آنسو پونچھتی اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

پیرس میں آنے کے بعد پال کی صحت دن بدن گرنے لگی تھی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں ڈوبنے لگی تھیں اور سر میں جابجا سفید بال نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ صبح کے وقت وہ اپنا کوٹ پہن چھڑی ہاتھ میں لے گھر سے نکل پڑتا اور دن بھر رسالوں کے دفتروں علمی اداروں' آرٹ سکولوں اور گھٹیا قسم کے ریستورانوں میں گھومنے کے بعد شام کو تھکا ہارا واپس لوٹتا۔ کرسٹین اس کا کوٹ اتارتی' چھڑی لے کر کونے میں رکھتی' رومال سے اس کے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھتی اور جب کبھی اسے اس پال کا خیال آ جاتا جس کو اس نے قصبہ آرلیس میں دریائے روون کے کنارے دیکھا تھا تو وہ دیوانہ وار اپنے خاوند سے لپٹ جاتی اور اپنے آپ اس کے آنسو نکل آتے۔

قصبہ آرلیس میں کرسٹین اپنی چچی کے ہاں رہتی تھی۔ بیوی کو پیرس میں دفنانے کے بعد کرسٹین کا باپ اسے آرلیس میں چھوڑ کر خود برما چلا گیا تھا۔ یہ مکان سیاہ پتھر اور لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ کرسٹین جب پہلے پہل اس مکان میں آئی تو وہ بھی بچی ہی تھی۔ وہ اسی مکان میں بڑھی پلی اور یہیں سیب و انگور کے باغات میں کھیل کود کر اس نے اپنا بچپن گزارا۔ ان کا مکان قصبے کی آبادی سے ذرا پرے ہٹ کر دریائے روون کے کنارے واقع تھا۔ ان کے اور دریائے روون کے درمیان سیب اور انگور کے باغات حائل تھے جو کرسٹین کی چچی کی تحویل میں تھے۔ یہ قصبہ ایک پرانی رومن بستی تھی۔ جس نے تاریخ کے کئی گرم سرد دور دیکھے تھے۔ یہاں گلیاں تنگ' پیچ دار اور پتھریلی تھیں۔ آرلیس کا موسم نہایت خوشگوار تھا۔ اپریل سے اگست کے آخیر تک چمکدار سورج چمکتا۔ باغوں میں تازہ شگوفے پھوٹتے۔ انگور کی بیلیں اپنا پرانا لباس جھاڑ کر نئے آنچل اوڑھ لیتیں۔ سردیوں کی رت شروع ہوتے ہی آسمان کا رنگ نیلا ہو جاتا اور رات کو کافوری ستاروں کی آب و تاب دوبالا ہو جاتی۔ سرما میں بہت کم برف گرتی۔ کرسٹین کے مکان کا پھاٹک لکڑی کا تھا۔ جس کے قریب ہی اصطبل میں ڈھور ڈنگر بندھے رہتے۔ انگور کے باغوں میں بیلیں بانس کی چھتوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ مئی میں ان چھتوں میں جگہ جگہ انگوروں کے ہلکے ہلکے سبز' گہرے سبز' ہلکے سرخ' گہرے قرمزی اور سیاہ خوشے لٹک جاتے اور کرسٹین اپنی چچا زاد بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ سارا دن باغات میں انگور کے گچھوں سے ٹوکریاں بھرتی رہتی۔ سیب کے درختوں کے تنے کھردرے اور سیاہ تھے۔ لیکن ان کی گنجان

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ خزاں میں ان کی ننگی ٹہنیوں کا رنگ بھی کالا پڑ جاتا اور بہار میں جب ان پر شگوفے پھوٹتے تو سارا باغ ان کی بھینی مہک سے لبریز ہو جاتا۔ باغ کے شمال مشرقی حصے میں ایک اونچے سے ٹیلے کی ہموار چوٹی پر لارج اور چیری کے جھنڈ تھے۔ ٹیلے کے نیچے یوکلپٹس کے درختوں کے درمیان پتلی سی پگڈنڈی قصبے کو جاتی تھی جس کے ساتھ دریائے رودن سبک خرامی سے بہہ رہا تھا۔ دریا کی دونوں جانب پتھریلی راہ گزر تھی جس پر چیڑھ کے جھومر دار درخت اپنی ٹھنڈی چھاؤں کیے ہوئے تھے۔ کنارے پر چند ایک نوکیلی چٹانیں پانی سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ دوسرے تیسرے دن کرسٹین اپنی چچا زاد بہنوں کے ساتھ یہاں کپڑے وغیرہ دھونے آیا کرتی۔ ان چٹانوں سے آگے ایک اور ٹیلہ تھا جس پر پرانے وقتوں کی ایک سنگین بارہ دری کا ڈھانچہ سا کھڑا تھا۔ بارہ دری کی چھت غائب تھی اور گول گول ستونوں کے پاؤں میں جنگلی گھاس اگ رہی تھی۔ اس بارہ دری میں کرسٹین نے پہلی دفعہ پال کو دیکھا۔

اس روز آسمان بے حد صاف تھا اور نیلی نیلی فضا میں چمکیلی دھوپ نے سنہری جال سا بن رکھا تھا۔ کرسٹین نچڑے ہوئے کپڑے بالٹی میں رکھے اپنی بہنوں کے ساتھ دریا سے واپس گھر جا رہی تھی کہ اس نے پرانی بارہ دری کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک آدمی کو دیکھا جو لمبی گھاس میں گھٹنوں تک ڈوبا کوئی تصویر بنا رہا تھا۔ اس آدمی کے سر پر لمبا چوڑا ہیٹ تھا اور اس کے چوڑے شانے آگے کو تصویر پر جھکے ہوئے تھے۔ کرسٹین فوراً سمجھ گئی کہ وہ کوئی مصور ہے جو شہر سے ان کے قصبے میں تصویریں بنانے آیا ہے۔ اس سے سے پہلے وہ کئی مصوروں کو آرلیس کے گردونواح میں گھومتے اور تصویریں جمع کرتے دیکھ چکی تھی۔ کرسٹین پگڈنڈی پر سے گزر گئی اور وہ مصور بھی کرسٹین سے بے خبر اپنے کام میں 'منہمک رہا' کچھ روز بعد کرسٹین نے پھر اس مصور کو بارہ دری میں تصویر بناتے دیکھا۔ اس روز وہ تصویر سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا اور پائپ پیتے ہوئے اسے مسرور نگاہوں سے تک رہا تھا۔ کرسٹین تنہا تھی وہ قریب سے گزری تو مصور نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ کرسٹین اپنے خیال میں چپ چاپ گزر گئی۔ لیکن اسے اپنے مکان کے پھاٹک' بلکہ اپنے مکان تک یہی محسوس ہوتا رہا کہ دو آنکھیں اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ دوسرے روز مصور بارہ دری میں نہیں تھا۔ کرسٹین نے سوچا شاید وہ بھی واپس چلا گیا ہو۔ جیسا کہ اس سے پیشتر کئی مصور واپس چلے گئے تھے۔ لیکن ایک روز جب کہ سورج دریا کی پرلی طرف والے درختوں پر جھک رہا تھا کرسٹین کی اس اجنبی مصور سے ملاقات ہو گئی۔ وہ لکڑی کی بالٹی لیے باغ والے کنوئیں پر پانی لینے گئی۔ ابھی اس نے کنوئیں میں بالٹی ڈالی ہی تھی کہ خشک پتوں پر کسی کے بوجھل قدموں کی آواز سنائی دی۔ کرسٹین نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہی بارہ دری والا مصور ہاتھ لمبے کوٹ کی جیبوں میں دیئے کنوئیں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کرسٹین بالٹی لٹکانے لگی۔ اجنبی مصور چپکے سے قریب آیا اور کنوئیں کی جگت پر بیٹھ گیا۔ اس نے ہیٹ اتار کر اپنے گھٹنے پر رکھا اور پائپ جھاڑنے لگا۔ کرسٹین نے کنکھیوں سے دیکھا کہ اس کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چوڑی پیشانی پر دائیں طرف زخم کا نشان تھا۔ وہ بظاہر اس اجنبی کے خیال سے بالکل بے نیاز تھی۔ جب بالٹی پانی سے بھر گئی تو وہ قدرے آگے کو جھک کر اسے باہر کھینچنے لگی۔

''کیا بوجھ زیادہ ہے؟''

اجنبی مصور اپنی جگہ سے اٹھا۔ کرسٹین کے ہاتھوں سے رسی لی اور بڑے سکون سے بالٹی اوپر کھینچنے لگا۔ کرسٹین پیچھے ہٹ گئی اور اجنبی ہمدرد کے چوڑے شانوں کو دیکھنے لگی۔ لمبے کوٹ کو ایک بازو کہنیوں سے پھٹا ہوا تھا۔ کرسٹین نے سوچا کیا اس آدمی کی بیوی کو اس کا کچھ خیال نہیں؟ بالٹی باہر آ چکی تھی۔ کوٹ کے دامن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اجنبی مصور نے کہا:

''اب خود اٹھا کر لے جاؤ۔ میں ضرور تمہاری مدد کرتا اگر موسم اس قدر خوشگوار نہ ہوتا۔''

اس نے پائپ اٹھایا ہیٹ لاابالی انداز میں سر پر رکھا اور سیب کے درختوں میں غائب ہو گیا۔ کرسٹین بالٹی اٹھائے سارا راستہ اس اجنبی کے متعلق سوچتی رہی اور جب قصبے پر رات چھا گئی تو اس ہمدرد اجنبی کا خیال کرسٹین کے دل میں شعلے کی مانند بھڑک اٹھا۔

موسم بہار شروع ہو چکا تھا۔ انگور کی بیلیں گچھوں کے بارے سے نیچے کو جھک آئی تھیں۔ سیب کی ٹہنیاں پھلوں سے لد گئی تھیں۔ ٹہنیوں پر گلاس نما گلابی پھول آسمان کی طرف منہ اٹھا رہے تھے۔ لارچ اور بیچ کی شاخوں میں نیلگوں کلیاں ستاروں کی طرح چمکنے لگی تھیں۔ نیلے اور سنہری آسمان تلے جب ہوا چلتی تو درختوں کے سائے میں نازک پتیوں کی سیج بچھ جاتی۔ چراگاہیں شاداب گھاس سے بھر گئی تھیں۔ جہاں ڈھور ڈنگر دھوپ میں چرا کرتے۔ سیب اور انگور کی فصل اس بار کافی اچھی ہوئی تھی۔ چنانچہ کرسٹین کی چچی نے سرخ رنگ کا ریشمی سایہ سلوا لیا تھا اور چچا ٹٹو پر سوار دن بھر خاردار باڑھ کا معائنہ کیا کرتا اور شام کو باورچی خانے کی میز پر بیٹھ کر چائے کے ساتھ انڈوں کا بنا ہوا زردیک اڑاتا۔ کرسٹین کا دل بہار کی حرارت کو اپنے قریب محسوس کر رہا تھا اور اس کے سنہری بال بار بار شانوں پر بکھر جاتے اور اڑ اڑ کر اس کے پکے ہوئے سرخ گالوں کو چومنے لگتے۔ انگور کے خوشوں کو بیلوں سے الگ کرنے کے لیے جب وہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتی تو اس کا جی چاہتا کہ کوئی اسے آہستہ سے اوپر اٹھا لے اور وہ انگور کی سرسبز بیلوں میں کہیں گم ہو جائے۔ اسے دن میں کئی بار اس اجنبی کا خیال آتا۔ وہ اس کے لمبے کوٹ کی ساری جیبیں انگور اور سیب سے بھر دینا چاہتی تھی۔ لیکن وہ دیوانہ مصور اس سیل رنگ و نور میں نہ جانے کہاں گم تھا۔ چنانچہ ایک روز جب کرسٹین نے دریا کے کنارے مصور کو تصویر بنانے میں محو دیکھا تو وہ چڑ گئی۔ بھلا اس موسم میں کون اس طرح ہاتھ توڑ کر بیٹھا رہتا ہے۔ آخر اس اجنبی مصور کو نقلی چیزوں سے اتنا پیار کیوں ہے؟ وہ کیوں نہیں برش اور رنگ پھینک کر نرم گھاس پر ننگے پاؤں بھاگنا شروع کر دیتا؟ کیا اس کی رگوں میں خون کی جگہ محض سرخ روغن گردش کر رہا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرسٹین دیر تک ایک درخت کی اوٹ میں مصور کو تصویر بناتے دیکھتی رہی۔ وہ اسے دیکھنے میں اس قدر محو تھی کہ اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ یہاں تک کہ اجنبی مصور کی نگاہ بھی اس پر پڑ گئی اور وہ بالکل بت بنی کھڑی رہی۔ معاً اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے گھور رہا ہے۔ وہ گھبرا کر واپس مڑنے ہی والی تھی کہ اجنبی مصور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ کرسٹین کو یوں محسوس ہوا گویا وہ یکایک کسی گنجان درخت کی چھاؤں میں آ گئی ہو۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''کل میں تمہارے باغ کی تصویر بناؤں گا۔''

کرسٹین سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

''کیا تمہارا باغ بہت خوبصورت ہے؟''

کرسٹین منتشر سی آواز میں بولی:

''جی ہاں۔۔۔۔۔۔آج کل بہار کا موسم ہے''

''کیا مجھے کوئی وہاں روکے گا تو نہیں؟''

کرسٹین نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

''نہیں جناب۔۔۔۔۔۔آپ ہمارے انگور تھوڑے چرا لے جائیں گے۔

اجنبی مصور نے قدرے جھک کر گہری آواز میں کہا

''اور اگر میں نے سچ مچ چرا لیے؟''

''تو پھر جناب۔۔۔۔۔۔ہم آپ کو قید کر لیں گے۔''

اور کرسٹین وہاں سے بھاگ گئی۔ مصور نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے کی آواز کرسٹین کے کانوں میں رت گھر گونجتی رہی۔

دوسرے روز دوپہر کے بعد کرسٹین اپنے باغ میں گئی تو اس نے دیکھا مصور منڈیر پر بیٹھا ہے۔ سامنے لکڑی کے سٹینڈ پر نیلے فریم میں جڑا ہوا سفید پردہ ہے جس پر چند درختوں کے ادھورے خاکے بنے ہوئے ہیں جن میں مصور رنگ آمیزی کر رہا ہے۔ وہ دونوں ہاتھ پشت پر رکھے تصویر دیکھنے میں محو تھی کہ کسی چیونٹی نے اس کے ننگے پاؤں پر اس زور سے کاٹا کہ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ مصور نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور برش ہاتھ سے رکھ دیا۔

''تو تم گویا پیچھے کھڑی تھیں؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''میں۔۔۔۔۔۔میں ابھی آئی تھیں جناب۔'' کرسٹین نے پاؤں پر پاؤں ملتے ہوئے کہا۔

''ہوں ں ں ں ں' مصور نے لمبی ہوں بھر کر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔

''یہاں مچھر بہت ہیں''

''اور چیونٹیاں بھی بہت ہیں جناب''

کرسٹین ہونٹ دانتوں تلے دبا کر ہنس پڑی۔

مصور بھی مسکرایا اور دونوں نے محسوس کیا وہ ایک دوسرے کی مسکراہٹ کو بچپن سے پہچانتے ہیں۔

''میرا نام پال ہے''

''میرا نام کرسٹین ہے''

ہم اس سے پہلے کیوں نہیں ملے؟ ہم اس سے پہلے کہاں تھے؟ دیکھو میرے بال کس قدر سنہری ہیں اور میرے بالوں میں لگے ہوئے سیب کے پھول ترو تازہ ہیں اور تمہارے ماتھے پر زخم کا نشان کتنا دلکش لگ رہا ہے اور تمہارا برش جادو کی چھڑی سے کم نہیں وہ جس پھول کو چھو جاتا ہے اس میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو جاتا ہے۔

''کرسٹین تم گھر میں اکیلی ہی رہتی ہو؟''

''نہیں جناب۔۔۔۔۔۔میری چچی ہے' چچا ہے اور بہن بھائی ہیں۔''

''اور تمہارے ماں باپ؟''

''میری ماں پیرس میں دفن ہے اور جناب میرا باپ برما میں مقیم ہے''

اور تمہارا بھائی؟''

''وہ فوج میں بھرتی ہو کر سائیگاؤں چلا گیا ہے خدا اس کی حفاظت کرے۔۔۔۔۔۔اسے بچپن ہی سے دنگے فساد کی عادت تھی''

دونوں خاموش ہو گئے۔ کرسٹین پال کی طرف منہ اٹھائے ہوئے تھی اور پال سیب کے درختوں کو تک رہا تھا کرسٹین نے رک رک کر پوچھا:

''اور آپ کا گھر کہاں ہے جناب؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''میرا گھر؟'' پال کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بھنویں سکیڑ کر اس نے برش رنگ میں ڈبویا اور تصویر پر ایک سبز پتی کو چھیڑتے ہوئے بولا:

''پیرس میں''

''پیرس!'' کرسٹین کی نیم سبز آنکھیں چمکنے لگیں۔

''پیرس تو بہت بڑا شہر ہے''

''تم نے دیکھا ہے؟''

''میں ابھی بچی ہی تھی کہ اپنے بڑے بھائی اور باپ کے ساتھ یہاں آ گئی۔ لیکن جناب میں نے کئی بار خواب میں پیرس کی سیر کی ہے وہاں بڑے بڑے تھیٹر ہال میں۔ ناچ گھر ہیں۔ وہاں عورتیں قیمتی لباس پہنتی ہیں۔''

پال نے کرسٹین کے معصوم چہرے پر سیب کے پھول کھلتے دیکھے اور بولا۔ ''وہاں ہر تیسری عورت کی بھنویں' دانت اور بال مصنوعی ہوتے ہیں اور ہر دوسری عورت ہر موضوع پر بات کر سکتی ہے اور کسی کو نہیں سمجھتی۔ پیرس بہت بڑا شہر ہے صحرائے اعظم سے بھی بڑا۔''

کرسٹین پہلے تو بالکل نہ سمجھ سکی کہ پال کیا کہہ رہا ہے۔ پھر جب اس نے اپنے بالوں کی تعریف سنی تو اس کے کانوں کی لوئیں جلنے لگیں اور اس نے گردن جھکالی' مصور کنوئیں کی منڈیر سے اٹھا اور کرسٹین نے اپنے کندھوں پر پال کے مضبوط ہاتھوں کے پرسکون لمس کو محسوس کیا۔ وہ سمٹ سی گئی۔ پال نے محسوس کیا کرسٹین کے ہونٹ برف کی طرح سرد ہیں اور اس کا جسم کانپ رہا ہے وہ اس کے بازو درخت کی شاخوں کی طرح اس کی گردن کے گرد حمائل ہیں۔ کرسٹین اپنے دل کی دھڑکن پال کے دل میں سن رہی تھی۔ اوپر نیلا آسمان' سنہری دھوپ سیب کے شگوفے گرم زمین کی مہک' شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔۔۔۔۔۔۔ وفعتاً خشک پتوں پر آہٹ سی پیدا ہوئی۔ کرسٹین گھبرا کر مصور سے علیحدہ ہو گئی اور اس کے بھورے بالوں میں اڑا ہوا سیب کا شگوفہ نیچے گر پڑا۔ اس نے جلدی سے شگوفہ اٹھایا اور انگور کی جھکی ہوئی بیلوں کے نیچے سے ہو کر باغ کی دوسری طرف بھاگ گئی۔ مصور چوکنا ہو گیا۔ لیکن جلدی ہی ایک سفید موٹی سی بلی اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور دم ہلاتی اسے چمکیلی نگاہوں سے تکنے لگی۔ مصور نے جھک کر اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور لکڑی کا سٹینڈ کندھے پر رکھ سیب کے باغ میں غائب ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ابھی تک کسی کے نرم ہونٹوں کی خنکی تھی۔

گھر کے پاس پہنچ کر کرسٹین نے سیب کا شگوفہ اپنے بالوں میں لگایا' ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور مکان کا پھاٹک کھول کر اندر داخل ہو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گئی۔ پھاٹک کے قریب ہی لال رنگ کی گائے جھاڑیوں میں منہ مار رہی تھی۔ کرسٹین کا جی چاہا کہ اس کا منہ چوم لے۔

جب قصبہ آرلیس میں اندھیرا پھیل گیا اور شام کے سائے باغوں اور جنگلوں میں گہرے ہو گئے اور دریا کی طرف سے پانی میں لہرانے والے مرطوب سرکنڈوں کی خوشبو آنے لگی اور بہار کی رات کا نیلا آسمان ستاروں سے جگمگا اٹھا تو کرسٹین گھر کے کام دھندوں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ بستر میں دبک کر اس نے لیمپ بجھا دیا۔ لیمپ بجھتے ہی سرہانے والی کھلی کھڑکی میں سے رات کی پھیکی نیلی روشنی کمرے میں داخل ہونے لگی۔ کرسٹین کو محسوس ہوا اس نیم اندھیرے میں کوئی شخص اس پر جھکا ہوا ہے' پال؟

اس کے جسم میں ایک شیریں سنسنی دوڑ گئی اس نے خواب میں کھو جانے کے لیے آنکھیں بند کر لیں' کوئی دیہاتی پھاٹک کے پاس گنگناتا ہوا گزر گیا۔ کرسٹین الفاظ نہ سمجھ سکی۔ لیکن دھیمی آواز نے اس کی گرم آنکھوں پر اپنا نیم سرد ہاتھ رکھ دیا اور وہ سو گئی۔

دوسرے روز گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ بہار کا سورج گہرے گلابی رنگ کی کرنیں اچھالتا ہوا طلوع ہوا تھا۔ خالہ زاد بہنیں بڑے کمرے کی صفائی میں مصروف تھیں۔ چچی جان سیب کی شراب کے پرانے مرتبان نکلوا رہی تھیں۔ چچا باورچی خانے میں مرغ کے انڈوں کی گنتی کر رہے تھے۔

''کرس! تو بھی کپڑے پہن لے' چچا جان نے باورچی خانے سے آواز لگائی۔

کرسٹین نے قریب جا کر پوچھا:

''یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟''

چچا نے دوسری درجن گننے کے بعد ایک انڈے کے اندر جھانکتے ہوئے کہا:

''مہمان آ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔لیکن اس انڈے میں تو بچہ ہے۔''

دوپہر کے وقت جن مہمانوں کا ٹولہ آیا ان میں دو ادھیڑ عمر کی عورتیں اور ایک بوڑھا آدمی اور ایک نوجوان لڑکی شامل تھی۔ بوڑھے آدمی کا سر درمیان سے گنجا تھا اور کھوپڑی کنارے سفید بالوں کا حاشیہ سج رہا تھا۔ اس کا قد چھوٹا تھا' بدن دوہرا اور گردن بھینچی ہوئی تھی۔ وہ ہر مرتبہ بات کرنے سے پہلے سر پر ہاتھ پھیر لیتا تھا۔ جیسے وہاں آواز پیدا کرنے والی کوئی خفیہ کل لگی ہو۔ اس کی آواز گونجدار تھی اور بولتے وقت اس قدر زور لگاتا کہ اس کی گردن کی رگیں پھول جاتیں۔ جس وقت کرسٹین شاندار لباس پہنے انگور سے بھری ہوئی پلیٹ لیے اندر کمرے میں داخل ہوئی تو اس بوڑھے نے نتھنے پھڑکاتے ہوئے اس کا بھرپور جائزہ لیا اور نگاہیں ہٹائے بغیر وہ اپنے ساتھ والی ادھیڑ عمر کی عورت سے سرگوشی میں باتیں کرنے لگا۔ دوسری عورت نے بھی نتھنے پھلا کر کرسٹین کو دیکھا اور وہ ساتھ والی عورت سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سرگوشی کرنے لگی۔ دوسری عورت منہ پھیلا کر اپنی موتیوں کی مالا درست کرنے لگی۔ چچی جان اس عورت کے پاس بیٹھی تھیں اور بار بار اس کی طرف مربے کی پلیٹ بڑھا رہی تھیں۔

''آپ نے مربہ تو چکھا ہی نہیں۔

''محترم! یہ بادی ہے''

چچا جان بالکل سامنے والی کرسی پر ڈٹے ہوئے تھے اور خلاف معمول سگار سلگائے ہوئے تھے۔ وہ بڑی دیر سے پہلی ادھیڑ عمر کو مرغی کے انڈے میں سے بچے نکلنے کا حادثہ سنا رہے تھے اور وہ عورت اس قدر دلچسپی سے سن رہی تھی۔ گویا وہ اس کا اپنا بچہ ہو۔ کرسٹین ان کے بیچ والی کرسی پر تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر مہمان برآمدے میں جا بیٹھے اور سیب کی پرانی شراب کی تعریفیں کرنے لگے۔ چچا جان چہک چہک کر انہیں مطلع کرتے۔

''میری بتیسویں سالگرہ پر اسے کشید کیا گیا تھا اور اس وقت خاکسار پچاسویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔''

دونوں عورتیں بار بار اپنے ریشمی ملبوسات پر نگاہیں دوڑا رہی تھیں اور ایک دوسرے سے نظریں ملتے ہی یوں جھینپ سی جاتیں گویا انہوں نے ایک دوسرے کو ننگا دیکھ لیا ہو۔ مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد کرسٹین کا چچا ہاتھ جھاڑتے ہوئے ڈھیلی پتلون کو اوپر چڑھاتا اندر آیا۔ کرسٹین اپنی خالہ زاد بہنوں کے ساتھ برتن ایک جگہ جمع کر رہی تھی۔

چچا جان آدھا بجھا ہوا سگار سلگا کر بولے:

''میری بچی کرس تو وہاں جا رہی ہے جس کا اپنا ہوٹل ہے اور پیرس کے سرکاری بنک میں جس کا کئی ہزار روپیہ جمع ہے۔ اری واہ ری میری بیٹی تیرے تو نصیب جاگ اٹھے۔''

چچا نے اپنا ہاتھ پیار سے کرسٹین کے سر پر رکھا تھا۔ کرسٹین کا ایکا ایکی وہ ہاتھ منوں وزنی محسوس ہوا اور اس کا سانس رکنے لگا۔ چمچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چینی کی پلیٹ میں گر پڑا۔ چمچ کے پلیٹ سے ٹکرانے کی آواز پر کرسٹین کو پال کی آواز کا گمان ہوا۔

''میرا نام پال ہے۔ میرا گھر پیرس میں ہے''

اسے یوں لگا گویا وہ ابھی رو دے گی۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے کی ہر شے اجنبی ۔۔۔۔۔۔ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ دیر تک دروازے بند کر کے دیوار کے ساتھ لگی کھڑی رہی اور سوچتی رہی کہ وہ کس کے کمرے میں آ گئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور مکان کے عقبی حصے میں چلی گئی۔ ڈربوں میں بند مرغیاں اسے تعجب سے تکنے لگیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سامنے بانس کی کھڑی میں سے گھوڑے نے سر اٹھا کر اسے یوں دیکھا گویا پوچھ رہا ہو۔

''تم کون ہو؟''

ہاں میں کون ہوں؟ میں یہاں کیوں آ گئی؟ میں یہاں کیوں آ گئی؟ کاش میں یہاں کبھی نہ آتی۔۔۔۔۔۔۔کبھی نہ آتی۔۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔۔وہ کہاں ہوگا؟ پال! پال!

تین دن تک اس نے پال کو تلاش کیا۔ وہ دن میں کئی مرتبہ بار ادھر ادھر کا بہانہ بنا کر دریا کنارے یا لارچ کے جھنڈوں میں نکل جاتی۔ شاید وہ یہاں ہو، شاید وہ اب آ گیا ہو اور پائپ کا دھواں اڑاتے کوئی تصویر بنا رہا ہو۔ لیکن وہ دیوانہ مصور نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ اس دوران میں وہ گھر اور گھر والوں سے دور ہوتی گئی۔ اسے ہر آدمی اپنی طرف بے رحم نگاہوں سے گھورتا محسوس ہوتا۔ ہر بار کھانے پر اسے گمان ہوتا کہ اسے زہر دیا جا رہا ہے۔

پانچویں روز تیسرے پہر دھوپ جب چیڑھ کی بلند شاخوں پر سنہری ہو رہی تھی کرسٹین نے پال کو دریا کے کنارے پا لیا۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے گھاس پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کرسٹین کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو ابل پڑے اور اس کا جی اس بچے کی طرح درد و محبت سے لبریز ہو گیا جسے بھرے میلے میں بچھڑ جانے کے بعد دفعتاً کسی اپنے آدمی کی صورت نظر آ گئی ہو۔ وہ بھاگ کر پال کے قدموں سے لپٹ جانا چاہتی تھی لیکن وہ اپنے دل کا درد کیوں کر بیان کرے؟ کیا معلوم وہ اس کی دکھ بپتی سن کر اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اسے صبر و شکر کا مشورہ دے کر خود پیرس چلا جائے اور پھر کبھی اسے اپنی صورت نہ دکھائے۔۔۔۔۔۔۔کیا خبر وہ اس سے صرف دل بہلا رہا ہو! پھر کرسٹین کو وہ سنہری لمحات یاد آ گئے جب اس نے پہلی بار پال کے مضبوط ہاتھ اپنے شانوں پر محسوس کئے تھے۔ نہیں پال اسے جی سے چاہتا ہے، وہ صرف اسے ملنے کے لیے باغ میں آیا تھا اور اس نے کہا تھا: کرسٹین تیرے بالوں میں شعلے ہیں اور تیری آنکھوں میں محبت کے دیئے روشن ہیں پال اسے ضرور چاہتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ضرور!

لیکن میرے خدا۔۔۔۔۔۔۔میرے پاؤں کیوں بوجھل ہو رہے ہیں؟ میرا دل کیوں ڈھاتا ہے؟

کرسٹین دونوں ہاتھ سینے پر رکھے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی پال کی طرف بڑھی۔ وہ شاید آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ آہٹ پا کر پال نے آنکھیں کھول دیں اور اس کے منہ سے بے اختیار ''کرسٹین'' نکل گیا۔

کرسٹین کو محسوس ہوا وہ گر جائے گی۔ پال نے لپک کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ بچوں کی طرح رونے لگی اور جب وہ کافی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روچکی تو اس نے ساری روئداد پال کو کہہ سنائی۔ پال نے کرسٹین کو گھاس پر اپنے پاس بٹھا لیا اور کرسٹین نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سنا کہ پال اسے بے حد چاہتا ہے اور وہ اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گا۔

''لیکن پال۔۔۔۔۔۔۔میں یہاں تنہا ہوں۔''

''پھر کیا ہوا۔۔۔۔۔۔۔کچھ روز بعد ہم اکٹھے پیرس چلے جائیں گے اور وہاں شادی کر لیں گے۔ ہمارا ایک الگ مکان ہوگا جہاں ہم دونوں سیدھی سادی زندگی بسر کریں گے۔''

''لیکن پال میرا بوڑھا باپ پردیس میں ہے اور میرا پیارا بھائی سائیگاؤن۔۔۔۔۔۔۔''

''تم بے فکر رہو۔ ہم انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیں گے''

جس دن صبح انہیں آرلیس سے بھاگ نکلنا تھا وہ رات کرسٹین نے اپنے کمرے میں جاگ کر گزاری۔ جب مشرقی آسمان پر صبح کی اولین نیلی نیلی جھلکیاں نمودار ہوئیں تو کرسٹین اپنے بستر میں سے نکل کر نیچے آ گئی۔ گھر کے سب لوگ سو رہے تھے۔ اس نے بالٹی اٹھائی' کنوئیں سے پانی بھرا۔ مرغی کے ڈربوں میں پانی ڈالا' گھوڑے کی گردن تھاپی' گائے کی سفید پیشانی کو چوما اور باورچی خانے کی کھڑکی کے ساتھ لگی' باغ میں تکنے لگی۔ درخت سو رہے تھے۔ گھاس شبنم سے زرد ہو رہی تھی۔ درختوں میں اندھیرا تھا۔ گھوڑا بار بار زمین پر پاؤں مار رہا تھا' ہوا تازہ اور سرد تھی اور اس میں گیلی لکڑی کی خوشبو تھی۔ کرسٹین نے آخری مرتبہ سیب کے مدھم درختوں کو دیکھا۔ آنسو پونچھے' اپنے کمرے میں آ کر سرخ رومال سے بال باندھے' شانوں پر گرم شال پھیلائی اور گرم کوٹ اٹھا مکان کے عقبی دروازے میں سے نکل کر سٹیشن کی طرف چل پڑی۔

دور سے انجن کے سکارنے کی آواز آ رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر پال اس کا منتظر تھا' اس نے آگے بڑھ کر کرسٹین کو اپنے ساتھ لگا لیا اور دونوں گاڑی کے ڈبے میں سوار ہو گئے۔

دوسرے روز وہ پیرس میں تھے۔

پہلے دو روز کرسٹین نے پال کے ایک آرٹسٹ دوست کے ہاں بسر کئے جو بہت کم گھر آتا تھا۔ تیسرے روز پال نے شہر کے پرشور علاقے میں ایک بڑی سی عمارت کی پانچویں منزل پر فلیٹ لے لیا۔ یہاں ایک طرف دریائے سین کی وادی تھی اور دوسری جانب اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ شہر کے اس حصے کا آسمان کارخانوں کے دھوئیں سے ہر دم مٹیالا رہتا تھا۔ بازار میں کسی وقت بھی ٹراموں' گاڑیوں' موٹروں اور کھلنڈرے بچوں کا شور نہ تھمتا' بالکونی پر سے کوئی تیزی سے گزرتا تو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کمروں کی لکڑی کی دیواریں کانپنے لگتیں۔ اوپر کوئی بھاری قدموں سے چلتا تو چھت چرچرا جاتی۔ پال نے کرسٹین سے فوراً شادی رچا لی۔

شادی کی دعوت پر پال کے تمام آرٹسٹ دوست جمع تھے ان میں سے ہر آدمی اپنی وضع قطع اور لباس کے اعتبار سے بالکل مختلف تھا۔ اگر کوئی شے ان سبھوں میں مشترک تھی تو وہ ان کے بے ہنگم قہقہے اور گفتگو کا بے ساختہ پن تھا۔ وہ بے دریغ ہو کر شراب پی رہے تھے۔ شراب کی بو اور تمباکو کے دھوئیں سے کمرے میں گرمی سی ہو گئی تھی۔ ان کی باتیں کرسٹین کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ لیکن وہ انہیں بڑے انہماک سے سن رہی تھی اور بے حد خوش تھی۔ اسے ہر آواز پر اپنی آواز کا دھوکا ہو رہا تھا۔ وہ شراب میں ڈوبے ہوئے تھے اور بڑے پر جوش لہجے میں بول رہے تھے جب وہ تھک گئے تو وہیں ڈھیر ہو گئے اور انہیں کوئی سدھ بدھ نہ رہی۔ پال بھی نشے میں دھت تھا اور اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے کرسٹین کو آغوش میں بھینچ لیا۔ اور کرسٹین نے محسوس کیا کہ وہ ہم آغوشی اس سے بہت مختلف تھی جو اسے قصبے کی ایک شام سیب کے باغ میں نصیب ہوئی تھی۔

ایک ماہ پوری بے فکری کے ساتھ بسر ہو گیا اور اس کے بعد جب ہونٹوں کے لمس اپنی مٹھاس کھونے لگے اور پال کا بٹوہ ہلکا پڑ گیا تو پال نے اپنی ایک تصویر اٹھائی اور گھر سے نکل آیا شہر کی سڑکوں پر زندگی کو برق رفتاری سے گزرتے دیکھ کر اسے گمان ہوا جیسے وہ ایک ہزار سال سے اپنے کمرے میں بند تھا۔ تصویر پر زرد کیلوں کا بڑا سا گچھا ہی تھا۔ جو چوڑے چوڑے پتوں میں لپٹا میز پر پڑا تھا۔ کیفے ڈی لا آپیرا میں پال کافی پینے بیٹھا تو قریب ہی کسی یہودی جوہری نے تصویر کی قیمت دریافت کی۔ پال نے بے نیازی سے پائپ کا دھواں اڑاتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنی تصویر کی قیمت سے لاعلم ہے۔ یہودی جوہری نے موٹی گردن گھماتے ہوئے کہا۔

''تو پھر بیس فرینکس کیسے رہیں گے؟''

پال نے تصویر الٹ کر میز کے نیچے رکھ دی۔

''مسیو! کیا ہی اچھا ہو اگر آپ کسی پھل والے سے زندہ کیلے خرید لیں۔''

کئی دنوں کی مسلسل آوارہ گردی کے بعد پال کو ایک بوچڑ کے بچوں کو مصوری کا درس دینے کی ملازمت مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی شہر کے ایک مشہور اخبار نے اس سے صنعت و حرفت کی کتابوں پر تبصرہ لکھوانے کا بھی وعدہ کر لیا۔ دن کے وقت وہ ایک گھٹیا قسم کے پریس میں پروف ریڈری کرتا' اخبار کے لیے۔۔۔۔۔۔۔ کسی نہ کسی کتابچے پر تبصرہ لکھتا' بوچڑ کے بچوں کو رنگوں کے امتزاج اور خطوط کے آہنگ کی تعلیم دیتا اور شام کو جب گھر لوٹتا تو اسے اپنے آپ پر لکڑی کے بت گمان ہوتا۔ فلیٹ کا سب سے چھوٹا کمرہ پال

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے سٹوڈیو میں تبدیل کر رکھا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ ایک آدھ گھنٹہ کرسٹین سے باتیں کرتا اور پھر اپنے سٹوڈیو میں آ جاتا اور رات گئے تک کسی نہ کسی تصویر پر کام کرتا رہتا۔ جس روز کرسٹین کے ہاں ایلس پیدا ہوئی پال کو تبصرہ لکھوانے والے اخبار نے جواب دے دیا۔ کیونکہ پال کی جگہ کسی اور نوجوان نے کم تنخواہ پر اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ علاوہ ازیں اس نوجوان کا شہر کے کاروباری حلقوں میں بڑا اثر و رسوخ تھا اور اخبار کے مالک کو مزید اشتہارات کی توقع تھی۔ اس حادثے کے ایک ماہ بعد پال نے ایک روز اپنے بوچڑ شاگرد کی ذہنی صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے لیے اسے کوئی دل پسند تصویر بنانے کو کہا۔ آدھ گھنٹہ بعد جب پال نے اپنے شاگرد کی کارکردگی کا معائنہ کیا تو وہ دم بخود رہ گیا۔ تصویر میں ایک موٹا تازہ آدمی مریل سی بھینس کی گردن پر کلہاڑا چلا رہا تھا۔ پال نے غصے میں آ کر لڑکے کے کان کھینچے۔ لڑکا یوں چیخ اٹھا گویا کسی نے اس کی گردن پر کلہاڑے کی دھار رکھ دی ہو۔ لڑکے کا باپ چھرا ہاتھ میں لیے دوڑتا ہوا اندر آیا اور پال چھڑی ہاتھ میں لے کر دوڑتا ہوا دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا باہر پھر وہی پیرس کی سنگین اور پر ہجوم سڑکیں تھی اور گھٹیا کافی کے تلخ گھونٹ۔

پال نے ایک مرتبہ پھر اخباروں' رسالوں کے دفتروں اور مونت مارترے کے قہوہ خانوں میں جوتیاں چٹخانا شروع کر دیا۔ کرسٹین ننھی ایلس کو لیے ویران گھر میں یوں بیٹھی رہتی جیسے کسی ہسپتال کے ویٹنگ روم میں بیٹھی ہو۔ جب نوبت فاقوں تک جا پہنچی تو ایک روز وہ خود کام کی تلاش میں نکل پڑی۔ پیرس دھند میں ڈوبا ہوا تھا اور سڑک پر دو تین قدم کے بعد کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ روزگار دلانے والے دفتر میں مسلسل انتظار کے بعد اسے پتہ چلا کہ شمالی جرمنی کے ایک امیر گھرانے میں کسی آیا کی ضرورت ہے کرسٹین سردی میں ٹھٹھرتی ہوئی گھر واپس آ گئی۔

دن یونہی بے سروسامانی کے عالم میں گزرتے گئے۔ کبھی ایسا ہو جاتا کہ کوئی ریٹائرڈ کرنل مستقبل کا وزیر اعظم اپنے بال بچوں کی رنگین تصویر بنانے کے لیے پال کو بلا لیتا اور اس قلیل معاوضے سے گھر کا خرچ کچھ روز چل نکلتا ورنہ عام طور پر اسے ہر چوتھے روز کسی نہ کسی سے قرض مانگنا پڑتا۔ اسی اثنا میں پال اپنے کام سے لمحہ بھر کے لیے بھی غافل نہ ہوا تھا کھانا ملے یا نہ ملے وہ رات کو بلا ناغہ سٹوڈیو میں کام کرتا مفلسی اور تنگدستی میں اس نے کام کی رفتار تیز کر دی تھی اور وہ ہر رات کوئی نہ کوئی تصویر مکمل کر لیتا لیکن نیچرا اپنی قیمت وصول کرنے سے کبھی نہ چوکتی۔ تین سال کی شبانہ روز پر از مصائب کشاکش کے بعد پال کے بھورے بالوں میں سفید بالوں کی ایک لٹ نمودار ہو گئی اور برش کے پکڑتے وقت اس کی انگلیوں نے اکثر کانپنا شروع کر دیا۔ اس کے اندر قوت مدافعت بتدریج ماند پڑتی گئی۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئیں اور رات کو جب وہ تصویر ختم کر کے اسٹول سے اٹھتا تو اس کا سر چکرانے لگتا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھا جاتا۔ کچھ روز بعد یوں ہوا کہ شام پڑتے ہی بند بند ٹوٹنے لگتا۔ بستر میں لیٹتے ہی بخار چڑھ جاتا اور دن چڑھے بخار تو اتر جاتا لیکن جسم کٹے ہوئے درخت کی طرح جامد و بے حس محسوس ہوتا۔ اس عالم میں بھی پال نے کام کرنا نہ چھوڑا' اس محنت کا معاوضہ اسے اتنا ضرور مل گیا تھا کہ اس کی تصویریں دوسرے مصوروں کے شاہکاروں کے ساتھ پیرس کی مشہور دوکانوں میں آویزاں تھیں۔ لیکن ان کے لیے بھی کوئی گاہک پیدا نہ ہوسکا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کی تصویریں کسی ایک اور منفرد تاثر کی حامل تھیں۔ وہ ہر رنگ کو اس کی انفرادی حثیت عطا کرتا تھا۔ اس کے خیال مختلف رنگوں کا مجموعی تاثر اپنی ایک علیحدہ شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ اکثر بحث کے دوران میں کہا کرتا تھا:

''ہماری کوئی بھی حس طبعی حالت پر قائم نہیں۔ ہم کسی ایک الگ رنگ کی نیچرل کیفیت کا احساس کرنے سے قاصر ہیں۔ زرد رنگ جب رات کو نیم چاکلیٹ رنگ اختیار کرلیتا ہے تو ہم پر سورج کی شعبدہ بازی کھلتی ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نیلا آسمان دراصل کوئی شے نہیں۔ اگر کبھی اس کائنات کے خالق کی تصویر بنائی گئی تو وہ اسی رنگ سے بنے گی جو مختلف رنگوں کا اجتماعی اور آخری رنگ ہوگا۔''

نقوش اور رنگوں کی دنیا میں نئے تجربات کرنے والے اس مفلس آرٹسٹ کی پہلی تصویر جب ایک مشہور تاجر نے خریدی تو وہ خوشی سے ناچنے لگا۔

''وقت آگیا ہے کہ دنیا ہمیں تسلیم کرے''

لیکن دوسرے ہی روز وہ تصویر واپس کردی گئی کیونکہ اسے دیکھ کر تاجر کی بیوی کو ہسٹریا کے دورے پڑنے لگے تھے۔ پال بڑا پژمردہ چہرہ لیے تصویروں والی دوکان سے باہر سڑک پر آگیا۔ اس رات برف باری کے بعد پیرس کے بازاروں میں ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

وہ سردی اور بارش سے بے نیاز دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ٹھونسے سڑک پر چلتا گیا۔ جس وقت وہ گھر پہنچا تو اس کے تمام کپڑے بھیگے ہوئے تھے کرسٹین نے جلدی سے اس کا کوٹ اتارا۔ تولئے سے منہ اور گردن پونچھی۔ ردی کاغذ سلگا کر آگ جلائی اور کافی کے لیے پانی گرم کرنے کو رکھ دیا۔ پال کا جسم ٹھٹھر رہا تھا اور پسلیوں میں ٹیس سی اٹھ رہی تھی۔ گرم گرم کافی چڑھانے کے بعد وہ پسینے میں بھیگ گیا اور اسے کچھ تسکین ہوئی۔ کرسٹین اس کے سرہانے بیٹھی اسے پیار بھری متبسم نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ دوسرے بستر پر ننھی ایلس سو رہی تھی۔

''اب جی کیسا ہے پال؟''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پال نے کچھ اس قسم کی نگاہوں سے دیکھا گویا وہ اسے آخری بار دیکھ رہا ہو۔

''کرسٹین مجھے سگریٹ دینا۔''

سگریٹ سلگانے کے بعد کرسٹین اپنے خاوند پر جھک گئی۔

''ہاں میری کرسٹین''

لیکن پال نے اسے جھوٹ کہا تھا' کیونکہ اسی رات وہ مر گیا۔

پال کی موت کے بعد کرسٹین کے لیے پیرس کے گلی کوچوں میں ہمیشہ کے لیے دبیز' گہری اور ناقابل عبور دھند پھیل گئی۔ یورپ کے اس عظیم الشان شہر کا باغ' ہر بازار ہر قہوہ خانہ اسے پال کی یاد دلاتا تھا۔ کرسٹین نے مجبور ہو کر اپنے باپ کو ایک طویل خط لکھا۔ ایک ماہ بعد اس کے باپ نے اس کے نام فرانس سے برما تک کے اخراجات بھیج دیئے۔ کرسٹین نے جہاز کے ڈیک پر کھڑے ہو کر فرانس کو آخری بار سلام کیا اور اس کا دل پال کی غمگین یاد سے بوجھل ہو گیا۔ جہاز بحیرہ روم کی طرف چل نکلا

کرسٹین نے ایلس کو سینے سے لگا لیا۔ بحیرہ روم کی ہواؤں میں دونوں کے سرخ بال اڑ رہے تھے۔ کرسٹین نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ کھڑکی سے باہر نیلے آسمان کو بھورے بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا اور ناریل اور کیلے کے درختوں پر مینہ کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ اس نے صوفے پر نگاہ ڈالی۔ مسافر جا چکا تھا۔ اس نے رتنا کلی اور شبو کے پھول تپائی پر رکھے اور پیانو پر جا بیٹھی۔ وہ یوں تھکی تھکی سی محسوس کر رہی تھی گویا کہیں دور سے چل کر آ رہی ہو۔ ننھی ایلس پھولوں کا گلدستہ لیے بھاگتی ہوئی اندر آئی۔

''امی۔۔۔۔۔۔۔۔ میں یہ تمہارے لئے لائی ہوں۔''

کرسٹین چونک پڑی۔ اس نے پال کی آواز سنی۔

''میں تمہارے ساتھ رہوں گا کرسٹین۔ ہم پیرس چلے جائیں گے''

کرسٹین نے ایلس کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

مسافر کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اور پیگو سے کوچ کر جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔

ایک روز شام کے وقت وہ برآمدے میں بیٹھا تھا۔ کرسٹین ساتھ والی آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔

''میں صبح رنگون واپس جا رہا ہوں۔''

''اتنی جلدی؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ہاں کرسٹین۔۔۔۔۔۔۔اگر کبھی رنگون آؤ تو مجھے ضرور ملنا۔''

کرسٹین کا سر کرسی کی پشت سے لگا تھا۔اس نے افسردہ نگاہوں سے مسافر کو دیکھا۔

''ضرور ملوں گی''

کرسٹین کا باپ رنگون ایوننگ گزٹ پڑھ رہا تھا۔اس کا چہرہ اخبار کے پیچھے تھا ایکا ایکی وہ چونک کر بولا۔

''جرمن طیاروں کی ڈوور پر بمباری۔۔۔۔۔۔۔لیکن جاپان کیوں چپ ہے' وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکتا۔''

اپنے کمرہ میں پہنچ کر مسافر نے کھانا کھایا' سگریٹ سلگایا اور مسٹر کھوکھر سے ملنے چلا گیا۔واپس آ کر وہ اٹیچی کیس میں ضروری چیزیں بند کرنے لگا۔ کیونکہ رنگون ایکسپریس صبح سوا سات بجے پیگو سے روانہ ہو جاتی تھی۔ چیزیں سنبھال کر وہ بستر میں لیٹا ہی تھا کہ باورچی خانے کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور روجی گوجرانوالے کے خربوزے لیے اندر داخل ہوئی وہ اٹھ بیٹھا۔

''آپ صبح جا رہے ہیں؟''

ہاں۔۔۔۔۔۔۔روجی ہماری جدائی کی نازک گھڑی آن پہنچی ہے۔''

روجی کے ہاتھ میں کوئی شے رومال میں بندھی ہوئی تھی۔

''یہ کیا ہے روجی؟''

روجی نے پوٹلی مسافر کے اٹیچی کیس پر رکھ دی۔

''اسے گاڑی میں کھولیں۔''

مسافر نے بڑی مشکل سے آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک پیدا کر کے کہا:

''روجی تم ہمیشہ میری روح ہو گی۔ جب تک میری جان میں روح ہے اور روح میں جان باقی ہے میں تجھے نہیں بھولوں گا۔ دنیا کی ہر شے سوائے تمہارے مجھے تمہاری یاد دلائے گی۔ اور میں راتوں کو اٹھ کر پکاروں گا۔ روجی۔۔۔۔۔۔۔روجی!۔۔۔۔۔۔۔میری روح افزا''

روجی اور قریب آ گئی اور مسافر کے نتھنوں میں چمڑے کی بو گھسنے لگی۔ روجی کی آنکھیں نمناک تھیں اور ناک پہلے سے زیادہ پھول گئی تھی۔ تپائی پر قریب ہی ٹھنڈی چائے کی پیالی پڑی تھی۔ مسافر نے آنکھ بچا کر چائے میں انگلی ڈبوئی اور پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے لٹکائے۔ روجی نے چہرہ اوپر اٹھایا اور مسافر کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''آپ تو نہ روئیں۔۔۔۔۔۔۔میں جو ہوں رونے کے لیے۔''

''نہیں روحی۔ آج مجھے جی بھر کر رو لینے دو آج میرا کلیجہ پھٹ گیا ہے۔''

اور چائے کے قطرے مسافر کے گالوں پر ڈھلک آئے۔

علی الصبح مسافر تازہ خوشگوار ہوا میں بنگلہ نمبر 13اے سے باہر نکلا تو بادل برسنے پر تلے کھڑے تھے۔ اس نے پھاٹک پر کھڑے ہو کر بنگلے کے مغربی اور مشرقی حصے میں الوداعی نگاہ ڈالی اور تیز تیز قدم اٹھایا سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ رنگون ایکسپریس تیار کھڑی تھی۔ ٹکٹ کٹا کر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا اور گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا۔ جب گاڑی کافی دور نکل گئی واسے ایکا ایک روحی کی دی ہوئی پوٹلی یاد آ گئی۔ وہ سفید رومال کھولنے لگا۔ مسافر ایک دم ٹھٹک سا گیا اور اسے یوں محسوس ہوا گویا اس نے پوٹلی نہیں بلکہ ایک مشرقی عورت کا دل کھول دیا ہو۔

پوٹلی کے اندر دو پراٹھوں میں انڈوں کا حلوہ لپٹا ہوا تھا۔

2 دسمبر 1941 کے روز جاپان نے اتحادیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور 21 دسمبر کو صبح دس بج کر اکیس منٹ پر جاپانی طیاروں نے رنگون پر بمباری شروع کر دی۔ رنگون کے شہریوں کے لیے بمباری بلائے ناگہانی سے کم نہ تھی۔ وہ بدحواس ہو کر گھروں سے باہر نکل آئے اور سڑکوں پر بھاگنے دوڑنے لگے۔ جیٹی پر اسلحہ سے لدا ہوا ایک امریکی جہاز لنگر انداز تھا۔ ایک بم اس کے ڈیک پر جا پھٹا ایک ہیبت ناک دھماکہ ہوا۔ رنگون شہر لرز اٹھا اور آسمان کو گہرے سیاہ رنگ کے گاڑھے دھوئیں نے ڈھانپ لیا۔ شہر میں رات سی چھا گئی اور لوگوں کی چیخ پکار نے وحشت ناک صورت اختیار کر لی۔

22 دسمبر کو جاپانی فوجیں ہانگ کانگ میں داخل ہو گئیں۔ 12 فروری کو سنگاپور خالی کر دیا گیا۔ جنوب مشرق میں مولین کی طرف سے جاپانی فوج کا دباؤ بڑھتا گیا۔ برما کے سرحدی جنگلوں میں جاپانی گوریلا دستے پھیل گئے۔ رنگون پر ہر دوسرے روز بمباری ہونے لگی۔ لوگوں نے رنگون چھوڑنا شروع کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔منکی پوائنٹ' ساؤتھ بیریک' سلیز بیریکس' کلابستی اور رنگون کی بندرگاہ بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ شہر میں ہر تیسری عمارت جل رہی تھی اور سڑکوں پر گہرے گڑھے پڑ گئے تھے۔ جن سے پانی نکل نکل کر بازاروں اور گلیوں میں پھیل رہا تھا۔ حکومت برما اپنا صدر مقام رنگون سے میمیو لے گئی تو لوگوں کے رہے سہے حوصلے بھی ختم ہو گئے۔

جس روز رنگون ریڈیو کے کنٹرول روم پر بم گرا اور اسٹیشن کی آدھی عمارت اڑ گئی' مسافر نے اپنا اٹیچی کیس اٹھایا اور وہ بھی پردم اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاٹگام کے راستے ہندوستان جانے والے ایک پیدل قافلے میں شریک ہو گیا۔ برسات شروع نہیں ہوئی تھی اور لوگوں کو یقین تھا کہ وہ اس خطرناک موسم کی ابتدا سے بہت پہلے برما کے جنگلات میں سے گزر کر چاٹگام پہنچ جائیں گے۔

جس قافلے میں مسافر شامل ہوا اسے اتفاقاً مانڈلے تک ایک مال گاڑی مل گئی۔

پیکو کے سٹیشن پر انجن پانی لینے کے لیے رک گیا۔ یہاں بھی لوگوں کا ہجوم گاڑی کا منتظر تھا۔ گاڑی ابھی پوری طرح رکی بھی نہیں تھی کہ بغیر چھت کے ڈبوں میں بوریا، صندوق، بستر، چارپائیاں اور دیگر سامان پھینکا جانے لگا۔ جو لوگ کھڑے تھے وہ بیٹھ گئے جو بیٹھے تھے وہ کھڑے ہو گئے۔ اس افراتفری اور چیخ پکار کے پر ہول عالم میں مسافر کو کرسٹین کا خیال آ گیا۔ جانے وہ دکھیا، کم گو اور دنیا سے الگ تھلگ رہنے والی عورت کس حال میں ہو گی! معاً اس کی نگاہ کرسٹین کے بوڑھے باپ پر پڑ گئی جو ننھی ایلس کو گود میں لیے سٹیشن ماسٹر کے کمرے کے باہر صندوق پر بیٹھا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے پائپ کا دھواں اڑا رہا تھا اور ننھی ایلس خوفزدہ نگاہوں سے بدحواس لوگوں کو ایک دوسرے کو پکارتے اور ادھر ادھر بھاگتے دیکھ رہی تھی۔

مسافر اچھل کر باہر کود پڑا اور بھاگ کر بوڑھے کے پاس پہنچا۔

"آپ ۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ بھی یہاں" کرسٹین کہاں ہے؟"

بوڑھے نے گھنی بھنویں اوپر اٹھا کر مسافر کو دیکھا اور پائپ جھاڑتے ہوئے دھیمی اور بھدی آواز میں بولا۔

"وہ ہمارے ساتھ نہیں آ سکی۔"

مسافر نے حیرت سے پوچھا:

"مگر وہ اکیلی وہاں کیا کرے گی؟"

ننھی ایلس مسافر کو بالکل اجنبیوں کی طرح تک رہی تھی۔ اس کے خیال میں وہ بھی ان بدحواس اور پریشان لوگوں میں سے ایک تھا۔

بوڑھا کچھ دیر چپ رہا۔ پھر ایک پژمردہ اور پھیکی سی آواز سنائی دی۔

"وہ اکیلی نہیں ہے۔ قبرستان میں اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔"

مسافر کو ایکا ایکی یوں محسوس ہوا جیسے جاپانی طیاروں نے پیکو سٹیشن پر بمباری شروع کر دی ہو۔ وہ وہیں بوڑھے کے پاس بیٹھ گیا اور پھر بوڑھے نے رکی رکی آواز میں اسے بتایا کہ کرسٹین کی صحت دن بدن گرنے لگی تھی اور وہ رات رات بھر جاگتی رہتی۔ جس دن

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رنگون پر جاپانی طیاروں نے بمباری کی اس نے بوڑھے کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیا اور موت کے تاریک غار میں اتر گئی۔ بوڑھا ایلس کو ساتھ لے کر رنگون چلا آیا۔ گذشتہ رات جب اس نے مولمین پر جاپانی حملے کی خبر سنی تو وہ تھوڑا بہت سامان لینے پیکو آ گیا۔

''میرا خیال میمیو جانے کا ہے''

''لیکن میمیو کوئی محفوظ جگہ نہیں۔ بلکہ برما میں کوئی جگہ محفوظ نہیں۔''

''آپ فرانس کیوں نہیں چلے جاتے۔ شاید آپ کو کسی جہاز میں جگہ مل جائے''

''ہونہہ! فرانس۔۔۔۔۔۔'' بوڑھا ایلس کے سرخ بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''فرانس اور میمیو میں کوئی فرق نہیں۔۔۔۔۔۔ وہاں جرمن طیارے ہیں اور یہاں جاپانی' فی الحال میں میمیو میں رہوں گا اور اگر وہاں سے بھی بھاگنا پڑا تو میں واپس پیکو والے پرانے مکان میں آ جاؤں گا اور ایلس کو کرسٹین کے بستر میں سلا کر خود برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر جاپانی سپاہیوں کا انتظار کروں گا۔۔۔۔۔۔ غالباً تم ہندوستان جا رہے ہو؟''

''جی ہاں مانڈلے سے ہمیں پیدل سفر کرنا ہوگا۔ چاٹگام سے ریل مل جائے گی۔''

انجن نے وسل دیا۔

''خدا حافظ میرے بیٹے۔۔۔۔۔۔ ہم ایک دوسرے کو یاد رکھیں گے۔''

مسافر نے بوڑھے سے ہاتھ ملایا۔ ننھی ایلس کے سرخ بال چومے اور گاڑی کی طرف چل پڑا۔

ہندوستانی' بنگالی' چینی' مارواڑی' سورتی' پنجابی' مدراسی' سنہالی اور برمی لوگوں سے بھری ہوئی مال گاڑی پیکو جنکشن سے آگے کی طرف چلنے لگی۔ مسافر نے لوگوں کے سروں' صندوقوں اور بوریوں کے اوپر سے بوڑھے فرانسیسی اور ننھی ایلس پر آخری نگاہ ڈالی۔ بوڑھے نے اپنا سر دیوار سے لگا رکھا تھا اور ننھی ایلس اس کی گود میں سمٹی اسی طرح سہمی سہمی ویران آنکھوں سے ادھر ادھر تک رہی تھی۔

◆◆◆

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سہیلی کے نام خط

میں جانتی ہوں میرا یہ خط تمہیں کبھی نہیں ملے گا۔

اس لیے نہیں کہ میں اسے ڈاک میں نہیں ڈالوں گی۔ بلکہ اس لیے کہ تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ تم نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اور ایک عرصہ ہوا اس تماشا گاہ سے رخصت ہو چکی ہو۔ میرے یہ الفاظ تم تک کبھی نہ پہنچیں گے۔ میری یہ بات تم کبھی نہ سن سکو گی۔ اس کے باوجود میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں اور تمہیں آواز دے رہی ہوں اور میرے بازو اپنے آپ تمہاری جانب اٹھ رہے ہیں۔

میں یہ خط اپنے مضافاتی مکان کی پشت پر باغ میں بیٹھی لکھ رہی ہوں۔ سورج غروب ہو رہا ہے۔ دھوپ کا رنگ سنہری ہو کر پھیکا پڑ رہا ہے۔ آم اور جامن کے پیڑوں میں چڑیاں شور مچا رہی ہیں۔ باغ کے پرلے کنارے پر میرے بچے کھیل رہے ہیں۔ ان کی مسرور آوازیں اور مدھم قہقہے خزاں کی اداسی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ درختوں نے ایک ایک کر کے اپنے سارے پتے جھاڑ دیئے ہیں اور میں ان گرتے پتوں کے ساتھ اپنے دیہاتی مکان میں آ گئی ہوں۔ جب سے تم جدا ہوئی ہو میں خزاں کا ہر موسم اپنے اسی مکان میں بسر کرتی ہوں۔ خزاں جب بھی ویران درختوں سے گزر کر آئی ہے اس نے مجھے زرد پتوں کی سیج پر تمہاری یاد میں سوگوار دیکھا ہے۔ اس موسم میں تم مجھے بہت یاد آتی ہو۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تم آخری بار مسعود کے ساتھ مجھے اسی مکان پر اسی موسم میں ملی تھیں اور زرد گھاس پر اسی طرح خشک پتے گر رہے تھے کہ میں نے سنا تم نے خودکشی کر لی ہے اور اب تم کبھی اس دنیا میں نہیں آؤ گی۔۔۔۔۔۔ اس دنیا میں جہاں مسعود ناہید کے ساتھ گلمرگ کی برفباری میں آتشدان کے پاس بیٹھا کافی پی رہا تھا اور تم سینے ٹوریم کی برف پوش ویران تنہائیوں میں اپنی بجھی ہوئی محبت کی راکھ میں افسردہ یادوں کے انگارے کرید رہی تھیں۔ تمہاری موت کی خبر نے میرے دل پر گہرا اثر کیا تھا میں تمہاری تصویر سامنے رکھ کر روتی رہی تھی اور تمہارے خوبصورت خط کھول کر تمہیں آوازیں دیتی رہی تھی۔ میں پاگل سی ہو گئی تھی۔ مجھے تمہاری موت کا یقین نہیں آتا تھا۔ میں ہر صبح یہ امید لے کر بیدار ہوتی کہ تم مجھ سے ملنے ضرور آؤ گی اور ہر رات دل کو یہ سمجھاتے ہوئے سو جاتی کہ صبح تمہارا خط ضرور آئے گا جس میں تم نے لکھا ہو گا:

''مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ کل نہ آ سکی۔ مسعود مجھے زبردستی میوزک کانفرنس میں لے گیا۔ تم تو جانتی ہو مجھے اس کا کتنا خیال رہتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔تم مجھے معاف کر دینا اس اتوار کو ضرور آؤں گی۔

تمہاری۔۔۔۔۔۔۔"

لیکن کئی اتواریں گزر گئیں اور تم نہ آئیں۔ میں نے برسات میں گرج گرج کر برسنے والے بادلوں سے تمہارا پتہ پوچھا۔ میں نے سنسان راتوں کے اندھیرے میں جگنوؤں کو تمہاری تلاش میں روانہ کیا۔ میں نے چمکیلی صبحوں سے تمہارا نام ونشان پوچھا۔ میں نے ڈوبتے سورج کے ہاتھوں تمہیں پریم سندیسے بھیجے اور میں نے بہار کے پہلے شگوفے سے تمہارا ذکر چھیڑا اور اداس چاندنی کو تمہارے گیت سنائے اور جھلملاتے تاروں کی سیج پر تمہیں ڈھونڈا مگر تمہیں نہ پاسکی۔ تمہیں کہیں نہ مل سکی۔ بادل روتے ہوئے میرے اوپر سے گزر گئے۔ رات شبنم کے آنسو چھوڑ کر ڈھل گئی۔ شگوفے زرد پتے میری جھولی میں ڈال کر رخصت ہو گئے اور تارے دھندلے سویروں کے غبار چھوڑ کر بجھ گئے۔ میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر تمہیں یاد کرتی' تمہارے درد بھرے سوگوار خط پڑھتی اور رومال آنکھوں پر رکھ کر چپکے چپکے رویا کرتی۔

پھر بھی۔۔۔۔۔۔۔ کبھی کبھی نہ جانے کیوں مجھے اس بات سے تسکین سی ہوتی کہ تم نے خودکشی کی ہے اور اس زندگی کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹا ہے جس نے تمہارے ساتھ سوتیلی ماں ایسا سلوک کیا تھا۔ میں جانتی ہوں زندگی کے مصائب سے فرار حاصل کرنے کا یہ انداز سراسر احمقانہ ہے اور وہ لوگ جو خودکشی کر چکے ہیں اگر اس دنیا میں واپس آجائیں تو انتہائی گرمجوشی سے زندگی بسر کریں۔ اس کے باوجود میں یہ سمجھتی ہوں کہ تم زندگی کے ساتھ اس سے بہتر سلوک نہیں کر سکتی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی حادثاتی ہونے کے باوجود اتنی ارزاں نہیں ہے اور وہ لوگ جو سالہا سال کے دقیق مطالعے کے بعد اس فیصلے پر پہنچتے ہیں کہ دنیا دکھوں کا گھر ہے یقیناً قابل احترام لوگ ہوتے ہیں۔ مگر اس کے باوصف یہ لوگ زندہ رہتے ہیں اور زندگی کا حتی المقدور لطف اٹھاتے ہیں۔ میرے نزدیک انہیں اپنے نظریات سے قطعاً ہمدردی اور عقیدت نہیں ہوتی۔ ان کا زندہ رہنا ان کے نظریات کی تردید کرتا ہے۔ لیکن جب میں تمہاری خودکشی پر غور کرتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ تم وہ عورت تھیں جس نے اپنے اس نظریئے کا "کہ دنیا دکھوں کا گھر ہے" سچے دل سے احترام کیا۔

میری بدنصیب سہیلی! موت تمہارے درد کی آخری دوا تھی۔

ناہید نے تمہارے دل پر جو گہرے گھاؤ لگائے تھے ان کا علاج اسی مرہم میں پوشیدہ تھا۔ تمہیں تو ناہید پر بہت مان تھا۔ تم کہا کرتی تھیں۔ ناہید میری بڑی غم خوار ہے۔ وہ میری بڑی اچھی سہیلی ہے۔ وہ زندگی کے تاریک لمحات میں بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے میرا بہت خیال ہے' ہاں۔ اسے تمہارا واقعی بہت خیال تھا۔ اپنے رنگ برنگ ریشمی کپڑوں اور تیز ناخنوں سے بھی بڑھ کر۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے ناخن بڑے اہتمام سے بنایا کرتی تھی اور مجھے ان سے ہمیشہ خوف آتا تھا۔ ان کے سرخ' نوکدار کنارے مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہوا کرتے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ ناہید تمہاری اچھی سہیلی ہے۔ تمہیں یاد ہے یہ جاننے کے باوجود کہ تم مسعود سے پیار کرتی ہو اور تمہاری اس سے شادی ہونے والی ہے وہ اسے کتنے عجیب عجیب خط لکھا کرتی تھی؟ ان خطوں میں دبی دبی ہوس کی آگ کا دھواں ہوتا تھا جس نے بعد میں ایک دم بھڑک کر تمہارے خوبصورت کمرے میں آگ لگادی اور اس کی کھڑکیوں پر جھکی ہوئی انگور کی بیلیں' دراوزوں کے پردے اور دیواروں کی تصویریں اور گلدانوں کے پھول جل کر راکھ ہو گئے۔ کاش تمہیں بھی ناہید ایسی محبت کرنے کا سلیقہ آ جاتا! کاش تم بھی مسعود کے سامنے پلکیں بنا کر اور گریبان کھول کر بیٹھ سکتیں! تمہیں بھی بات بات پر پلکیں جھپکانے اور خاص انداز میں آنکھیں سکیڑنے کا ڈھنگ آ جاتا اور تم بھی کھلی آستین اوپر چڑھا کر اپنا گول گول بازو اس کے آگے پھیلا کر کہہ سکتیں۔

''دیکھئے۔۔۔۔۔۔ یہاں ٹیکہ لگا تھا' دیکھئے کس طرح نشان پڑ گیا ہے۔''

کاش تم بھی مردوں کو بہلانے کے انداز سے واقفیت ہوتی۔

ناہید ان کاموں میں ماہر تھی۔ وہ جب مسعود کے ساتھ ہوتی اس کی قمیض کا گریبان کھلا ہوتا اور اس کا بلاؤز صاف نظر آ رہا ہوتا اور نیم سبز مدور چھاتیوں کی ڈھلوانیں دکھائی دے رہی ہوتیں۔ مسعود انہیں ڈھلوانوں پر سے پھسل کر کہیں گم ہو گیا تھا اور تم اسے آوازیں ہی دیتی رہ گئی تھیں۔ وہ خاص انداز سے بات کرتی اور اس سے بھی زیادہ خاص انداز سے مسکراتی۔ لپ سٹک کی تہہ اس نے آدھ گھنٹے کی محنت سے جمائی ہوتی۔ اس روز اس کی جرابوں میں بھی ایوننگ ان پیرس کی مہک بسی ہوتی۔ دوسری طرف تم جب مسعود سے ملنے جاتیں تو تمہاری قمیص کے کنارے ادھڑے ہوتے اور تم اس کے سامنے ہی ان کی مرمت کرنے بیٹھ جاتیں۔ تمہارے سینڈل کے فیتے اکثر ٹوٹے رہتے۔ تمہارے ایک ہاتھ میں سکول کی کتابیں ہوتیں اور دوسرے ہاتھ میں روٹی لے جانے والا ڈبہ اور تمہاری داہنی انگلیوں اور کپڑوں پر نیلی روشنائی کے دھبے ہوتے۔ تم نے مسعود کے سامنے کبھی لپ سٹک استعمال نہیں کی تھی۔ تم نے کبھی اپنی پلکوں پر برش نہیں پھیرا تھا۔ تمہارے ناخنوں پر کیوٹکس کی بجائے سوکھا ہوا آٹا جما ہوتا تھا اور تمہارے بالوں سے ایوننگ ان پیرس کی بجائے گائے کے مکھن کی بو آیا کرتی تھی اور تمہاری قمیضوں کے گریبان تنگ ہوتے تھے اور تمہاری سیدھی سادی مانگ درمیان سے نکلی ہوتی تھی اور تم کتابیں میز پر اور روٹی کا ڈبہ زمین پر رکھتے ہی مسعود کو بتانے لگتیں:

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''آج میں لسی کے دو گلاس پی کر آئی ہو۔ آج صبح میں نے خدا سے دعا مانگی تھی کہ تم پاس ہو جاؤ۔۔۔۔۔۔۔رات چاندنی کتنی خوبصورت تھی مسعود! کاش تم اس وقت میرے پاس ہوتے اور میں تمہاری گود میں سر رکھ کر سو جاتی۔۔۔۔۔۔''

بالوں میں گائے کا مکھن ڈال کر نیلی چاندنی کے گیت گانے والی پیاری سہیلی! ایک ہاتھ میں روئی کا ڈبہ اور دوسرے ہاتھ میں گلاب کے شگوفے تھام کر چلنے والی غریب لڑکی! کاش تمہارے ناخنوں پر جما ہوا آٹا کیوٹکس کی چمک میں بدل سکتا اور تمہارے بالوں میں مکھن کی بجائے یارڈلے کی مہک ہوتی اور تمہاری قمیضوں کے گریبان کھلے ہوتے' تمہاری چھاتیاں نیم برہنہ ہوتیں اور تمہارے ہونٹوں پر عارضی سرخی ہوتی اور تمہارے دل میں ہوس کی دلدل اور آنکھوں میں بھوک کی چمک اور ذہن میں مردہ لاشوں کے گلے سڑے انبار ہوتے۔۔۔۔۔۔! پھر شاید تیری محبت کو سنگسار نہ کیا جاتا۔ پھر شاید تیرے ایتھنز میں سقراط کو زہر نہ ملتا اور تیرے کنعان میں یوسف ایک اٹی پر نہ بکتا اور تیرے یروشلم میں پیغمبروں پر پتھر نہ پھینکے جاتے۔ تمہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ جاء نماز کا خیال آ جاتا تھا جس پر پھیکے رنگوں کے گنبد اور مینار بنے ہوں۔ مسعود کو نماز روزے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ناہید اگر سینما ہال کے باہر فروخت ہونے والا فلم کا پلاٹ تھی تو تم کسی مقبرے کے طاق میں رکھا ہوا سپارہ تھیں۔ وہ اگر بلیک اینڈ وائیٹ کا سگریٹ تھی تو تم مسجد میں سلگنے والی اگربتی تھیں۔ وہ چمکنے والا داغ تھی تو تم بجھی ہوئی روشنی' وہ حمام سوپ کی جھاگ تھی تو تم کچے دودھ پر آیا ہوا مکھن' وہ مانٹی کارلو کا پرشور بازار تھی تو تم بیت المقدس کی کوئی پرسکوں گلی' وہ کسی الٹرا ماڈرن ہوٹل کا بیئر روم تھی اور تم الحمراء کے محلات کا کوئی افسردہ خاموش دریچہ۔۔۔۔۔۔۔جس پر جھکی ہوئی بیلوں کی ٹہنیاں سیاہ پڑ گئی ہوں اور جس کے پتھروں میں جگہ جگہ گھاس اگ آئی ہو۔ تمہارے اور ناہید میں بہت فرق تھا۔ زمین و آسمان کا فرق تھا۔ سینڈل اور دوپٹے کا فرق تھا۔ تم روئی کا ڈبہ اٹھاتی تھیں جس میں پراٹھے ہوتے تھے' مکھن ہوتا تھا اور دودھ میں ابلی ہوئی میٹھی گاجریں ہوتی تھیں۔ اور ناہید سرخ پرس تھام کر مسعود کے پاس جایا کرتی تھی اس پرس میں ناخن رگڑنے والی ریتی' بھنویں بنانے والی پنسل' نیل پالش' لپ سٹک' چھوٹا سا آئینہ' عشقیہ ناولوں سے لئے ہوئے جملے' گھٹیا قسم کے شعر' مصنوعی قہقہے' جھوٹے آنسو اور چکیلی باتوں کے کھوٹے سکے ہوتے تھے۔ اور میری اچھی سہیلی! محبت کو مکھن نہیں لپ اسٹک اپنی طرف کھینچتی ہے۔ تم دودھ میں ابلی ہوئی گاجریں کھاتی رہیں اور ناہید کے عشقیہ مکالموں نے مسعود کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ تمہارا مکھن ڈبے میں بند میز پر پڑا رہا اور ناہید کی لپ اسٹک مسعود کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ تم خدا سے مسعود کے پاس ہونے کی دعائیں مانگتی رہیں اور مسعود تم سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں سوچتا رہا اور ایک دن جب تم بڑے چاؤ سے انڈوں کا حلوہ بنا کر مسعود سے ملنے گئیں تو تمہیں زرد کاغذ کا ایک پرزہ ملا۔ جس پر لکھا تھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''میں امتحانوں میں مصروف ہوں۔ایک ماہ بعد ملوں گا۔''

(مسعود)

تمہارا دل بیٹھ سا گیا۔اس سے پیشتر تو مسعود نے کبھی امتحانوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔اس سے پہلے وہ بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔اس سے پہلے تو وہ دونوں مل کر ''اوتھیلو'' اور ''جین آئیر'' کی سٹڈی کیا کرتے تھے۔تمہارے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگتے۔تم افسردہ سی ہو کر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔پھر تم نے سوچا۔شاید مسعود ٹھیک کہتا ہے۔وہ تنہائی میں سٹڈی کرنا چاہتا ہے۔اسے تنہائی کی ضرورت ہے۔مجھے اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔میں اسے ایک ماہ بعد مل لوں گی۔ایک مہینہ کی بات ہی کیا ہے۔ایک مہینہ تو یوں گزر جائے گا۔

تم واپس اپنے گھر آ گئیں۔پورا ایک مہینہ ناہید اور مسعود نے امتحانوں کی تیاری میں گزارا۔وہ تقریباً بلا ناغہ لارنس کی گھنی چھاؤں والے درختوں تلے بیٹھے کراسکنامکس کی تھیوریاں حل کرتے۔چڑیا گھر میں جنگلی بندروں کے پنجروں کے سامنے کھڑے ہو کر شیکسپیئر کے مکالمے دوہراتے اور شملہ پہاڑی کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر تمہارے ٹوٹے ہوئے سینڈل' بند قمیصوں' سیاہی لگے ہاتھوں اور مکھن لگے بالوں کا مذاق اڑاتے۔اور ایک ماہ بعد جب تم مسعود سے ملیں تو وہ پہلا مسعود نہیں تھا۔پہلا مسعود مر چکا تھا۔اور اس کی جگہ جس مسعود نے لی تھی وہ ناہید کا مسعود تھا۔لیکن تم بے خبر تھیں۔تم نے اسے پلنگ پر نیم دراز کچھ پڑھتے دیکھا اور تمہارا چہرہ مسرت سے چمک اٹھا اور تم خوشی سے چھلکتا ہوا دل لیے والہانہ انداز میں مسعود کی طرف بڑھیں اور اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

''ہائے مسعود میں نے ایک ماہ نہیں ایک ہزار سال گزارے ہیں۔خدا کے لیے تم مجھ سے جدا نہ ہوا کرو۔پھر میرا کسی کام میں جی نہیں لگتا۔پھر پھر میں بڑی اداس ہو جاتی ہوں۔پھر میں بہت روتی ہوں۔''

اور پھر مسعود نے ناک سکیڑ کر تمہیں الگ ہٹاتے ہوئے کہا:

''اف توبہ۔۔۔۔۔۔۔یہ تم گنواروں کی طرح بالوں میں مکھن کیوں لگاتی ہو؟''

اور تم ہنس پڑیں تم کچھ نہ سمجھ سکیں۔تم نے کہا۔

''میں کیا کروں' ہمارے ہاں گائے جو ہے اور امی کہتی ہے مکھن لگانے سے بال لمبے ہوتے ہیں۔وہ مجھے زبردستی پکڑ کر اس کی مالش کر دیتی ہے۔''

''تو پھر میرے کپڑے تو خراب نہ کیا کرو۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تم پیچھے ہٹ گئیں۔ تمہارے دل کو بڑا دھچکا لگا۔ یہ مسعود کو کیا ہو گیا تھا؟ پہلے تو اس نے کبھی ایسی باتیں نہ کی تھیں۔ تم اس خیال سے روٹھ کر چلنے لگیں کہ مسعود تمہیں منالے گا۔ تم اس امید سے برقع پہننے لگیں کہ وہ تم سے برقع چھین لے گا۔ تم یہ آس لیے دروازے کی طرف بڑھیں کہ وہ اٹھ کر راستہ روک لے گا۔ مگر تمہارے سب خیال' تمہاری سب امیدیں تمہیں دھوکا دے گئیں۔ کسی نے تمہارا ہاتھ نہ پکڑا' کسی نے تمہارا راستہ نہ روکا اور کوئی تمہیں منانے کے لیے آگے نہ بڑھا۔ تم کتنی دیر سیڑھیوں میں کھڑی رہیں۔

شاید کوئی آئے شاید کوئی آئے

لیکن کوئی نہ آیا اور تمہاری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور تم ٹھنڈے ہاتھ پاؤں لیے اس گھر سے باہر نکل آئیں۔ تمہیں توقع تھی کہ مسعود تمہیں خط ضرور لکھے گا اور تم سے اپنے توہین آمیز رویے کی معافی مانگے گا۔ ایک دن' تین دن گزر گئے اور ان پہاڑیوں کے عقب سے کوئی سورج طلوع نہ ہوا جن کی چوٹیوں پر کھڑے ہو کر تم نے درخشاں صبحوں کا خیر مقدم کیا تھا اور ان وادیوں میں پھر کوئی نغمہ بلند نہ ہوا جہاں چشموں پر بیٹھ کر تم نے چرواہوں کے گیت سنے تھے۔ تم نے ایک ماہ تک ضبط کیا۔ لیکن آخر بند ٹوٹ گئے اور سیلاب کی کف اڑاتی موجیں اینٹوں' پتھروں' تختوں' اور درختوں کو اچھالتی آگے نکل گئیں' اور تم مسعود کو منانے چل پڑیں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قدرت کو ہمیشہ کچھ اور ہی منظور ہوتا ہے۔ تم سیڑھیوں چڑھ رہی تھیں اور تمہارا دل تمہارے حلق کے بالکل قریب دھڑک رہا تھا۔ مسعود کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ تم نے دل پر ہاتھ رکھ کر اپنا سانس درست کیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستک دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ تم نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہی خموشی۔

تم نے سوچا شاید مسعود سو رہا ہو۔ تم نے ذرا زور سے دستک دی۔ کسی نے آہستہ چٹخنی اتار کر دروازہ کھول دیا۔ اس سے پیشتر کہ مسعود تمہیں کچھ کہے تم بے دھڑک آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئیں اور اس کے بازوؤں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''مجھے معاف کرو۔۔۔۔۔۔۔۔میں بڑی بری ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔میں بڑی گنوار ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔مجھے۔۔۔۔۔۔۔۔معاف کردو۔۔۔۔۔۔۔۔''

مسعود بڑا پریشان تھا۔ تمہاری آواز کانپ رہی تھی اور کمرے میں ایوننگ ان پیرس کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ تمہاری ہچکی بندھ گئی۔ مسعود تمہیں دلاسا دے رہا تھا۔ اس نے تمہارا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا:

''میری اچھی! میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ دیکھو ابھی تم جاؤ۔

کل ضرور آنا۔ پھر تم سے۔۔۔۔۔۔۔۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اچانک تمہاری نگاہ صوفے پر گئی۔ اس کے پاؤں میں قالین پر ناہید کا سرخ پرس اوندھے منہ پڑا تھا۔ تم ایک دم سن ہو گئیں۔ تمہاری ہچکی رک گئی تمہارے آنسو تھم گئے اور تمہارے دل ڈوب سا گیا اور تم وہیں میز پر بیٹھ گئیں اور تم نے مسعود سے پانی مانگا اور اسے پیئے بغیر اٹھ کھڑی ہوئیں اور سیڑھیوں میں تمہیں چکر سا آ گیا اور تم تانگے میں گر کر اپنے گھر آ گئیں۔

دوسرے روز مجھے پتہ چلا کہ تم بیمار ہو۔

میں تمہاری عیادت کو گئی۔ تم پلنگ پر منہ دیوار کی طرف کیے چپ چاپ لیٹی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں نے تمہارے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی سے تمہارا منہ اپنی طرف کیا اور میں کانپ گئی۔ تمہارا رنگ ہلدی ایسا زرد تھا اور چہرہ ایک دم اتر گیا تھا۔ تم میرے گلے سے چمٹ گئیں اور ہم دونوں دیر تک روتی رہیں۔ تم نے مجھے سارے واقعات سنائے اور میں نے تمہیں تسلیاں دیتے ہوئے کہا' مسعود تم سے محبت نہیں کرتا تھا۔ اگر اسے محبت ہوتی تو وہ تمہیں چھوڑ کر ناہید کے پاس نہ جاتا۔ مرد اسی طرح محبت کرتے ہیں۔ ان کی محبت ہم عورتوں سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ وہ محبت کو ایک ضرورت سمجھتے ہیں اور ہمارے لیے یہ زندگی بسر کرنے کی اہم ترین وجہ ہے۔

تم نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا تھا:

''لیکن ۔۔۔۔۔۔۔ ناہید کا میں نے کیا بگاڑا تھا؟ وہ تو میری بڑی غم خوار تھی۔ وہ تو میری دوستی کا دم بھرتی تھی۔ اس نے مجھے موت کی گھاٹیوں میں کیوں دھکیل دیا؟ اس نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ اسے تو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟ کیا۔۔۔۔۔۔۔ کیا میں بری ہوں نزہت؟ کیا میں واقعی بری ہوں؟ لیکن نزہت میں نے تو کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔ میں تو ہر فقیر کو کچھ نہ کچھ دیا کرتی ہوں۔ میں نے تو ایک دن اپنا سارا کھانا ایک بوڑھے بھکاری کو کھلا دیا تھا۔ پھر۔۔۔۔۔۔۔ پھر یہ مجھے میرے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے نزہت؟ کس گناہ کی؟''

میں ناگ پور میں تھی۔ میں نے تمہیں کئی خط لکھے۔ کوئی جواب نہ آیا۔ الہ آباد میں اچانک تمہاری بڑی بہن سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ تم سینی ٹوریم میں ہو اور ناہید' مسعود کے ہمراہ نگر گ چلی گئی ہے۔ میں تمہارے پاس نہ پہنچ سکتی تھی۔ میں نے تمہیں بڑا طویل خط لکھا۔ کچھ دنوں بعد تمہارا جواب آیا۔ خط دیکھتے ہی میرے آنسو نکل پڑے۔ کتنی مدت بعد تمہارے پیارے ہاتھوں سے لکھا ہوا اپنا نام دیکھا تھا۔ کھول کر پڑھا تو آنسوؤں کی جھڑی سی لگ گئی۔ خط پر جا بجا نیلی روشنائی کے چھوٹے چھوٹے دھبے پڑے تھے۔ تمہیں لکھتے لکھتے قلم چھڑکنے کی عادت تھی ناں۔۔۔۔۔۔۔ لیکن تمہاری تحریر کی شگفتگی کہیں غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ بجھی بجھی'

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھکی تھکی سی پژمردگی نے لے لی تھی۔ تمہارے اس آخری خط کے بعض جملے ابھی تک میرے حافظے میں محفوظ ہیں اور مرتے دم تک رہیں گے۔ تم نے لکھا تھا:

''نزہت! جو کچھ ہوا مجھے اس کا یقین نہیں آ رہا میرے سورج کی تمام روشن کرنیں راکھ کی لکیروں میں بدل گئی ہیں۔ میرے سارے درخت ٹھنڈی چھاؤں سے محروم ہو گئے ہیں۔ میرے دل کے تاج محل میں چاروں طرف اندھیرا ہے اور میرے درختوں کے پتے عین بہار میں جھڑنا شروع ہو گئے ہیں۔ مجھے اس باہر کی خزاں سے خوف آتا ہے۔ نزہت! آج میرے گیتوں نے دم توڑ دیا ہے اور میری محبت کا چہرہ اداس ہے اور میں تمہیں شدت سے یاد کر رہی ہوں۔

کاش تم میرے پاس ہوتیں اور میں تمہارے ساتھ کھڑی ہو کر اپنی اداس محبت کے چہرے پر مقدم چشموں کا پانی چھڑکتی اور مردہ گیتوں کے سرہانے غمگین یادوں کے دیئے روشن کرتی۔

کاش ایسا ہو سکتا! کاش ایسا ممکن ہوتا۔۔۔۔۔۔''

دوسرا خط تمہاری بڑی بہن کی طرف سے آیا جس میں تمہاری موت کی درد انگیز خبر تھی۔ میرے دل پر چھری سی چل گئی۔ میری آنکھوں میں اس خوبصورت ملاقات کی تصویر پھر گئی جب تم اور مسعود مجھے ملنے ہمارے اسی دیہاتی مکان میں آئے تھے۔ ہم نے اسی پلاٹ میں شام کی چائے پی تھی۔ بہار کا آغاز تھا۔ پیڑ پودوں پر شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ درختوں کی گرم گرم مہک سے فضا بوجھل تھی۔ ہم درختوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر ٹہل رہے تھے۔ تم کس قدر خوش تھیں۔ تمہارا چہرہ دمک رہا تھا۔ تم آزاد ہرنی کی طرح بھاگ کر کبھی اس جھاڑی میں چھپ جاتیں اور کبھی اس درخت سے کوئی شگوفہ توڑ کر لے آتیں۔ تم نے رنگ برنگ نازک پھولوں کا ڈھیر سا جمع کر لیا تھا۔ مسعود بھی بہت خوش تھا۔ وہ آلوچے کے ایک پیڑ کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا اور اس نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا:

''دیکھو لالہ! یہ آلوچے کے پھول ہیں۔۔۔۔۔۔''

اور تم نے کتنے ہی پھول توڑ کر اپنے بالوں اور مسعود کے کوٹ میں اور میرے بالوں میں لگا دیئے۔ یہ ملاقات مجھے خواب سا معلوم ہو رہی ہے۔ اس ملاقات کو آج پچیس سال گزر چکے ہیں۔ ناہید پانچ بچے چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے جہاں زندگی کے کچھ سال گزارنے کے لیے اس نے تمہاری محبت کو بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا۔ مسعود اپنی دوسری بیوی کے ساتھ افریقہ کے کسی شہر میں جا بسا ہے۔ اس کا نصف جسم فالج سے بیکار ہو چکا ہے اور وہ اپنے بیٹوں کے رحم و کرم پر زندگی گزار رہا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میری رخصتی کی گھڑی بھی قریب آ رہی ہے۔

وقت برق رفتار گاڑی کی مانند میرے اوپر سے گزر گیا ہے اور اس کے انجن کی راکھ سے میرے بال سفید ہو گئے ہیں۔ آج میں بڑی شدت سے تمہیں یاد کر رہی ہوں۔ شاید اس دنیا میں یہ میری آخری خزاں ہو۔

اب دھوپ لمبے درختوں سے اترنے لگی ہے۔ میرے بچے کھیلتے کھیلتے میرے قریب آ گئے ہیں۔ مری بوڑھی آنکھوں میں تمہاری اداس اداس آنکھوں والی شکل گھوم رہی ہے۔ میری پیاری سہیلی مجھے بتاؤ' کیا مرنے کے بعد میں تمہیں دیکھ سکوں گی' تمہاری سوگوار آواز سن سکوں گی؟ کیا تم مجھے پہچان سکو گی؟ میں تو بوڑھی ہو گئی ہوں' میں تمہیں یہ الفاظ لکھ رہی ہوں اور میری چھوٹی لڑکی گیند ہاتھ میں پکڑے مجھے جھک کر دیکھ رہی ہے اور پوچھ رہی ہے۔

''امی! تم رو کیوں رہی ہو؟''

◆◆◆

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھول گرتے ہیں

کیپٹن نے گرم کیتلی میں چینی چائے کی پتیاں ڈالیں تو باہر بارش شروع ہو گئی۔

ہری بھری ڈھلوانوں اور اونچے نیچے سبز ٹکوں پر چرتی ہوئیں بھیڑ بکریاں ممیانے لگیں۔ پہاڑی چرواہے انہیں ہنکاتے ہوئے چنار اور رنگ کے گنجان درختوں تلے لے آئے۔ شام ابھی نہیں ہوئی تھی لیکن بادلوں کی وجہ سے وقت سے بہت پہلے اندھیرا سا ہو گیا۔ وادی پر دھند کی چادر سی پھیل گئی تھی جس میں ڈھلوانوں پر اگے ہوئے درخت اور سلیٹی رنگ کی تکونی چھتوں والے مکان سپید سیاہی چوس پر دھبے سے معلوم ہو رہے تھے۔ کھلی کھڑکی میں سے پہاڑوں پر چلنے والی ٹھنڈی اور نمدار ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس ہوا میں گیلے پتھروں کی بو سے لے کر چیڑھ کی چوٹیوں پر جھولنے والے نوکیلے جھومروں کی خوشبو شامل تھی۔ کمرے میں پہنچ کر یہ خوشبو چینی چائے کی مہک سے مل جاتی اور کیپٹن نے اپنے دوست ڈاکٹر صدیقی کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھے کئی بار محسوس کیا کہ وہ پرانی فرنچ رم میں اناناس کا رس ملا کر پی رہا ہے۔ وہ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے درمیان چھٹیوں کے پندرہ دن گزار کر اپنے فوجی ٹھکانے پر واپس جا رہا تھا اور ڈاکٹر کے از حد اصرار پر رات کی رات وہاں ٹھہر گیا تھا۔ علاوہ ازیں اس قدر خراب موسم میں وہ پہاڑ کی بھیگی ہوئی ڈھلوانی سڑکوں پر جیپ چلانے کا خطرہ مول لینے پر تیار نہ تھا۔ اور پھر ڈاکٹر صدیقی نے اسے خالص چینی چائے پلانے کا لالچ دیا تھا۔ جو ایک دوست نے اسے ہانگ کانگ سے بھیجی تھی۔ کیپٹن چائے کا اتنا رسیا نہیں تھا۔ لیکن یوتانگ کی چند ایک کتابوں میں اس نے اس کے متعلق اتنا پڑھا تھا کہ وہ پہاڑ پر پہنچ کر گرتی بارش میں چینی چائے کا ایک پیالہ ضرور چکھنا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر صدیقی اس پہاڑی مقام کے ایک چھوٹے سے غیر سرکاری سینی ٹوریم کا انچارج تھا۔ اور اسے ہسپتال کے پچھواڑے مختصر سا مکان رہنے کو ملا ہوا تھا ڈاکٹر کی عمر پینتیس کے قریب تھی اور اس کی کنپٹیوں پر سپید بالوں کی لکیریں نمودار ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اس کے چند ایک اپنے اصول اور نظریات تھے جن پر وہ سختی سے کاربند تھا۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ عمر بھر شادی نہیں کرے گا اور آزاد رہ کر بیماروں کی خدمت کرے گا۔ اگرچہ وہ مضبوط جسم کا آدمی نہیں تھا مگر اس کی صحت کافی اچھی تھی اور عمر میں بہت کم بیمار ہوا تھا۔

یہ دونوں دوست آتشدان کے قریب آرام سے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر بڑے انہماک سے سگریٹ بنا رہا تھا۔ اور کیپٹن چینی چائے سے بھری ہوئی کیتلی کو پھولدار ٹی کوزی سے ڈھانپنے کے بعد پیالیوں میں شکر ڈال رہا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''کتنے چمچ ڈاکٹر؟''

''صرف ڈیڑھ''

بارش زیادہ تیز ہو گئی تھی اور کھڑکی میں سے اکتوبر کی سرد ہوا کے تیز جھونکے اندر آ رہے تھے۔ کھڑکی پر جھکی ہوئی پک اینڈ پک کی سرخ کلیوں والی بیل اپنی نازک ٹہنیاں جھاڑ رہی تھی اور سفید بالوں میں چھپی ہوئی وادی کی جانب سے بارش اور تیز ہوا کے شور کے علاوہ بھینسوں کے ڈکرانے اور بھیڑ بکریوں کے ممیانے کی آواز بھی آ رہی تھیں۔

''سردی بڑھ گئی ہے''

اتنا کہہ کر ڈاکٹر اٹھا اور اس نے کھڑکی بند کر دی۔

مینٹل پیس کے اوپر ہوا میں جھولتا ہوا کیلنڈر ایک دم رک گیا اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ڈاکٹر نے تازہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بجھی ہوئی دیا سلائی آتشدان میں پھینکی اور کمبل کو اچھی طرح شانوں پر پھیلاتے ہوئے کہا:

''اب تم یہ بتاؤ کہ وہ اطالوی لڑکی کون ہے جس کی تصویر تم نے مجھے صبح دکھائی تھی۔

کیپٹن پیالیوں میں ہلکے سبز رنگ کی چینی چائے انڈیل رہا تھا جس کی خوشبو ایسی تھی جیسے قریب ہی کسی نے چیڑھ کے درخت کا تنا کاٹ کر رکھا ہو۔ اطالوی لڑکی کے ذکر سے اس کے گندمی رنگ کے چوڑے جبڑوں اور لمبی ناک والے چہرے پر پھیکا سا تبسم نمودار ہوا اور وہ ڈاکٹر کو اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے چمچ سے پیالی میں شکر ہلانے لگا۔ گرم چائے بھنور کی شکل میں پیالی میں آہستہ آہستہ گردش کرنے لگی اور کیپٹن کو محسوس ہوا جیسے وقت کا چکر پیچھے کی طرف گھومنے لگا ہے اور وہ گزرے ہوئے راستوں' دیکھی بھالی عمارتوں اور بھولے بسرے چہروں کے درمیان ہو کر گزر رہا ہے۔ اس نے سوچا وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ وہ مہمان بن کر ہمارے گھروں میں اترتا ہے اور چوروں کی طرح بھاگ جاتا ہے۔ وہ پھول اور قہقہے لے آتا ہے اور قبریں اور آنسو چھوڑ کر چل دیتا ہے۔ وہ گزر جاتا ہے اور انسان باقی رہ جاتا ہے۔ انسان پیچھے رہ جاتا ہے پیالی میں چائے کا سمندر بھر رہا تھا اور اس کی طوفانی سطح پر یادوں کے بادبانی سفینے ڈگمگا رہے تھے۔ ہر بات اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ ہر چہرہ پیچھے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ہر شے پیچھے پلٹ رہی تھی۔ یہ بالکل ایسے تھا جیسے کوئی مسافر بندھا ہوا بستر کھول رہا ہو' جیسے کوئی لڑکی بنا ہوا سویٹر ادھیڑ رہی ہو۔ کیپٹن نے وہ پگڈنڈی دیکھی جہاں سے وہ گزرا تھا'' وہ چشمہ دیکھا جہاں اس نے اپنی پیاس بجھائی تھی' وہ درخت دیکھا جس کی چھاؤں میں وہ گھڑی دو گھڑی ستایا تھا اور وہ ٹیلہ دیکھا جس کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اس نے سورج غروب ہوتے دیکھا تھا اور وہ لوگ دیکھے جو اسے گذشتہ دس

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

سالوں کی طویل مسافت میں ملے تھے اور اسی ہجوم میں اس نے لمبے قد اور چھریرے جسم کی ایک لڑکی کو دیکھا جس کی آنکھیں نیلی تھیں اور بال سرخ تھے اور ہونٹ کسی اطالوی سنگتراش نے یاقوت میں سے تراشے تھے۔ اس نے گہرے سرخ بالوں میں آلوچے کی سپید کلیاں سجا رکھی تھیں۔ جیسے بھڑکتے ہوئے شعلے ایک دم منجمد ہو گئے ہوں اور ان پر برف گر رہی ہو۔ اور وہ ایک طرف چپ چاپ کھڑی تھی اور پریشان نگاہوں سے ادھر ادھر تک رہی تھی۔ جیسے کسی محبوب اور مہربان چہرے کی جستجو میں ہو۔ اس لڑکی کا نام لنیورے تھا اور اس کی تصویر کیپٹن نے صبح کھانے پر ڈاکٹر کو دکھائی تھی اور اس نے پوچھا تھا۔ یہ لڑکی کون ہے؟''

کیپٹن نے اس لڑکی کو سب سے پہلے بحیرہ روم کے ساحل پر دیکھا تھا۔ وہ فوج میں نیا نیا لیفٹیننٹ بھرتی ہوا تھا اور ملایا اور فلپائن میں کچھ عرصہ جاپانیوں کے مقابل لڑنے کے بعد اپنی رجمنٹ کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ کے محاذ پر آ گیا تھا جہاں اطالوی شمالی لینڈ پر قبضہ کر چکنے پر جرمن فوجیں رومیل کی قیادت میں بن غازی اور طبروق کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ ان کا قیام بن غازی میں تھا جہاں انہوں نے دو تین مضافاتی جھونپڑیوں میں ڈیڑھ سو کے قریب اطالوی سپاہیوں کو جنگی قیدی بنا رکھا ہوا تھا۔ یہ لوگ اس قدر عیاش تھے کہ اپنے ساتھ عورتیں بھی لے آئے تھے اکثر خندقوں میں حملے کے بعد اطالوی سپاہیوں کے ساتھ نیم عریاں عورتیں بھی مردہ پائی گئیں تھیں جو سپاہی قید میں تھے وہ سارا دن کھاتے اور گاتے رہتے اور رات کو ناچنا شروع کر دیتے تھے۔ ان میں ہر دوسرا سپاہی سنگتراش یا مصور تھا۔ وہ آبی رنگوں کی خوبصورت تصویریں اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے مجسمے بنا کر ان کے عوض چوری چھپے سگریٹ اور شراب حاصل کیا کرتے تھے۔ ان کی طرف دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ لڑائی پر نہیں بلکہ کسی پک نک پارٹی پر آئے ہوئے ہیں۔

بن غازی ان کی چھوٹی سی کمپنی تین اطراف سے دشمنوں میں گھری ہوئی تھی۔ چنانچہ رات کو حفاظتی دستے کیمپوں کے اردگرد سمندر کے کنارے کنارے بندوقیں اور ٹارچیں لے کر گشت لگایا کرتے تھے۔ روم کا سمندر ان کے قریب ہی تھا جس کی نیلی نیلی لہروں کا شور صاف سنائی دیا کرتا تھا۔ اس جگہ ساحل پر ایک طرف دو اطالوی چھوٹے جنگی جہاز اتحادیوں نے اپنے قبضے میں کر رکھے تھے جنہیں مالٹا کے جنوبی پانیوں میں گرفتار کیا تھا۔ یہ جہاز تقریباً خالی تھے اور نصف کے قریب ریت میں دھنسے ہوئے تھے۔ دوسری جانب جرمن اور اطالوی حفاظتی دستے بھی رات کو گشت لگایا کرتے تھے اور کبھی کبھی راستہ بھول کر اس طرف آ نکلتے تھے۔ ہلکی سی جھڑپ کے بعد یا تو وہ بھاگ جاتے تھے اور یا اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیتے تھے۔ لیبیا کے صحراؤں میں رات کے وقت اجنبی ملکوں سے آئے ہوئے سپاہیوں کا راستہ بھول جانا کوئی انوکھی بات نہیں ہے تاہم ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ لیفٹیننٹ کو بن غازی میں آئے دو ماہ ہوئے تھے۔ اور اس دوران میں شاید کوئی دن ایسا گزرا ہو گا جس دن دشمن نے ان پر بم نہ برسائے ہوں۔ وہ دن اور رات کا بیشتر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حصہ صحرائی خندقوں میں گزارتے تھے۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹران سے کچھ ہی میل کے فاصلے پر تھا جہاں سے جنگ کے تمام محاذوں کی تفصیل وار خبریں ان تک باقاعدہ پہنچتی رہتی تھیں۔ ان کی کمپنی براہ راست بریگیڈ کے ماتحت تھی اور ہم قسم کے احکامات وہیں سے جاری ہوتے تھے۔ ایک رت آسمان پر گہرے سیاہ بادل ہر سمت چھائے ہوئے تھے۔ اور ہلکی ہلکی خنک صحرائی ہوا چل رہی تھی۔ کمپنی کے کمانڈنگ آفیسر میجر گریگوری کی طرف سے لیفٹیننٹ رات کو گشت لگانے والے حفاظتی دستے کا انچارج تھا۔ اندھیرا اس قدر زیادہ تھا کہ دس قدم کے فاصلے پر کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا اور ہوا میں کھجور کے درختوں کی شاخیں ڈراؤنے انداز میں لہرا رہی تھیں۔ لیفٹیننٹ اپنے چند ایک سپاہیوں کی معیت میں رائفلیں مشین گنیں اور ٹارچیں سنبھالے آہستہ آہستہ قدم اٹھائے بالکل خاموشی سے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ سمندر کے جانب سے آنے والی لہروں کے دھیمے دھیمے شور کے علاوہ ہر طرف مکمل سکوت تھا اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

اچانک لیفٹیننٹ چوکنا ہو کر ٹھٹک سا گیا۔ اس کے ساتھی بھی کھڑے ہو گئے۔ اس نے ابھی ابھی یک آواز سنی تھی۔ جیسے کوئی کسی لڑکی کا بوسہ لے رہا ہو۔ وہ تمام ایک دم زمین پر لیٹ گئے اور انگلیاں رائفلوں کے گھوڑوں پر رکھ دیں۔ اب ایک ہلکے سے نسوانی قہقہے کی آواز آئی۔ سپاہیوں نے سانس روک لیے۔ دشمن نے کوئی چال تو نہیں چلی؟ ہر آدمی یہی سوچ رہا تھا۔ لیفٹیننٹ ریت پر لیٹا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں اس آواز کا تعاقب کر رہا تھا۔ اب انہوں نے ریت پر بہت سے قدموں کی چاپ سنی جو بتدریج ان کی سمت بڑھ رہی تھی۔ لیفٹیننٹ کے اشارے پر تمام سپاہی ریت پر پیچھے کی طرف کھسکنے لگے دفعتاً اندھیرے میں سے چند دھندلے سے چہرے نمودار ہوئے اور نہایت مدھم سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے ان کے قریب سے گزر گئے۔ جب وہ ان سے چھ سات قدموں کے فاصلے پر جا چکے تو لیفٹیننٹ نے زوردار آواز میں "ہالٹ" کہا اور ان کے چہروں پر ایک ساتھ دس گیارہ ٹارچوں کی تیز روشنی پھینک دی گئی۔

وہ کل سات تھے جن میں چار لڑکیاں تھیں۔ ان میں ہر ایک کے پاس بندوق تھی اور تیز روشنی میں وہ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے تک رہے تھے۔ لیفٹیننٹ نے انہیں ہاتھ اوپر اٹھانے اور ہتھیار پھینک دینے کا آرڈر دیا اور ان کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ ہر سپاہی کی جیب میں پستول اور منہ سے بجانے والا باجہ تھا۔ یہ لوگ اطالوی تھے اور پیٹرولنگ کرتے ہوئے راستہ بھول کر اتحادی علاقے میں نکل آئے تھے۔ وہ یوں گرفتار ہو جانے پر بالکل پریشان نہ تھے اور ایک دوسرے کو ہنس ہنس کر مذاق کر رہے تھے۔ چاروں لڑکیاں خاکی وردی میں ملبوس تھیں اور ٹارچ کی روشنی میں کشتی نما ٹوپیوں کے نیچے ان کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ایک لڑکی کے بال

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گہرے سرخ تھے وہ ان سب سے الگ سی کھڑی تھی۔ لیفٹیننٹ نے انہیں دو قطاروں میں کھڑا کر کے چلنے کو کہا اور تھوڑی دیر بعد کمپنی کے کیمپ میں لے آیا۔ راستے میں ہر لڑکی کسی نہ کسی سپاہی کا منہ چوم رہی تھی اور اپنی زبان میں یا تو اسے گالیاں دے رہی تھی یا پیار سے مخاطب کر رہی تھی۔ لیکن اس نے دیکھا کہ سرخ بالوں والی پتلی دبلی لمبی سی لڑکی نہ کسی سے مذاق کرتی اور نہ کسی کا منہ چوم رہی تھی۔

کیمپ پہنچ کر لیفٹیننٹ نے سب سے پہلے گارڈ کمانڈر کو رپورٹ کی جس نے اسی وقت ڈیوٹی آفیسر کو اطلاع کر دی۔ ڈیوٹی آفیسر جنوبی افریقہ کا ایک حبشی تھا جس نے ہندوستانی فوج میں رہ کر لڑنے کے عہد نامے پر دستخط کئے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے بیڈ روم ہی سے کہلوا بھیجا کہ قیدیوں کو گارڈ روم میں بند کر دیا جائے۔ چنانچہ لفٹینٹ نے ان اطالوی سپاہیوں اور لڑکیوں کو گارڈ روم کے کمرے بند کر دیا۔ صبح سب سے پہلے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو جو خبر پہنچی وہ یہ تھی کہ رات سمندر کے کنارے دشمن کے کچھ قیدی سپاہی گولیاں ضائع کئے بغیر قیدی بنا لیے گئے۔ ہیڈ کوارٹر سے دن کی روشنی نکلتے ہی دو آفیسر جیپ پر سوار ہو کر وہاں پہنچ گئے۔ ان میں ایک کیپٹن تھا اور ایک سارجنٹ۔ یہ دونوں برطانوی تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ انہوں نے لیفٹیننٹ کی معیت میں گارڈ روم میں قیدیوں کا معائنہ کیا' اور لیفٹیننٹ نے دیکھا کہ سرخ بالوں والی لڑکی کے علاوہ ہر لڑکی کسی نہ کسی اطالوی سپاہی کی آغوش میں سوئی ہوئی تھی۔ یہ لڑکی ایک کونے میں دبکی پڑی تھی اور اس کے چہرے پر رات بھر جاگنے سے تھکن اور پژمردگی کی اثرات تھے۔ صبح کی روشنی میں لیفٹیننٹ نے یہ بھی دیکھا کہ اس لڑکی کی آنکھیں نیلی ہیں اور ہونٹ بڑے نازک اور باریک ہیں' جیسے کسی ماہر سنگتراش نے مہینوں کی عرق ریزی کے بعد تراشے ہوں۔ اس کے چہرے پر بچوں ایسا لاابالی بھولپن اور پختہ عمر کی عورتوں ایسا استقلال جھلک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کالج میں باقاعدہ اخلاقیات کا لیکچر دیتے ہوئے اچانک تھرڈ کلاس ڈرائیوروں کے درمیان پہنچ گئی ہے اور اس انقلاب پر حیران بھی ہو رہی ہے اور اسے برداشت کرنے کی بھی کوشش کر رہی ہے۔ ہیڈ کوارٹر سے آئے ہوئے دونوں افسروں نے بھی اس لڑکی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اس کی علیحدہ سی شخصیت سے کچھ متاثر بھی ہوئے۔ اس دوران میں باقی قیدی سپاہی اور لڑکیاں جاگ اٹھی تھیں اور انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتے اور لباس درست کرتے ہوئے کچھ نفرت اور کچھ غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان سبھوں کی تلاشی لی گئی اور رجسٹر میں ان کے ناموں کے علاوہ ان کی جیبوں سے برآمد کی ہوئی چیزوں کو بھی درج کیا گیا۔ سرخ بالوں والی لڑکی سے جب اس کا نام پوچھا گیا تو اس نے نیلی آنکھوں والی بڑی پلکیں اٹھا کر برطانوی افسروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خالص اطالوی لہجے میں اور صاف انگریزی میں کہا:

''لینورے۔۔۔۔۔۔۔۔لینورے ایمیل۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیفٹیننٹ جب لڑکیوں کے نام رجسٹر میں لکھنے لگا تو برطانوی آفیسرز میں سے کیپٹن واکر اسے ایک طرف لے گیا اور آہستہ سے کہنے لگا:

''ہیڈ کوارٹر کو صرف ایک لڑکی کی رپورٹ کرو۔ اس طرح تین لڑکیاں بچیں گی۔ دو ہم لے جائیں گے اور ایک تم پسند کر لینا''

لیفٹیننٹ کو کیپٹن واکر کی اس ذلیل تجویز پر اس قدر غصہ آیا کہ اس کے کان سرخ ہو گئے۔ اس نے کیپٹن واکر کی بھوسلے رنگ کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں گندگی اور عفونت کے بے شمار ڈھیر دیکھے اور اس نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا:

''کیپٹن واکر! میں نے سات اطالوی گرفتار کئے ہیں اور ہیڈ کوارٹر کو سات قیدیوں کی رپورٹ ملے گی۔''

کیپٹن واکر نے آنکھیں ذرا سی بند کر کے بڑی حقارت سے لیفٹیننٹ کو دیکھا اور سگریٹ پاؤں تلے مسل کر اپنے ساتھی افسر سمیت باہر نکل گیا۔ ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ اسی روز پہنچی تھی۔ باقی کمپنی کمانڈنگ آفیسر میجر گریگوری نے اسے روک دیا۔ اسنے لیفٹیننٹ کو بلا کر کہا کہ وہ باقی لڑکیوں کو شمار کر لے لیکن نیلی آنکھوں والی لڑکی کا نام درج نہ کرے کیوں کہ وہ اسے اپنے دفتر میں اپنی سٹینو بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ لیفٹیننٹ مجبور ہو گیا۔ نیلی آنکھوں اور سرخ بالوں والی لڑکی کو جب اس فیصلے سے آگاہ کیا گیا تو وہ غصے میں بپھر گئی۔

''یہ کبھی نہیں ہوگا۔ میں جنگی قیدی ہوں اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہوں گی۔''

لیفٹیننٹ خاموشی سے ایک طرف کھڑا اس کے چہرے پر جذبات کا اتار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کا زرد اور سپید رنگ غصے میں ہلکا گلابی سا ہو رہا تھا اور اس کی نیلی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ جب اس کے ساتھیوں نے اسے اس بات پر بہت مجبور کیا کہ وہ آرام دہ اور آسان زندگی کی اس پیش کش کو قبول کر لے تو وہ دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر بے اختیار رونے اور سسکیاں بھرنے لگی۔ لیفٹیننٹ نے گارڈ کمانڈر کو کچھ کہا اور باہر نکل آیا۔

دوسرے روز لینورے دفتر میں آ گئی اور باقی قیدیوں کو بڑے کیمپ میں روانہ کر دیا گیا۔ بن غازی میں سینکڑوں اطالوی شہری رہ رہے تھے چنانچہ لینورے کو بڑی آسانی سے بن غازی شہر کا باشندہ ظاہر کر کے دفتر میں ملازم رکھ لیا گیا۔ میجر گریگوری نے پہلے پہل لینورے کو اپنے کمرے میں ہی میز کرسی رکھوا دی لیکن کچھ دنوں بعد لینورے نے ٹائپ کر کے درخواست لکھی کہ اسے میجر کے کمرے سے باہر عام دفتر میں جگہ دی جائے۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتلائی کہ میجر کا کمرہ چھوٹا ہے اور اسے ہر وقت زکام رہتا ہے۔ میجر گریگوری نے پہلے تو انکار کر دیا لیکن جب لینورے نے ہیڈ کوارٹر میں عرضی بھیجنے کی دھمکی دی تو میجر نے مجبوراً ہتھیار پھینک دیئے۔ بعد ازاں لینورے نے لیفٹیننٹ کو بتایا کہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ میجر دفتری خطوط لکھواتے وقت اس کے شانوں اور رخساروں پر ہاتھ پھیرا کرتا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھا۔

اب جو میز لینورے کو ملی تو وہ لیفٹیننٹ کے بالکل ساتھ والی تھی۔ دفتر کا سٹاف میجر گریگوری کے علاوہ کیپٹن بیٹس سارجنٹ میکائے اور بنگالی جمعدار پر منحصر تھا۔ ایک روز اچانک کیپٹن بیٹس کی تبدیلی کا حکم آ گیا۔ اسے طربوق منتقل کر دیا گیا اور اس کی جگہ ہیڈ کوارٹر سے کیپٹن واکر نے آ کر چارج لے لیا۔ یہ سب کچھ ایک طے شدہ پروگرام کے تحت ہوا تھا اور لیفٹیننٹ کو اپنے آپ اس نیلی آنکھوں اور سرخ بالوں والی بھولی بھالی اطالوی دوشیزہ سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جب تک بن غازی میں ہے لینورے کو ہر قسم کی مصیبت سے بچائے رکھے گا۔ کیپٹن واکر نے آتے ہی میجر سے مل کر لینورے پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ اس کی چھوٹی سی چھوٹی ضرورت کا بھی خیال رکھا جانے لگا۔ صبح اگر کیپٹن واکر لینورے کے کوارٹر میں اردلی کے ہاتھ نیلے انگور اور لالہ کے سرخ پھول بھجوا رہا ہے تو شام کو میجر گریگوری خرطوم اور فلسطین کی پرانی شراب کی خوبصورت بوتلیں پیش کر رہا ہے۔ لینورے نیلے انگور ملازموں میں بانٹ دیتی، سرخ پھول کارنس پر رکھ دیتی اور فلسطینی شراب کی بوتلیں واپس کر دیتی اس لیے کہ اسے شراب کی عادت نہیں تھی۔ اسے شراب سے نفرت تھی، ہر ملک کی شراب سے اور میجر گریگوری اور کیپٹن واکر سے نفرت تھی۔ وہ اپنے آپ کو زرد دانتوں اور ضعیف ٹانگوں والے شکاری کتوں میں گھرا ہوا محسوس کرنے لگی تھی اور وہاں سے کسی نہ کسی طرح بھاگ جانے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ان ریتلے صحراؤں اور گندگی کے تاریک ڈھیروں سے نکل کر اٹلی پہنچ جائے، فلورنس پہنچ جائے، اپنے گاؤں کی تازہ اور کھلی ہواؤں میں بازوں پھیلا کر کھڑی ہو جائے۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھے قدم قدم چلتی اس پتھریلی پگ ڈنڈی پر سے گزر جائے جس کے اوپر انگور کی بیلوں کی چھت پڑی ہوئی ہے۔ وہ اپنے گھر کے احاطے کے باہر سپیدے کے درخت کی اوٹ میں کھڑی ہو کر اپنی بوڑھی ماں کو سر پر نیلا رومال باندھے، بھینسوں کا دودھ دوہتے یا بھیڑوں کی اون کو دھوپ میں چھانٹتے دیکھے۔ دوسری طرف اس کی چھوٹی بہن میریا باورچی خانے کے پچھواڑے اگے ہوئے آلوچے کے درخت تلے بیٹھی ابلے ہوئے آلو چھیل رہی ہو اور پھر ایک طرف سے اس کا جھکی ہوئی بھنوؤں والا بوڑھا باپ نمودار ہو۔ اس کی پرانی پتلون گھٹنوں سے باہر نکل ہوئی ہو۔ پاؤں میں اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے چمڑے کے فٹ بوٹ ہوں۔ خاکی رنگ کی میلی جرسی آستینوں تک چڑھی ہوئی ہو۔ سر پر پیچھے کی طرف ڈھلکی ہوئی بھدی اونی ٹوپی ہو اور زرد مونچھوں کے نیچے ہونٹوں میں بجھا ہوا گھریلو سگار ہو۔ وہ منہ ہی منہ میں حسب عادت بڑبڑاتا باورچی خانے کی طرف جائے۔ میریا کو آلو چھیلتے دیکھ کر آہستہ سے سر ہلائے اور دیوار کے ساتھ لگا ہوا بیلچہ اٹھا کر انگور کے باغ میں داخل ہو جائے۔۔۔۔۔۔ سپیدے کے درخت کی اوٹ میں کھڑی لینورے یہ سب کچھ دیکھے اور پھر ایک دم

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھاگ کر سامنے نکل آئے اور اپنی بوڑھی ماں کے گلے لگ جائے اور اس کی گود میں سر رکھ کر بے اختیار رونا شروع کر دے۔ لیکن بن غازی سے اطالیہ بہت دور تھا اور فلورنس پر دشمن کے طیارے بم برسا رہے تھے اور اس کے گاؤں کی پگڈنڈیاں ویران تھیں اور انگور کے باغات اجڑ گئے تھے' اور اب میجر گریگوری چٹھیاں لکھواتے وقت اس کے شانوں پر ہاتھ پھیرتا تھا اور کیپٹن واکر اسے نیلے انگور اور لالہ کے پھول بھیجا کرتا تھا اور وہ ان دونوں کے درمیان معصوم خرگوش کی مانند سہمی بیٹھی تھی۔

محاذ جنگ پر عہدوں کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے اور دشمن پر حملہ آور ہوتے ہوئے تو کندھوں اور بازوؤں پر سے تمام امتیازی نشانات نوچ کر پھینک دیے جاتے ہیں۔ بن غازی کے قرب و جوار میں اس وقت گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ جرمن فوجیں رومیل کی قیادت میں کئی اطراف سے طبروق اور العالمین کی جانب بڑھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھیں۔ چنانچہ دفتر کا سارا سٹاف پانچ سات کمروں والے کوارٹروں کی ایک چھوٹی سی قطار میں رہتا تھا۔ میجر گریگوری پہلے کوارٹر میں مقیم تھا' کیپٹن واکر دوسرے اور لینورے نمبر ۳ میں رہتی تھی۔ لیفٹیننٹ کا کوارٹر چوتھے نمبر پر تھا اور لیفٹیننٹ کے بعد جمعداروں اور حوالدار کلرکوں کے دو تین کمرے تھے۔ لینورے عام طور پر دفتر سے نکل کر سیدھی اپنے کمرے میں آ جاتی تھی اور کتابوں کے مطالعے میں منہمک رہتی تھی۔ وہ صرف اتوار کے روز گرجا گھر میں صبح کی نماز سے فارغ ہو کر شہر میں ضروریات کی چند ایک چیزیں خریدنے جاتی اور واپس آ کر اپنے آپ کو کمرے میں بند کر دیتی۔ دفتر میں اس کی زیادہ بات چیت کسی سے بھی نہیں تھی۔ گریگوری اور واکر سے اسے ویسے ہی نفرت تھی اور کلرکوں وغیرہ سے تعلقات بڑھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیفٹیننٹ سے اس کی گفتگو دفتری امور تک ہی محدود تھی اور اس نے کبھی حد سے آگے بڑھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ سارجنٹ میکائے دبلا پتلا منحنی سا انگریز لڑکا تھا جو ہر وقت اپنی دھن میں ہی مگن رہتا تھا۔ وہ عام طور پر کام میں مصروف رہتا تھا اور فرصت کے اوقات میں اپنے گھر لمبے لمبے خط لکھا کرتا تھا۔ لیفٹیننٹ نے لینورے کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا تھا اور وہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ جب وہ مسکراتی ہو گی تو اس کا معصوم چہرہ پہلے سے کتنا خوبصورت ہو جاتا ہو گا۔ اگرچہ لینورے کی میز اس کی ساتھ ہی تھی تاہم ان دونوں میزوں کے درمیان روم کا سمندر حائل تھا۔

ایک شام جبکہ آسمان پر نیلا صحرائی چاند چمک رہا تھا۔ کیپٹن واکر شراب پی کر لینورے کے کمرے کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا اور زور زور سے دروازے پر مکے مارنے لگا۔ اس کی آوازیں سن کر لیفٹیننٹ اپنے کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ لینورے نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے دروازے کو اندر سے مقفل کر لیا تھا اور غالباً پلنگ پر سہمی بیٹھی تھی۔ کیپٹن شراب کے نشے میں دھت تھا اور اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح دروازے پر دستکیں دے رہا تھا اور لینورے کو چیخ چیخ کر ڈیولز ڈریم اور لیکیز میول ایسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

احمقانہ ناموں سے پکار رہا تھا۔ اچانک وہ لڑکھڑایا اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اس دوران کلرکوں کے علاوہ میجر گریگوری بھی اپنے کوارٹر سے باہر نکل آیا تھا۔ انہوں نے کیپٹن واکر کو اٹھا کر بصد مشکل اس کے کمرے تک پہنچایا اور میجر گریگوری نے باہر سے زنجیر چڑھا دی۔ دوسرے روز میجر گریگوری نے لینورے کے سامنے کیپٹن واکر کو سخت سست کہا جس پر وہ ناک بھوں چڑھاتا اس کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میجر گریگوری لینورے پر اپنی شرافت اور فرض شناسی کا رعب جمانا چاہتا تھا۔ ویسے بھی کیپٹن واکر کے ہوتے ہوئے اسے اپنی دال گلتی کچھ مشکل نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے جانے کیا داؤ استعمال کیا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر کیپٹن واکر کی تبدیلی کے احکامات آ گئے۔ بریگیڈ کوارٹر نے اسے قاہرہ منتقل ہونے کا حکم دیا تھا۔

میجر گریگوری کے سامنے اب میدان بالکل صاف تھا۔ چنانچہ لینورے کو بات بات پر اپنے کمرے میں بلانے لگا۔ ایک دن اسے اپنے ہاں شام کے کھانے کی دعوت دی گئی جسے لینورے نے نہایت سادگی سے ٹال دیا۔ میجر کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ وہ اس سے پیشتر لینورے پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر چکا تھا کہ وہ اس اطالوی دوشیزہ سے ازحد ہمدردی رکھتا ہے۔ لیکن لینورے کا طرزِ عمل اس کی توقعات کے برعکس تھا۔ وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا اور آخر ایک رات یہ جوالا مکھی بھی پھٹ پڑا۔

وہ رات سائیرینیکا کے ریگ زاروں پر بڑے پراسرار انداز میں طلوع ہوئی تھی۔ دن کو دو تین بار دشمن کے طیارے بم گرا چکے تھے اور رات کو کافی خنکی ہو گئی تھی۔ بحیرہ روم کی جانب سے ہوا چل رہی تھی جو نم آلود تھی ورجس میں نمکین اور کھاری بو تھی۔ لیفٹیننٹ کچھ گھریلو خطوط لکھنے کے بعد بتی بجھا کر ابھی لیٹا ہی تھا کہ اسے ساتھ والے کمرے میں لینورے کے زور سے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ ایک دم بستر پر سے اچھل پڑا اور بجلی ایسی تیزی کے ساتھ کے لینورے کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر جو منظر اس نے دیکھا وہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ میجر گریگوری شراب کے نشے میں چور لینورے کو زمین پر گرائے ہوئے تھا اور اس کے سینے پر سوار خچر کی طرح ہانپ رہا تھا۔ لیفٹیننٹ نے جلدی سے دھکا دے کر میجر کو پرے گرا دیا اور لینورے کو اٹھا کر ایک طرف کھینچ لیا۔ غریب لڑکی کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور شب خوابی کا لباس داہنی طرف سے آستین تک پھٹا ہوا تھا۔ میجر گریگوری نے پلنگ کا سہارا لے کر جھکے جھکے قہر آلود سرخ سرخ آنکھوں سے لیفٹیننٹ کو دیکھا اور بھیڑیئے کی طرح چیخا:

''میں تمہیں کوارٹر گارڈ میں بند کر دوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔ یو ڈرٹی سوائین۔۔۔۔۔۔۔۔ سٹوپڈ فول۔۔۔۔۔۔''

لیفٹیننٹ نے میجر گریگوری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے تحمل سے کہا:

''میجر تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ میرے ذرا سی زبان کھولنے پر تمہارا سارا فوجی مستقبل تباہ ہو سکتا ہے۔ کیمپ میں لیٹے ہوئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اطالوی قیدی اس کے گواہ ہیں کہ تم نے اور کیپٹن واکر نے ایک اطالوی لڑکی کو اپنی مرضی سے بن غازی کی رہنے والی ظاہر کر کے اپنے دفتر میں ہی رکھا ہے۔ صبح اگر میرا کورٹ مارشل ہوگا تو پرسوں تمہارے کندھے سے بھی سنہری تاج نوچ لیا جائے گا"

میجر گریگوری جیسے ایکا ایکی ہوش میں آ گیا۔ اس نے جیب سے خاکی رومال نکال کر ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا اور پاؤں سے کرسی کو زور سے ٹھوکر مار کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ لینورے نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور پلنگ کی پٹی پر سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

"روؤ مت لینورے۔۔۔۔۔۔۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ خدا نے عین وقت پر تمہاری حفاظت کی۔

لینورے کچھ دیر سسکیاں بھرنے کے بعد تھرائی ہوئی آواز میں بولی:

"آپ کا شکریہ جناب۔۔۔۔۔۔۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

"یہ میرا فرض تھا۔ تمہاری جگہ خواہ کوئی اور لڑکی کیوں نہ ہوتی چیخ کی آواز سن کر میں اپنے کمرے میں نہیں رہ سکتا تھا۔ لو اب آرام سے سو جاؤ۔ صبح جو کچھ ہوگا دیکھا جائیگا اور میں تمہاری یقین دلاتا ہوں کہ صبح کچھ نہ ہوگا۔"

لینورے نے آہستہ سے اپنا افسردہ چہرہ اٹھا کر لیفٹیننٹ کو دیکھا۔ اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں آنسو اور احسان مندانہ چمک تھی۔ اس نے سپید ہاتھوں کی ادا اس حرکت سے سر کے سرخ بالوں کو سیاہ فیتے میں باندھا اور پلنگ پر دراز ہو کر کمبل اوڑھ لیا۔

"جناب میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولوں گی۔"

لیفٹیننٹ نے گری ہوئی کرسی اٹھا کر میز کے ساتھ لگائی۔ دھیمی آواز میں شب بخیر کہا اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ لینورے نے اٹھ کر دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کیا اور بتی بجھائی اور بستر پر لیٹ کر دیر تک اپنی نیک دل ماں اور بہن بھائیوں کو یاد کر کے تکئے پر آنسو بہاتی رہی۔۔۔۔۔۔۔

اگلی صبح لینورے دفتر جانے کی بجائے لیفٹیننٹ کے کمرے آ گئی۔

دن ابھی ابھی نکلا تھا اور سورج کی ترچھی کرنیں کھجور کے جھنڈوں کے اوپر سے ہو کر گزر رہی تھی۔ لیفٹیننٹ بستر ہی میں تھا اور اردلی چائے کے لیے پانی رکھ کر جوتے پالش کر رہا تھا۔ لینورے نے اندر داخل ہوتے ہی "صبح بخیر" کہا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ آج اس کا چہرہ پہلے سے کچھ اترا ہوا تھا اور آنکھیں یوں بوجھل سی لگ رہی تھیں جیسے وہ تمام رات جاگتی رہی ہو۔ لیفٹیننٹ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یہاں آجاؤ لینورے۔۔۔۔۔۔۔آج سورج بڑا چمکیلا ہے۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔"

لینورے ہلکے پھلکے قدم اٹھاتی پلنگ کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"چائے پیو گی؟"

"شکریہ ایس پی آئی ہوں"

کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی۔ لیفٹیننٹ سگریٹ نکال کر سلگانے لگا اور لینورے نظریں جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہی اور چھوٹے سے خاکی رومال کو سپید لمبی انگلیوں کے گرد لپیٹتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ لیفٹیننٹ نے لینورے کی پیالی بناتے ہوئے کہا:

"رات جو کچھ ہوا مجھے ذاتی طور پر اس کا افسوس ہے اور میں دنیا کے تمام شریف النفس مردوں کی طرف سے اس کی معافی مانگتا ہوں زندگی میں ایسے ناخوشگوار حادثات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اور خاص طور سے جب انسان پردیس میں ہو تو ان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔بہرحال زندگی بسر کرنا ایک آرٹ ہے اور وہ لوگ جو اس آرٹ سے واقف ہیں اپنی عزت کرتے ہیں چاہے وہ کسی بھی حالت میں کیوں نہ ہوں۔۔۔۔۔۔۔میرا مطلب ہے خواہ وہ دشمن کی قید میں پڑے ہوں اور خواہ وہ اپنے گھر کے باورچی خانے میں بیٹھے ہوں۔ چینی کتنی ڈالوں؟"

لینورے نے آہستہ سے کہا:

"دو چمچ"

وہ دونوں خاموشی اور سکون سے چائے پینے لگے۔ برآمدے میں اردلی برش سے وردی صاف کر رہا تھا۔ اور کھڑکی پر اس کا سایہ بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کیمپ کی جانب سے سپاہیوں کے گارڈ بدلنے اور پریڈ کرنے کی دھیمی آوازیں آ رہی تھیں۔ لینورے نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے لیفٹیننٹ کی طرف دیکھا اور بجھی بجھی سی آواز میں کہا:

"رات آپ نے میری عزت بچائی ہے۔ عورت۔۔۔۔۔۔۔وہ فلورنس کی رہنے والی ہو یا بن غازی کی اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اس وقت میں آپ کے پاس ایک اور احسان کی درخواست لے کر آئی ہوں اور مجھے امید ہے آپ مجھے ناامید نہ ہونے دیں گے۔"

لیفٹیننٹ نے سگریٹ راکھدان میں بجھا دیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''تمہارے دل میں جو کچھ ہے مجھ سے کہہ دو لینورے! اگر ہو سکا تو میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔''

لینورے ایک لحظہ کے لیے خاموش ہو گئی اور آنکھیں جھکائے کچھ سوچتی رہی پھر جیسے اپنے آپ بول اٹھی:

''میں اس دفتر کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنا چاہتی ہوں۔''

لیفٹیننٹ ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''یعنی۔۔۔۔۔۔یعنی تمہارا مطلب ہے کہ تم ملازمت چھوڑ دینا چاہتی ہو؟''

''ہاں''

''لیکن لینورے۔۔۔۔۔۔۔ یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میجر کو تمہارا استعفیٰ نامنظور کرنے کا پورا حق حاصل ہے اور اگر اس نے منظور کر بھی لیا تو تم کیا کرو گی؟ کہاں جاؤ گی؟ پورا لیبیا عجیب افراتفری کی حالت میں ہے۔''

''کچھ بھی ہو میں اب اس فوجی ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ مجھے اس چار دیواری سے خوف آنے لگا ہے۔ میں اگر نہ گئی تو خودکشی کر لوں گی اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ میرے دو چھوٹے چھوٹے بھائی فلورنس میں پڑھ رہے ہیں۔ پھر ان کے بورڈنگ کے اخراجات کون اٹھائے گا؟ میں نہیں چاہتی کہ وہ شہر کی گلیوں میں اخبار بیچیں اور رات کو مال گاڑیوں کے ٹھنڈے ڈبوں میں سوئیں۔۔۔۔۔۔ اور پھر ایک بار اپنے گاؤں' اپنے گھر ضرور جانا چاہتی ہوں۔ وہاں میری ماں' میری بہن میریا اور میرا بوڑھا باپ میرا انتظار کر رہے ہیں اور آلوچے کا وہ چھوٹا سا پودا بھی جسے میں نے آتی دفعہ باورچی خانے کے عقب میں بویا تھا۔ وہ اب کافی اونچا ہو گیا ہو گا اور کیا عجیب ہے کہ اب کی بہار میں اس کی ٹہنیوں پر پھول آ جائیں

لیفٹیننٹ نے لینورے کو اس سے پیشتر اتنی دیر بولتے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ جلتا سگریٹ انگلیوں میں دبائے بڑی توجہ سے اس عورت کی باتیں سن رہا تھا جو ہر عورت کے اندر موجود ہوتی ہیں اور جسے زندگی گزارنے کے لیے صرف ایک باورچی خانے اور اس کے سامنے لگے ہوئے درخت کی ضرورت ہے جس کی وہ اپنے ہاتھوں سے آبیاری کرے اور اس کی پھولدار شاخوں کے سائے میں بیٹھ کر اپنے مرضی کے نشیب و فراز گن سکے۔ لینورے خاموش ہو گئی تھی اور اس کی جھکی ہوئی لانبی پلکوں پر بیتی ہوئی صبحوں کی شبنم تھرتھرا رہی تھی۔ لیفٹیننٹ نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے اس خاموشی کو توڑا:

''اگر ایسی بات ہے تو میں تمہاری ہر ممکن امداد کے لیے تیار ہوں لینورے۔۔۔۔۔۔ لیکن مجھے امید نہیں کہ میجر گریگوری تمہارا استعفیٰ منظور کر لے گا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''آپ فکر نہ کریں۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو میں اسے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے سامنے اپنے اطالوی قیدی ہونے کا پول کھول دینے کی دھمکی دوں گی۔۔۔۔۔۔۔ پھر اس کے علاوہ میں ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھی تو پیش کرنا چاہتی ہوں۔ میری صحت خراب رہنے لگی ہے۔ مجھے پردیس کی کوئی چیز موافق نہیں آئی''

''اردلی بوٹ اور وردی لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ لیفٹیننٹ نے گھڑی دیکھی۔ دفتر کا وقت ہو رہا تھا۔

''اب تم اپنے کمرے میں آرام کرو لینورے۔۔۔۔۔۔ میں اس مسئلے کو کامیابی سے حل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

دوسرے دن لینورے نے میجر گریگوری کی میز پر اپنا استعفیٰ رکھ دیا۔

میجر اس بات کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ استعفیٰ کے ساتھ ہی فوجی ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھی تھا جس میں لینورے کی صحت کو کمزور بتایا گیا تھا۔ اس کے باوجود میجر گریگوری نے اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

''ان حالات میں تم نوکری نہیں چھوڑ سکتیں۔''

لیکن میری صحت خراب ہے جناب' میں کام نہیں کر سکتی۔''

''ہم یہاں صحتیں بنانے نہیں آئے' کام کرنے آئے ہیں۔''

''لیکن جناب آپ کو استعفیٰ منظور کرنا پڑے گا۔''

''اور اگر میں انکار کر دوں تو۔۔۔۔۔۔؟''

''تو۔۔۔۔۔۔''

لینورے ذرا رکی۔ اچانک اس کی نیلی آنکھوں میں بجلی سی چمکی اور اس نے دھیمی لہجے میں کہا:

''اگر تم اپنا نقصان ہی چاہتی ہو تو میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا''

اسی دن لینورے نے لیفٹیننٹ کو بتایا کہ اس کا استعفیٰ منظور ہو گیا ہے اور وہ اب آزاد ہے۔ وہ اپنا مختصر سامان ایک سوٹ کیس میں بند کر کے شہر لے گئی جہاں کسی اطالوی ہوٹل کے مالک کی بیٹی کو اس نے سہیلی بنا رکھا تھا۔ وہ اسی سہیلی کے گھر جا کر ٹھہر گئی۔ دوسرے دن شام کے وقت لیفٹیننٹ سے ملنے آئی۔ اس نے ہلکے براؤن رنگ کا سایہ پہنا ہوا تھا اور گردن پر نصف کے قریب سرخ بال نیلے اور سپید پھولدار رومال سے باندھ رکھے تھے۔ اس لباس میں لیفٹیننٹ اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اور لینورے اسے پہلے سے زیادہ دلکش اور معصوم نظر آ رہی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں شفاف اور پاکیزہ چمک تھی اور چہرے پر بہار کے پہلے پھول ایسی تازگی اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نکھار تھا۔

''شام بخیر جناب! مجھے جلدی آ جانا تھا لیکن میری سہیلی لیزا نے مجھے باتوں میں لگائے رکھا۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ جس لڑکے سے اس کی بات پکی ہوئی تھی وہ نیپلز میں رہتا تھا اور آج کل مسولینی کی فوج میں اتحادیوں کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے وہ کہہ رہی تھی کہ اتحادیوں کو مشرق وسطیٰ میں ضرور شکست ہوگی اور انہیں سائیرینیکا سے بھاگنا پڑے گا۔ اس کا خیال ہے وہ بن غازی میں ہی اپنے منگیتر کا انتظار کرے گی بے چاری اس سے بڑی محبت کرتی ہے۔''

''بہت خوب۔۔۔۔۔۔گویا وہ ہمیں یہاں سے نکالنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔''

لینورے ہنس پڑی۔

اور لیفٹیننٹ نے دیکھا کہ اس کے دانت بڑے ہموار اور چمکیلے تھے اور اس کی مسکراہٹ میں آلوچے کے پھولوں ایسی شگفتگی اور سادگی تھی۔ اور اس نے سوچا کہ لینورے کے گھر میں باورچی خانے کے عقب میں لگے ہوئے آلوچے کے درخت پر ضرور پھول آ گئے ہوں گے۔ چائے انہوں نے مل کر پی۔ لینورے نے بتایا کہ وہ اسی ہوٹل میں عنقریب ہی ملازم ہو جائے گی جس کے مالک کی لڑکی اس کی سہیلی ہے اور جن کے ہاں وہ آج کل ٹھہری ہوئی تھی۔

''لیزا تو بہت اچھی لڑکی ہے مگر اس کا موٹا باپ بڑا بیہودی ہے۔ جب اس نے اپنے باپ کو میری نوکری کے لیے کہا تو وہ مان گیا لیکن ساتھ ہی کہنے لگا کہ میری ضمانت کون دے گا۔ جنگ کا زمانہ ہے۔ کیا خبر یہ لڑکی کوئی مصیبت لے آئے۔۔۔۔۔۔ سچ مجھے تو اس کی یہ بات بڑی بری لگی ہے بھلا ہم چہرہ دیکھ کر کسی کے دل کا اندازہ نہیں کر سکتے؟''

لیفٹیننٹ ہنس پڑا۔

''چہرے اکثر دھوکا دے جاتے ہیں۔ اور پھر برائی تو عام طور پر خوبصورت ہوتی ہے۔

لینورے جھٹ بول اٹھی۔

''غلط۔۔۔۔۔۔ بالکل غلط۔ برائی کبھی خوبصورت نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو مونا لیزا کی مسکراہٹ اور ریفائل کا کوئی شہکار زندہ نہ رہتا اور لیونارڈو کا کوئی مجسمہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکتا''

لفٹیننٹ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''آخر اطالوی ہو۔ خوبصورتی کی توہین برداشت نہیں ہو سکتی۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لینورے بھی ہنس پڑی اور آلو چے کے پھول دھوپ میں چمکنے لگے۔ اب باہر ریت کے ٹیلوں تلے شام کا ہلکا ہلکا ٹھنڈا اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور سمندر کی جانب سے آنے والی ہوا زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ لینورے چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔

''میں اب جاتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ لیکن پرسوں اتوار کے روز آپ کو ہمارے ہاں ضرور آنا ہوگا۔ آپ کھانا بھی ہمارے ہاں کھائیں گے اور لیزا بھی آپ سے ملنا چاہتی ہے اور وہ آپ کو پیانو بھی سنائے گی۔

''میں کوشش کروں گا۔''

''کوشش نہیں۔۔۔۔۔۔۔ آپ کو آنا ہوگا۔ مکان کا تو آپ کو علم ہی ہے اچھا۔۔۔۔۔۔۔ شب بخیر۔''

لینورے دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ برآمدے کے فرش پر اس کے سینڈل کی ٹک ٹک کچھ سیکنڈ کے لیے بلند ہوئی اور پھر ڈوب گئی۔

اتوار کا سارا دن لفٹیننٹ نے لیزا کے ہاں گزرا۔ اس نے کھانا بھی وہیں کھایا تلخ مصری کافی اور اطالوی تمبا کو بھی پیا اور لیزا سے پیانو پر قدیم اطالوی اور جرمن موسیقاروں کو بھی سنا۔ لیزا میانے قد کی موٹی سی قبول صورت لڑکی تھی جس کے بال چمکدار اور سونے کے رنگ ایسے زردی مائل بھورے تھے۔ اس کا ناک یونانیوں کی طرح لمبا اور آگے سے ذرا اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ سینہ بھرا بھرا تھا اور جب وہ ہنستی تھی تو اس کے پرسکون چہرے پر خوشحالی اور تن پروری کا احساس جھلکتا تھا۔ لیفٹیننٹ سے اس نے بڑی کاہلی سے اپنا گول مٹول سا ہاتھ ملایا اور کہا:

''لینورے آپ کی بہت تعریف کیا کرتی تھی۔ آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔''

اس کی آواز بھاری اور کرخت تھی۔ وہ یوں بول رہی تھی جیسے سوکر اٹھی ہو۔

لیزا کے باپ کا مکان ہوٹل کی دوسری منزل پر تھا۔ یہ چھ سات کھلے اور ہوا دار کمروں پر مشتمل تھا جو ایک مربع کی شکل میں ایک دوسرے کے درمیان سے ہو کر گزرتے تھے۔ جس کمرے میں لیفٹیننٹ کو بٹھایا گیا وہ پرانے اور قیمتی سامان سے بھرا ہوا تھا۔ دروازوں کے دستوں پر چاندی کا پترا چڑھا ہوا تھا اور بڑی بڑی الماریوں میں بیش قیمت چینی تھالیاں' پیالے' چائے دانیاں اور صراحیاں سج رہی تھی۔ کارنس کے اوپر بھاری بھرکم سنہری چوکھٹے والی مسولینی کی تصویر ٹنگی تھی جس پر سرخ رنگ کا ریشمی غلاف چڑھا دیا گیا تھا۔ آمنے سامنے دیواروں پر چند ایک قدیم اطالوی روغنی تصویریں سجی ہوئی تھیں۔ ان کے رنگ بھدے اور مدھم تھے اور معلوم ہو رہا تھا کہ ان پر سے گرد کبھی نہیں جھاڑی گئی۔ آتشدان کے دونوں بازوؤں پر سرخ گدے دار بوجھل آرام کرسیاں پڑی تھیں اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

درمیان میں پتائی پر چاندی کا سگریٹ کیس اور راکھدان رکھا تھا۔ اس راکھدان میں سلگتا ہوا سگریٹ رکھنے والی جگہ سانپ کے مصنوعی پھن پر بنی ہوئی تھی۔ کمرے کا جو کونا خالی تھا اسے کالے رنگ کے چھوٹے قد کے پیانو نے گھیر رکھا تھا۔ پیانو پر بھی گرد جم رہی تھی اور اس کے اوپر رکھے ہوئے کانسی کے مرتبان نما گلدان میں یوکلپٹس کی صرف ٹہنیاں ہی نیچے لٹک رہی تھیں۔ کھانے کی میز پر لیزا' لیزا کی ادھیڑ عمر موٹی ماں' اس کا باپ اور لینورے تھی۔ کھانا بڑی بے دریغی سے بنایا گیا تھا۔ اس میں گائے کی زبان کے تلے ہوئے قتلے' مچھلی کا حلوا' ابلے ہوئے آلو' بھنے ہوئے مرغ' قیمہ' آلو چوں کا مربہ اور انگور کی شراب بھی شامل تھی۔ انگور کی شراب کا ذائقہ کسیلا تھا جیسے لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ابلا ہوا پانی ٹھنڈا ہو گیا ہو۔ کھانے میں لیفٹیننٹ کو جس چیز کی کمی محسوس ہوئی وہ سرخ مرچ تھی۔ کھانے کے بعد اسی پہلے کمرے میں آ کر گرم گرم سیاہ کافی کا دور چلا۔

لیزا کا باپ چھوٹے قد کا چوڑا چکلا طاقتور اطالوی بوڑھا تھا۔ جس کی حجامت اونچی تھی' سر چھوٹا اور ہٹلری انداز میں مونچھیں تنی ہوئی تھیں۔ گھنی بھنوؤں تلے آنکھوں کا رنگ مٹیلا تھا اور وہ نیم ٹھنڈے کپڑوں میں بڑی مشکل سے پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ گدے دار آرام کرسی پر لیٹ کر اس نے چھوٹی چھوٹی ٹانگیں قالین پر پسار دیں اور سونے کے خلال کو دانتوں میں پھیرتے ہوئے ڈکار نما غراہٹ کی سی آواز نکالی۔

''لینورے بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ان کا گاؤں فلورنس سے 18 میل کے فاصلے پر ہے۔ جنگ سے پہلے میں اپنے ہوٹل کے لیے انگور کی شراب وہیں سے منگوایا کرتا تھا۔ وہاں کے سیاہ انگور میٹھے ہوتے ہیں اور بہت جلد گل سڑ جاتے ہیں۔ ایسے انگوروں کی نہایت عمدہ اور لذیز شراب بنتی ہے''

لیفٹیننٹ مصری سگریٹ سلگائے اس کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہا تھا۔

لیزا سبز رنگ کی چھوٹی چھوٹی لمبوتری پیالیوں میں گرم گرم سیاہ کافی انڈیل رہی تھی اور اس کی ماں چائے پر کھائے جانے والے خاص اطالوی کیک کے لیے باورچیوں کو ہدایات دینے گئی ہوئی تھی۔ لینورے لیزا کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی بڑی دلچسپی سے لیزا کے باپ کی حکایات سن رہی تھی اور اس کے چہرے پر عجیب سی دلکشی تھی' زیادہ کھا جانے سے لیزا کی غلافی آنکھیں بند سی ہو رہی تھیں اور وہ مخموری حالت میں کافی انڈیل رہی تھی۔ اپنا پیالہ اٹھا کر اس نے ہونٹوں سے اسے چھوا اور پھر میز پر رکھتے ہوئے بولی:

''لینورے کو ہم اپنے ہوٹل میں ہی ملازم رکھ رہے ہیں۔ یہ آج سے ہمارے ہاں کام کرے گی اور خوب کھائے گی خوب بچے گی۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ہاں۔'' اس کا باپ سگار کے بادل چھوڑتے ہوئے بولا۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں اور جبکہ ہمارے مہمان لیفٹیننٹ نے اس کی ضمانت بھی دے دی ہے مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ لیکن اسے بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا پڑے گا۔ انگور یہاں کمیاب ہیں۔ ان کی شراب کا یہاں کال ہے اور پھر ہر قسم کے فوجی ہوٹل میں صبح شام آتے رہتے ہیں۔ آج بمباری نہیں ہوئی؟ شاید جرمن طیارے چھٹی منا رہے ہیں۔

اس کے بعد اس نے ایک انتہائی احمقانہ لمبی انگڑائی لی جس میں اس کی ٹانگیں پوری پھیل گئیں اور جبڑے گدھے کے جبڑوں کی طرح کھل گئے وہ اپنے گلے کے اندر دو تین قسم کی آوازیں پیدا کرتے ہوئے کاہلی سے اٹھا اور ریچھ کی طرح بازو ہلاتا سونے کے کمرے کی جانب چل دیا۔

لیزا نے جلدی سے لینورے کے گال چوم لیے جس پر وہ شرم سے لال ہوگئی۔

''اب میری بہن میرے پاس رہے گی۔۔۔۔۔۔۔ سینور! آپ بھی ہمارے پاس آجائیں۔''

لیفٹیننٹ خاموشی سے ہنسنے لگا۔ لینورے اسے کنکھیوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ ''اس کا دل کتنا معصوم ہے! کاش وہ بھی ہمارے ساتھ رہ سکتا'' اپنے آپ ہی اسے میجر گریگوری اور کیپٹن واکر کا خیال آ گیا اور اس نے نفرت سے بھنویں سکیڑ کر خیال ہی خیال میں ان دونوں کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ اس وقت کس قدر ہمشکل معلوم ہو رہے تھے۔ ٹھیک ہے برائی ہر جگہ ملتی جلتی ہے۔

چائے پر جو کیک لایا گیا وہ ایسا تھا جیسے کسی نے پلیٹ میں گول تر کی ٹوپی رکھی ہو۔ باہر سے اس کا رنگ بھی گہرا سرخ تھا اور جب اسے کاٹا گیا تو اندر سے زرد نکلا۔ جس میں جگہ جگہ نیلے رنگ کے ستارے سے بنے ہوئے تھے۔ یہ اطالوی کیک تھا جو اٹلی میں تہواروں کے موقع پر تقریباً ہر ایسے گھر میں تیار ہوتا تھا جہاں چند پیسے فالتو ہوں۔ اس کا ذائقہ سونفی اور میٹھا تھا۔ اس میں کشمش اور بادام بے تحاشا پڑے تھے۔ لیزا چائے کی تین پیالیوں کے ساتھ نصف کے قریب کیک کھا گئی۔ لینورے کو لیفٹیننٹ نے بڑی مشکل سے زبردستی دو ٹکڑے کھلائے۔ اچھی طرح پیٹ بھر کر لیزا شنٹ کرتے سست رفتار انجن کی طرح پیانو کی طرف گئی اور اس کا ڈھکنا کھول کر اسے بجانا شروع کر دیا۔ بھاری بھر کم سامان سے بھرے ہوئے بھدے سے کمرے میں پیانو کے اونچے نیچے کرخت سر سوتے میں اٹھ کر پھرنے والے آدمیوں کی مانند ادھر سے ادھر گھومنے لگے۔ انہیں سن کر دل میں گمان ہوتا تھا کہ پیانو ضرورت سے زیادہ کھا گیا ہے اور واہیات قسم کی ڈکاریں لے رہا ہے۔ لیزا نے پیانوں پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا:

''سینورا یہ موتسارٹ ہے۔ اس میں جرمن قوم کا دل دھڑک رہا ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور لیفٹیننٹ نے جب سروں کو غور سے سنا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے برلن کے کسی عالیشان ہوٹل کے باغ میں شکم پیٹو یہودی کھانے کے بعد چہل قدمی کرر ہے ہوں۔ ان بے ہنگم سروں میں جرمن قوم کا دل نہیں بلکہ لیزا کا معدہ دھڑک رہا تھا۔

شام کو لیفٹیننٹ اپنے کوارٹر میں واپس آیا تو اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ اس نے اسپرو کی دو ٹکیاں پانی کے ساتھ حلق میں اتاریں اور پلنگ پر گرتے ہی سو گیا۔

لیزا کے باپ کے ہوٹل کا نام القاہرہ تھا۔ یہ کوئی اتنا بڑا ہوٹل نہیں تھا بالکل ایسے ہی تھا جیسے قاہرہ کے کاروباری گنجان علاقوں میں درمیانے درجے کے ہوٹل ہوتے ہیں۔ لیکن بن غازی میں اس کی نمایاں حیثیت تھی۔ اس کی وجہ تو یہ تھی کہ کافی پرانا تھا اور شہر کے مشہور حصے میں تھا اور دوسری یہ کہ یہاں خالص اطالوی سیاہ انگوروں کی پرانی شراب مل سکتی تھی۔ جنگ کے باعث شہر کا تمام کاروبار معطل ہو چکا تھا۔ عرب اطالوی' یہودی' سوڈانی' مصری اور ہسپانوی تاجروں' ٹھیکیداروں' چھوٹے موٹے دوکانداروں ور غیر ملکی کمپنیوں کے ملازموں کا القاہرہ میں ہر وقت جمگھٹا سا لگا رہتا تھا۔ صبح سے شام تک کوئی میز خالی نظر نہ آتی تھی۔ ایک ٹولی اٹھ کر جاتی تھی تو دوسری اس کی جگہ آن لیتی تھی۔ جن کے پاس زیادہ پیسے ہوتے وہ انگور کی شراب میں بھگوئے ہوئے زرد اطالوی کیک کھاتے اور اعلیٰ ٹرکش سگرٹوں کا خوشبودار دھواں اڑاتے ہوئے مخمور چہرے اٹھا کر موسیقی کا لطف اٹھاتے جن کے ہاتھ انگوروں کے گچھوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے وہ کھجوروں کی تیز شراب پی کر سستے امریکی سگرٹوں کا لطف اٹھاتے۔ تیسری قسم ایسے لوگوں کی بھی تھی جو ایک جیب سے تمباکو اور دوسری جیب سے کاغذ نکال کر اس کے سگریٹ بناتے اور کافی کی گرم گرم فنجان سامنے رکھ کر بڑے سکون کے ساتھ بیٹھ جاتے اور شام تک بیٹھے رہتے۔ کسی وقت برطانوی' ہندی یا امریکی سپاہیوں کی منڈلی ہوٹل میں آن داخل ہوتی اور اپنی بے معنی گفتگو اور بلند بے ہنگم قہقہوں سے فضا میں شور وغل کے بھنور سے ڈال کر باہر نکل جاتے۔ لیزا کا باپ کاؤنٹر کے آگے ستون کے نیچے آرام کرسی پر نیم دراز سگار منہ میں دبائے چالاک لومڑی کی طرح ہر آنے جانے والے کا جائزہ لیا کرتا۔ چھوٹے سے ڈانس پر گانے والے تعداد میں کم تھے لیکن شور مچانے میں وہ کسی سے بھی کم نہ تھے۔ انہیں دنیا جہاں کی موسیقی میں ٹانگ اڑانے میں مہارت حاصل تھی۔ ابھی اگر رمبھا ہو رہا ہے تو دوسرے لمحے ہسپانوی لوگ گیت شروع ہو گئے ہیں' اور اس کے بعد اچانک عربی دف بجنے لگے ہیں اور رباب پر کسی نے مصری فلم کا کوئی مشہور گیت چھیڑ دیا ہے۔ ہوٹل کا ہال اگرچہ کافی کھلا تھا مگر میزیں اس قدر زیادہ تھیں کہ جوڑوں کو رقص کرتے ہوئے بار بار ادھر ادھر دیکھنا پڑتا تھا اور لوگوں سے جھک کر معذرت کرنا پڑتی تھی۔ رومیل کی کیل کانٹے سے لیس جرمن فوجیں سر پر کھڑی تھیں لیکن القاہرہ میں اگلے سال کے لیے انگور کی شراب سٹور کی جا رہی تی۔ بمباری کے وقت صرف اتنا ہوتا کہ لوگ رقص ادھورا چھوڑ کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ستونوں کے پاس جمع ہو جاتے اور موسیقی بند ہو جاتی۔ اس کے بعد زندگی پھر اچھل کر گرتی ہوتی آبشار کی مانند گیت اور نغموں کی جھنکار میں گم ہو جاتی۔ زندگی کا دریا ہمیشہ آگے کی طرف بہتا ہے۔

لینورے اسی ہوٹل میں ملازم رکھی گئی تھی۔ اس کی ڈیوٹی پانچ بجے شام سے شروع ہوتی اور رات کو بارہ بجے ختم ہو جاتی۔ مکمل بلیک آوٹ کی وجہ سے سرشام ہی القاہرہ ہوٹل کی کھڑکیوں پر سیاہ پردے گرا دیئے جاتے ہیں اور میزوں پر موم بتیاں جلا دی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود دن کی نسبت رات کو وہاں زیادہ رونق اور ہنگامہ ہوتا تھا۔ لینورے کا کام کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر بل بنانا' کھانے پینے کی چیزوں کا حساب رکھنا' گاہکوں کی ضروریات کا خیال رکھنا اور خاص طور پر سے یہ دیکھنا تھا کہ انگور کی شراب ملازم آپس میں خورد برد تو نہیں کر رہے۔ اس کے لیے لیزا کے باپ نے اسے خاص طور سے ہدایت کی تھی۔ شروع شروع میں اسے کافی وقت محسوس ہوئی اور وہ اتنے سارے لوگوں کے ہجوم میں گھبرا سی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ لوگوں کی تیز اور بے باک نگاہوں کی عادی ہوگئی اور وہ بل وصول کرتے وقت خالص کاروباری انداز میں مسکرا کر گاہک کا شکریہ ادا کرتی۔ لیفٹیننٹ عام طور پر اتوار کے روز وہاں آتا اور کسی قریبی میز پر بیٹھ کر کافی منگوا لیتا اور مسکراتے ہوئے لینورے کو بڑی پھرتی سے بل بناتے یا شراب کے پیانے کا بار بار معائنہ کرتے دیکھا کرتا۔ کسی وقت وہ اٹھ کر لیزا کے باپ کے پاس جا بیٹھتا اور اطالوی انگوروں کی نایابی اور کاروبار کی مشکلات پر بورنگ قسم کے لیکچر سنا کرتا۔ پھر وہ کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکا کر لینورے سے ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں شروع کر دیتا۔ لینورے کام میں بھی مصروف رہتی اور ساتھ ساتھ اس کی باتوں کا جواب بھی دیئے جاتی۔ کسی بات پر وہ ہنس پڑتی تو اس کے باریک ترشے ہوئے ہونٹوں کی نازک ٹہنیوں پر آلوچے کے سپید پھول مسکرانے لگتے اور نیلی آنکھوں کے سمندروں پر سنہری دھوپ چمک اٹھتی۔ کسی وقت جب گاہکوں کی آمدورفت ذرا مدھم پڑتی تو وہ گھڑی دو گھڑی کے لیے کاؤنٹر چھوڑ دیتی۔ وہ دونوں کسی کونے والی تنہا میز پر جا کر بیٹھ جاتے اور بڑے سکون کے ساتھ گرم کافی پیتے اور موسیقی سنتے۔ لیفٹیننٹ کی خواہش پر لینورے ڈانس پر اطالوی لوگ گیتوں کی فرمائش کہلوا بھیجتی اور پھر ہوٹل کی جھکی ہوئی بوجھل چھت تلے تمباکو' شراب اور کافی کی مہک میں لمبے درد بھرے سر جاگ اٹھتے۔ لیفٹیننٹ کو اطالوی لوک گیت بہت پسند تھے۔ ان میں وہی بھیگا بھیگا درد' سوز اور تڑپ تھی جو اس نے پنجاب کے پہاڑی نغموں اور بنگال کے ماہی گیروں کے گیتوں میں محسوس کی تھی۔ اطالوی زبان کے بول اس کے لیے بے معنی تھے۔ لیکن آواز کے زیر و بم اور سروں کے اتار چڑھاؤ میں جو رکی رکی فریاد' دھیما دھیما سلگاؤ اور ادھوری تشنگی اور روح کا کرب اور بدن کی پکار لرز رہی تھی اس سے وہ بخوبی واقف تھا۔ الفاظ کے بیش قیمت لبادوں کے نیچے مفہوم کا جسم ہر جگہ ننگا ہوتا ہے اور اس اطالوی لوگ گیت کی تہہ میں اسی مفہوم کے موتی چمک رہے تھے جو پنجابی' بنگالی' ہندی اور برمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زبان کی سیپیوں میں پوشیدہ تھا۔ یہ ایک ہی درد کی ٹیسیں تھیں' ایک ہی غم کا نوحہ تھا اور ایک ہی جنازے کا ماتم کناں تھا۔ اطالوی اور پنجابی زبان میں سات سمندروں کا فاصلہ حائل ہے لیکن اطالوی اور پنجابی آنسوؤں میں کوئی شے حائل نہیں۔ وہ ہر جگہ آنکھوں سے ٹپکتے ہیں اور ہر جگہ نمکین ہوتے ہیں اور یہی وہ پل ہے اور پگڈنڈی ہے اور دروازہ ہے جو ایک سمندر کو دوسرے سمندر سے' ایک کھیت کو دوسرے کھیت سے اور ایک گھر کو دوسرے گھر سے ملاتا ہے!

کبھی کبھی لینورے اسے کسی گیت کا مطلب سمجھانے لگتی اور وہ اپنے سامنے خشک ہونٹوں اور ہاتھوں کی ابھری ہوئی رگوں والی کسان کی تصویر دیکھتا جو فصل بونے کے بعد اداس نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔

''میرے کھیتوں پر سے ابھی ابھی ایک بادل گزرا ہے۔''

اور وہ برسا نہیں

اور وہ برسا نہیں

میں اب گھر جا کر کہوں گا؟

دوسرا بادل کب آئے گا؟

دوسرا بادل کب آئے گا؟

غم کے گیت کسی نہ کسی سوال پر ختم ہوتے ہیں۔ یہ سر ہر بار ایکا ایکی ٹوٹ جاتے ہیں اور یہ گنبد اپنے پیچھے اپنی ہی فریاد اپنی ہی بازگشت چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ ابھی ایک سوال ہے اور لیفٹیننٹ سوچنے لگتا۔ شاید یہ سوال بھی کسی ادھوری فریاد یا ٹوٹے ہوئے سر کی صدائے بازگشت ہو۔ پھر وہ کافی کے تلخ گھونٹ پی کر ان خیالات کو مصری سگریٹ کے خوشگوار فلیور میں تحلیل کر دیتا اور لینورے گول گول خوبصورت ٹھوڑی دونوں ہاتھوں کی مٹھی پر ٹکا کر خواب ایسی آواز میں اسے بتاتی کہ ایسے گیت اٹلی کے دیہاتوں میں بچے بچے کو یاد ہوتے ہیں اور ان کا گاؤں اٹلی کے تمام دیہاتوں سے خوبصورت ہے۔ وہ ایک گرم چشمے کے پاس الپس کے دامن میں آباد ہے۔ بچپن میں وہ اپنی ماں کے ساتھ اس چشمے پر جا کر میلے کپڑے دھویا کرتی تھی۔ پہلے پہل ان کے پاس اپنی زمین تھی لیکن وہ آہستہ آہستہ بکتی گئی اور تھوڑی دیر بعد چند ایک کھیت رہ گئے۔ جب وہ فلورنس کے ہائی سکول میں آئی تو اس کے باپ نے وہ کھیت بھی بیچ ڈالے اور اب صرف انگوروں کا ایک چھوٹا سا باغ ہی رہ گیا تھا جس کی آمدنی بہت کم اور اخراجات بہت زیادہ تھے۔ وہ کچھ خاموش رہتی۔ جیسے ان اخراجات کا حساب لگا رہی ہو اور پھر کہنا شروع کرتی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''اور اب تو وہاں باغ میں کام کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ آپ نہیں جانتے انگور کا باغ بہت محنت طلب کرتا ہے۔ میرا باپ بوڑھا ہو چلا ہے۔ میری بہن ابھی کم سن ہے اور دونوں چھوٹے بھائی شہر میں پڑھ رہے ہیں۔ ان کے تمام اخراجات میری تنخواہ سے پورے ہوتے تھے نہ معلوم اب وہ لوگ کیا کر رہے ہوں گے۔ مجھے ان سے جدا ہوئے ڈیڑھ سال ہی بیتا ہے۔ لیکن یوں لگ رہا ہے جیسے کئی صدیاں گزر گئی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ خدا ان کی حفاظت کرے۔

پھر وہ جیسے ایک دم خواب سے چونک اٹھتی۔

''کافی دیر ہو گئی۔ اب مجھے کاؤنٹر پر جانا چاہیے۔

اور وہ دونوں ایک ساتھ میز پر سے اٹھتے۔ لینورے کاؤنٹر پر جا کھڑی ہوتی اور لیفٹیننٹ اسے اور لیزا کے باپ کو ''شب بخیر'' کہہ کر واپس اپنے کوارٹر کی راہ لیتا۔

وقت اسی طرح گزرتا گیا۔ لیفٹیننٹ ہر روز شام کو ہوٹل القاہرہ میں آتا اور لینورے کے قریب رہ کر کچھ خوبصورت لمحات گزارنے کے بعد واپس چلا جاتا اس دوران میں طبروق اور بن غازی کی جانب جرمن و راطالوی فوجوں کا دباؤ بڑھتا گیا اور پورے مشرق وسطیٰ کے محاذ پر اتحادیوں کے قدم اکھڑنا شروع ہو گئے تھے۔ ایک شام لیفٹیننٹ ہوٹل میں ایا تو اس نے دیکھا کاؤنٹر پر لیزا کا باپ خود کھڑا تھا۔ اسے معلوم ہوا کے لینورے کی طبیعت خراب ہے اور وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہے۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتا لینورے کے کمرے میں پہنچا۔ وہ پلنگ پر چادر اوڑھے نیم دراز تھی اور لیزا اس کے سر پر برف سے بھری ہوئی تھیلی رکھ رہی تھی۔ اسے دروازے میں دیکھ کر لینورے کے چہرے پر افسردہ سا تبسم نمودار ہوا اور اس نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ آہستہ سے اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مجھے ابھی علم ہوا کہ تم بیمار ہو۔۔۔۔۔۔۔ میں ابھی نیچے سے آ رہا ہوں۔''

لینورے کچھ نہ بولی۔ صرف بڑی بڑی پژمردہ آنکھیں کھولے لیفٹیننٹ کو دیکھتی رہی۔ آج ان آنکھوں کی نیلاہٹ دھندلی پڑ گئی تھی اور چہرے پر غمگین سا غبار اڑ رہا تھا۔ لیزا برف کی تھیلی رکھ کر دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ دونوں ایک لمحے کے لیے خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ لیفٹیننٹ کو لینورے کے جسم سے ہلکا ہلکا شیریں سینک سا اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ آپ ہی آپ لینورے کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کیا کرے۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی لینورے۔۔۔۔۔۔اس میں بھلا رونے کی کونسی بات ہے؟ میں ابھی تمہارے لیے ملٹری ہسپتال سے دوائی لاتا ہوں۔

لینورے کچھ نہ بولی۔ وہ شدت سے سسکیاں بھرنے لگی اور اس کا تمام جسم کانپنے لگا۔

''تمہیں پہلے ہی بخار ہے اچھی بے بی۔۔۔۔۔۔رونے سے اور زیادہ ہو جائے گا۔

لینورے سسکیاں روکتے ہوئے کپکپاتی آواز میں بولی:

''یہ بخار نہیں ہے جناب۔۔۔۔۔۔بخار نہیں ہے۔۔۔۔۔۔''

اس کے الفاظ پھر سسکیوں میں ڈوب گئے۔ لیفٹیننٹ دیر تک اس کے سرخ بالوں کو پیار سے سہلاتا رہا اور اسے ہر طرح سے دلاسا دینے کی کوشش کرتا رہا۔ جس لینورے کا جی ہلکا ہو گیا تو اس نے لیفٹیننٹ کے سینے پر سے اپنا سر اٹھایا اور پلنگ سے ٹیک لگا کر رومال سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

''میں اس جگہ سے اکتا گئی ہوں۔ اب میرا یہاں بالکل جی نہیں لگتا۔۔۔۔۔۔رات بھر میں نے اپنی ماں کو خواب میں دیکھا۔ وہ گرم چشمے پر کپڑے دھو رہی تھی اور اس کے گھر کا اگلا حصہ بم اڑا کر لے گئے۔ فلورنس پر بم بھی کر رہے ہیں۔ خدا جانے میرے بھائی کس حالت میں ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ میں اڑ کر ان کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ لیکن نہیں جا سکتی۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں ان کے پاس کبھی نہ جا سکوں گی۔ کبھی نہ جا سکوں گی۔۔۔۔۔۔''

''تم ضرور جاؤ گی لینورے۔۔۔۔۔۔ضرور جاؤ گی۔ ایک نہ ایک دن جنگ ختم ہو جائے گی اور پھر تم آزاد ہو گی اور جہاز میں بیٹھ کر اپنے گھر جا سکو گی۔ وہاں تم اپنی ماں سے ملو گی' باپ سے ملو گی اور ننھی میریا سے ملو گی اور پھر تمہیں کتنی خوشی ہو گی' اور تمہارے گھر میں اس روز کتنی رونق رہے گی جنگ اب بہت جلد ختم ہو رہی ہے۔''

کمرے کا دروازہ کھلا اور لیزا گرم چائے کا پیالہ لیے اندر داخل ہوئی۔ لینورے سنبھل کر بیٹھ گئی۔ لیزا نے جب برف کی تھیلی تپائی پر دیکھی تو غصے میں آ کر بولی۔

''سینور اب بتائیے میں کیا کروں۔ اسے اپنا ذرا سا بھی خیال نہیں ہے وہ دیکھئے برف کی تھیلی پھر وہاں پڑی ہے۔''

لینورے مسکرانے لگی۔ لیفٹیننٹ کو محسوس ہوا جیسے ساون کی لمبی جھڑی کے بعد سورج کی پہلی کرن نے بادلوں کے پیچھے جھانکا ہو۔ وہ بھی مسکرانے لگا اور پھر لیزا بھی ہنس پڑی۔ دو اڑھائی گھنٹے لینورے کے پاس گزارنے' ہنسی مذاق کی باتوں سے اس کا دل بہلانے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

کے بعد لیفٹیننٹ نے اگلے روز آنے کا وعدہ کیا اور ہوٹل القاہرہ کی عمارت سے باہر نکل آیا۔

اس رات جرمن طیاروں نے بن غازی پر سب سے بڑا ہوائی حملہ کیا۔

سمندر کے کنارے کھڑے تینوں جہازوں میں آگ لگ گئی اور اتحادی رسدگاہ کی پوری کی پوری بارک کے پرخچے اڑ گئے۔ شہر میں متعدد عمارتیں جل کر راکھ ہوگئیں اور ہراساں لوگوں نے شدید ضروریات کی چیزیں اٹھا کر طبروق کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ صبح لیفٹیننٹ دفتر گیا تو اس نے دیکھا کے بارک کی آگ ابھی تک نہیں بجھی تھی۔ میجر گریگوری کے کمرے میں سٹاف آفیسروں کی ہنگامی مجلس ہو رہی تھی۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے پرامن پسپائی کے لیے تیار رہنے کے احکامات آ چکے تھے۔ وہ لینورے کے متعلق سوچنے لگا۔ رات شدید بمباری ہوئی تھی۔ بم شہر پر بھی گرائے گئے تھے۔ خدا کرے کہ ہوٹل القاہرہ کی عمارت محفوظ رہی ہو۔ وہ دل ہی دل میں لینورے کے لیے دعا مانگنے لگا۔ وہ تو پہلے ہی بیمار تھی۔ بموں کے دھماکوں نے اس کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہوگا۔ وہ کسی نہ کسی طرح بڑی جلدی سے لینورے کو اپنی پسپائی کے احکامات کی اطلاع دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت ایک پل کے لیے ادھر ادھر نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹھیک چھ بجے شام جبکہ لیفٹیننٹ شہر جانے کے جتن کر رہا تھا' ہیڈ کوارٹر سے فوراً بن غازی چھوڑ دینے کا حکم آ گیا۔ لیفٹیننٹ جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا۔ اس نے کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ لینورے سے ملے بغیر وہاں سے رخصت ہو جائے گا۔ وہ اس المیے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس نے میجر گریگوری سے کہا کہ وہ پانچ منٹ کے لیے شہر سے ایک ضروری چیز لانا چاہتا ہے۔ میجر گریگوری اس ضروری چیز سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے خالص فوجی انداز میں انکار کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس نے شہر کی جانب قدم اٹھایا تو اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ لیفٹیننٹ مجبور ہو گیا۔ اسی رات بن غازی کمانڈ کی پوری کمپنی اپنا بوریا بستر اٹھا طبروق کی طرف کوچ کر گئی۔

مگر رومیل اپنی فوجوں کے ساتھ بڑی تیزی سے مصر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اتحادیوں کے قدم طبروق میں بھی نہ جم سکے۔ چنانچہ انہیں وہاں سے بھاگ کر مصر میں پناہ لینی پڑی۔ تھوڑی دیر بعد مصر کو بھی جرمنوں نے تین اطراف سے گھیر لیا اور اتحادی پیچھے ہٹتے ہٹتے ایران کے سرحدوں تک جا پہنچے۔ ابھی تک مشرق وسطیٰ کی کمانڈ جنرل ویول کے ہاتھ میں تھی۔ ویول کافی حد تک ناکام ثابت ہوا اور اس کی جگہ جنرل منٹگمری نے لے لی۔ جنرل منٹگمری کی قیادت میں اتحادی فوجوں نے مصر کی ہر جانب سے جرمنوں کے خلاف بڑے وسیع پیمانے پر حملہ شروع کر دیا۔ برما' روس اور مشرقی یورپ میں بھی اتحادیوں کو پے در پے فتوحات حاصل ہو رہی تھیں اور دشمن ہمت ہار چکا تھا۔ اس کے باوجود رومیل نے سخت مدافعت کی لیکن طبروق سے مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا۔ اتحادیوں نے طبروق پر دوبارہ قبضہ کرنے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے بعد بن غازی پر اندھا دھند ہوائی حملے شروع کر دیئے۔ بحیرہ روم میں سسلی اور شمالی افریقہ کی طرف سے بھی جرمنوں کی سپلائی لائن قریبا قریبا توڑ دی گئی۔ آٹھویں فوج کے جانبازوں نے ایک بار پھر ولندیزی اور امریکی طیاروں کی چھاؤں میں بن غازی کی سمت بڑھنا شروع کر دیا اور بن غازی پر دوبارہ قبضہ ہو گیا۔

فوج کے ٹرک شہر میں سے گزرے تو لیفٹیننٹ نے چاروں طرف گرے پڑے مکانوں کا ملبہ دھوآں اگلتی دیواریں ہی دیکھیں۔ ان کے اپنے طیاروں نے شہر کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جرمنوں نے پیٹرول اور گولہ بارود شہر کے سکولوں' عبادت گاہوں اور ہوٹلوں وغیرہ جمع کر رکھتا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتے ایسا ہی کرتے تھے۔ چنانچہ کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں سے وہ پسپا ہوئے ہوں اور وہاں کوئی عمارت سالم رہ گئی ہو۔

اس روز لیفٹیننٹ کمپنی کیمپ چھوڑ کر شہر نہ آ سکا۔ دوسرے دن تین چار بجے کے قریب اس نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور بجلی ایسی تیزی سے شہر پہنچ گیا۔ شہر پہنچ کر اس نے وہی بات دیکھی جس کا اندیشہ کھائے جا رہا تھا۔ بڑے بازار میں دونوں جانب مکان ابھی تک دھواں دے رہے تھے۔ جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر لگے تھے۔ لوگ اپنے اپنے مکانوں کے ڈھیر تلاش کر رہے تھے اور عورتیں روتے ہوئے بچوں کو چپ کرا رہی تھیں۔ چاروں طرف ویرانی اور سنگین اداسی چھائی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر لیفٹیننٹ رک گیا۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہاں تین ماہ پہلے ہوٹل القاہرہ کی خوبصورت دو منزلہ عمارت کھڑی تھی اور اب وہاں دروازے تھے اور کمرے غائب تھے' چند ایک لڑکھڑاتی دیواریں تھیں اور چھتیں اڑ چکی تھیں۔ ہوٹل کے صدر دروازے کے سامنے والے بڑے ستون پر عربی زبان میں صرف اتنا لکھا ہی باقی تھا۔

''اطالوی سیاہ انگور کی شراب اور کھانے کے۔۔۔۔۔۔۔''

باقی کا آدھا حصہ اڑا ہوا تھا۔

لیفٹیننٹ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں تھوڑا عرصہ پہلے وہ لینورے کے پہلو میں بیٹھا کافی اور مصری تمباکو کے خوشگوار قلیور میں اطالوی لوک گیت سنا کرتا تھا۔ وہ کبھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اس کے سامنے لگے ہوئے ملبے کے ڈھیروں میں سرخ بالوں اور نیلی آنکھوں والی لینورے اور لیزا اس کا پیانو اور مجسمے اور خوبصورت تصویریں دفن ہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے اور پھر یہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ زیادہ دیر اس جگہ کھڑا نہ رہ سکا۔ اس نے موٹر سائیکل گھمائی اور ایک پل کے لیے کچھ سوچنے کے بعد شہر کے بڑے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہسپتال کی دو منزلہ عمارت کا عقبی حصہ بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ بڑے دروازے کی سیڑھیوں پر زخمی عارضی شامیانوں تلے پڑے کراہ رہے تھے۔ نچلی منزل میں زخمیوں کی چار پائیاں ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی تھیں اور نرسیں سپید کٹھ پتلیوں کی طرح ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ اپنے اپنے عزیزوں کو دیکھنے آئے ہوئے مردوں عورتوں اور بچوں کا ایک ہجوم تھا جو لمبے وارڈ کے باہر جمع تھا۔ لیفٹیننٹ نے وارڈ کے باہر لگی ہوئی زخمیوں کی فہرست دیکھی اس میں وہ نام نہیں تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ کچھ مطمئن اور کچھ ناامید سا ہو کر دوسری منزل پر آ گیا۔ یہاں بھی پہلی منزل ایسا عالم تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے فہرست پر عربی اور انگریزی میں لکھے ہوئے نام پڑھنے شروع کر دیے۔ ایک نام پر پہنچ کر وہ ایک دم رک گیا اور اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ یہ نام لیزا کے باپ کا تھا۔ اس کے بستر کا نمبر 215 تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سرد اور ویران سے لمبے چوڑے وارڈ میں زخمیوں کے درمیان سے ہو کر گزر رہا تھا۔ بستر نمبر 213 کے قریب کھڑے ہو کر اس نے تیسرے بستر پر ایک آدمی کو سپید چادر اوپر کئے لیٹے دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ چادر سے باہر مردہ ٹہنیوں کی طرح بستر سے نیچے لٹک رہے تھے اور وہ پاگلوں کی طرح آنکھیں کھولے منجمد نگاہوں سے چھت کو تک رہا تھا۔ لیفٹیننٹ کچھ دیر اس جگہ بت کی مانند کھڑے رہنے کے بعد بستر نمبر 215 کے پاس آیا اور اس پھٹی پھٹی آنکھوں اور مردہ چہرے والے زخمی کے نزدیک کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیزا کے باپ نے کوئی حرکت نہ کی۔ اس کا رنگ ہلدی ایسا ہو گیا تھا' گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اگر لیفٹیننٹ نے باہر فہرست پر نام نہ پڑھا ہوتا تو وہ اسے بالکل نہیں پہچان سکتا تھا۔ اس بوڑھے زخمی اطالوی اور لیزا کے باپ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ہسپتال کے بستر پر چت لیٹا تھا اور وحشیوں کی طرح ٹکٹکی باندھے چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کی مونچھوں کے بال بڑھ گئے تھے اور ماتھے پر دائیں جانب کسی زخم کے لمبے نشان پر آیوڈین کا زرد نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ لیفٹیننٹ نے آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔۔ وہ ٹھنڈا اور خشک تھا۔ لیزا کے باپ کے نے چھت پر سے نظریں ہٹا کر ویران اور خاموش نگاہوں سے لیفٹیننٹ کو یوں دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو

''میں آپ کے گھر آیا کرتا تھا۔ آپ نے مجھے اطالوی کیک کھلایا تھا۔ آپ کو یاد ہے نا؟ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

زخمی انسان خاموش رہا۔ لیفٹیننٹ قدرے اونچی آواز میں جھک کر بولا۔

''لیزا کہاں ہے؟''

زخمی پھر بھی خاموش رہا۔

''لینورے کہاں ہے؟ میں اسے بخار میں چھوڑ کر گیا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ کہاں ہوگی؟"

لیزا کے باپ نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ برف کی طرف سرد اور پتھر کی طرح بے جان آنکھیں کھولے لیفٹیننٹ کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور پہلے کی مانند چھت کو ٹکٹکی لگا کر گھورنے لگا۔ اتنے میں ایک نرس وہاں آ گئی۔ لیفٹیننٹ نے کھڑے ہو کر اس سے بہت کچھ پوچھا۔ جس کے جواب میں نرس نے صرف اتنا کہا:

"بم اس کے ہوٹل پر گرا تھا۔ اس کے ہاں کوئی نہیں بچ سکا۔ اسے ملبے کے نیچے سے نکالا گیا تھا اور وہ جب سے یہاں آیا ہے اسی طرح چپ ہے۔

اتنا کہہ کر نرس نے غالباً پٹی بدلنے کے لیے لیزا کے باپ کے جسم پر سے چادر ہٹائی تو خوف کے مارے لیفٹیننٹ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ زخمی کی دونوں ٹانگیں اوپر تک کٹی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد وہ وہاں نہ ٹھہر سکا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہسپتال سے باہر نکل آیا۔

جنگ ختم ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی پردیس میں آئے ہوئے فوجی اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

لیفٹیننٹ بھی واپس ہندوستان آ گیا۔ پہلے پہل اس کا جی کہیں نہ لگتا تھا۔ چوبیس گھنٹے اس کی آنکھوں میں لینورے لیزا اور اس کے باپ کی وحشتناک صورت گھومتی رہتیں۔ ہر روز رات کو وہ خواب میں بیمار لینورے کو پلنگ پر لیٹے دیکھتا۔ اس کے سرخ بالوں میں آگ سی لگی ہوتی اور وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے سسکیاں بھر رہی ہوتی۔

"میں گھر جانا چاہتی ہوں جناب۔۔۔۔۔۔۔۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔"

لیفٹیننٹ نے ایک ماہ کی رخصت لی اور کشمیر چلا آیا۔ اس کا خیال تھا پہاڑوں اور وادیوں کی فضاؤں میں وہ لینورے کا دردانگیز خیال اپنے دل سے نکال سکے گا۔ لیکن یہاں پہنچ کر یہ دورہ اور زیادہ چمک اٹھا۔ سری نگر میں صرف پندرہ دن ہی بمشکل گزار کر لیفٹیننٹ واپس پنجاب آ گیا۔

وقت ہر غم کو بھلانے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ یہ کشمیر کی وادیوں سے زیادہ مہربان اور ہمدرد ہے۔ یہ جوں جوں گزرتا جاتا ہے۔ غموں کے خشک پتے ہمارے درختوں سے جھڑتے جاتے ہیں۔ وقت گزرتا گیا اور لیفٹیننٹ بھی لینورے کو اس شدت سے یاد نہ رکھ سکا۔ آٹھ سال بیت گئے۔ اس دوران میں اس کی ایک بڑے اچھے گھرانے میں شادی ہوگئی اور وہ دو بچوں کا باپ بھی بن گیا۔ پھر ہندوستان تقسیم ہوگیا اور وہ اپنی رجمنٹ کے تمام مسلمان آفیسروں کے ساتھ پاکستان اٹھ آیا۔ پاکستان آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس نے کپتانی کا عہدہ حاصل کرلیا اور جب آٹھویں پنجاب رجمنٹ کے پہلے تین افسروں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا جانے لگا تو ان میں اس کا نام بھی تھا۔ وہ لندن پہنچ گیا۔ دسمبر میں کرسمس کے تہوار پر پندرہ دنوں کے لیے فوجی کالج بند ہوا تو وہ فرانس سے ہوتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوا اٹلی آ گیا۔ اس کے دل میں یہ چھپی ہوئی خواہش بدستور موجود تھی کہ وہ لینورے اس بدنصیب اطالوی لڑکی کے گاؤں جائے اور اس کے ماں باپ سے مل کر اس کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرے۔ ایک رات میلان میں آرام کرنے کے بعد وہ پھولوں کے شہر فلورنس پہنچ کر رک گیا۔ لینورے نے اسے جو کچھ بتایا ہوا تھا اس میں اسے صرف اتنا ہی یاد تھا کہ اس کے گھر کے باہر احاطے کے پاس سپیدے کا گھنا درخت ہے اور اس کے گاؤں کا نام دیانسے ہے جو فلورنس سے اٹھارہ میل پر ہے۔

دیانسے جانے والی گاڑی صبح آٹھ بجے چل کر پندرہ منٹ کے اندر ہی اندر ایک چھوٹے سے پرسکوں دیہاتی سٹیشن پر جا کر ٹھہر گئی۔ وہ یہاں اتر پڑا۔ اس نے فوجی وردی کی بجائے عام گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ اٹیچی کیس اس نے کلوک روم میں رکھ دیا اور خود اس پتلی سی خوبصورت درختوں میں سے گزرتی ہوئی سڑک پر چل پڑا جو دیانسے گاؤں کو جاتی تھی۔ اس گاؤں کی آبادی زیادہ نہیں تھی۔ ڈھلوانی چھتوں اور لمبے لمبے دودکشوں والے یک منزلہ پرانے مکان درختوں اور کھیتوں کے درمیان بے نیازی سے کھڑے تھے اور چمکیلی دھوپ میں کہیں سے بھینس کے ڈکرانے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ جب وہ پورے گاؤں کے دو تین چکر لگا چکا تو ایک کسان نے جس کی ناک دسمبر کی سخت سردی میں سرخ ہو رہی تھی پتھر کے چھوٹے سے پل پر کلہاڑی کا پھل گھساتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا:

"تم کہاں جانا چاہتے ہو سینور؟"

وہ کچھ نہ بولا۔ وہ اس کسان کو کیا کہے کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ پھر فوراً وہ بول اٹھا:

"جہاں گرم چشمہ ہے اور انگوروں کا باغ"

کسان نے کلہاڑی والا ہاتھ پھیلا کر ایک طرف اشارہ کیا۔

"ان درختوں ک پاس جاؤ سینور۔۔۔۔۔۔۔"

وہ جلدی سے ان درختوں کے پاس پہنچ گیا جہاں گرم پانی کا چشمہ تھا اور انگوروں کے باغ۔

چشمے کی طرف عورتوں کے کپڑے دھونے اور بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور انگوروں کے باغ میں سے وہ گزر رہا تھا۔ جھکے ہوئے چھاپوں پر انگور کی بیلیں سردی میں سوکھ گئی تھیں اور زمین پر سنہری، بھورے اور زرد پتوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ باغ کے آخر پر جا کر اس نے سپیدے کا ایک گنجان درخت دیکھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کیا خبر لینورے کہیں پاس ہی لکڑیاں جمع کر رہی ہو۔ درخت کے نیچے سورج کی ترچھی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ سامنے لکڑی کی باڑھ والا ایک احاطہ سا تھا جس کے ساتھ ہی لمبی چمنی والے ایک منزلہ مکان کے آگے ایک بوڑھی عورت الگنی پر گیلے کپڑے پھیلا رہی تھی۔ اس کے پاؤں ٹخنوں تک بوٹ میں تھے اور سر پر نیلا رومال بندھا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھا۔قریب ہی باورچی خانے کے باہر ایک نوجوان لڑکی گائے کا دودھ دوہنے کے لیے اس کی ٹانگوں میں رسی ڈال رہی تھی۔نہ جانے کیوں خود بخود ہی وہ آگے بڑھا اور احاطے کی باڑھ کے پاس پہنچ کر بولا۔

''مجھے سردی لگ رہی ہے اچھی بہن۔کیا یہاں سے کافی کا ایک پیالہ مل سکے گا؟''

لڑکی نے چونک کر اسے دیکھا اور برتن زمین پر رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔وہ ٹھٹک سا گیا۔اس پر لینورے کو دھوکا ہو رہا تھا۔اس کی شکل لینورے سے بے حد ملتی تھی۔صرف بالوں کا رنگ ذرا سا ہی مائل بھورا تھا۔اب لڑکی کی ماں بھی اسے دیکھ رہی تھی۔بوڑھی عورت ایک ہاتھ پیٹھ پر رکھے قدم قدم چلتی اس کے پاس آئی اور احاطے کا دروازہ کھول کر بولی:

''اندر آ جاؤ اجنبی''

پھر اس نے لڑکی کو آواز دی

''میریا جلدی سے کافی تیار کرو''

یہ میریا تھی۔لینورے کی چھوٹی بہن۔اسے یوں محسوس ہوا جیسے مکان میں لینورے بھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔جس کمرے میں اسے بٹھایا گیا وہاں سامان بڑا مختصر تھا اور پرانے فیشن کا تھا۔صوفے کے گدوں میں سوکھا گھاس بھرا تھا جو ایک دو جگہ سے باہر جھانک رہا تھا۔آتشدان میں لکڑی کا بڑا سا بجھا ہوا لنڈھ پڑا تھا۔ایکا ایکی اس کی نگاہ آتشدان کے اوپر گئی اور اس کا دل اچھل کر حلق کے قریب آ گیا۔

کارنس کے اوپر درمیانے سائز کی سیاہ چوکھٹے والی لینورے کی تصویر پڑی تھی۔وہ فوجی لباس میں تھی اور سر پر کشتی نما ٹوپی پہنے مخصوص انداز میں مسکرا رہی تھی۔اس کی ماں لکڑیوں کو آگ دکھاتے ہوئے بولی:

''ہم غریب لوگ ہیں سینور۔ہم چوبیس گھنٹے کمرہ گرم نہیں رکھ سکتے۔''

وہ کچھ نہ بولا اور بدستور لینورے کو اپنے سامنے مسکراتے دیکھتا رہا۔بوڑھی عورت نے اجنبی کو اپنی بیٹی کی تصویر دیکھتے پا کر ہلکی سی آہ بھری اور سوگوار لہجے میں کہا:

وہ ہماری خاطر فوج میں چلی گئی تھی اور آج تک واپس نہیں آئی۔فلورنس کے بڑے دفتر سے صرف یہی اطلاع آئی تھی کہ وہ دشمن کی قید میں ہے۔اس کے بعد اس نے بن غازی سے ایک خط لکھا اور پھر کوئی خبر نہ ملی۔اس بات کو نو سال ہو گئے ہیں۔اس کا باپ مرتے دم تک اس کا منتظر رہا۔خدا جانے وہ کہاں ہے۔اگر وہ زندہ ہے تو خدا اس کی حفاظت کرے اور اسے جلد اپنے گھر پہنچائے اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اگر۔۔۔۔۔۔۔"

بوڑھی عورت رک گئی اور سینے پر صلیب کا نشان بنا کر کانپتے ہوئے ضعیف ہاتھ سے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھنے لگی۔ میریا کافی کا پیالہ لیے اندر داخل ہوئی۔ پیالہ میز پر رکھ کر وہ اپنی ماں کے پاس کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔ کافی گرم تھی اور اس کا ذائقہ جلی ہوئی لکڑی ایسا تھا۔ اس نے کافی کے دو گھونٹ پی کر مدھم آواز میں کہا:

"کیا آپ مجھے اپنی بیٹی کا خط دکھا سکتی ہیں؟ شاید میں کچھ اندازہ لگا سکوں"

"ضرور دیکھو میرے بچے۔۔۔۔۔۔۔میریا! میرے صندوق میں سے لینوز کا وہ خط نکال لاؤ بیٹی۔"

خط اطالوی زبان میں تھا۔ میریا نے شکستہ انگریزی میں اس کا ترجمہ کر کے سنایا۔ لینورے نے یہ خط بن غازی سے ان دنوں لکھا تھا جب شہر پر رومیل کی فوجوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کی عبارت کچھ اس طرح تھی۔

"پیاری ماں!

بن غازی پھر ہمارے پاس آ گیا ہے۔ میں تمہیں تفصیل کے ساتھ کچھ نہیں لکھوں گی۔ میرے ساتھ یہاں ایک دلچسپ واقعہ ہوا ہے جس نے میری زندگی اور میرے خیالات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ میں بہت جلد تمہارے پاس آ رہی ہوں۔ ساری باتیں زبانی بتاؤں گی۔ اور ماں! میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ تم برا نہ مانو گی اماں؟ اگرچہ یہ ہماری خاندانی روایات کے خلاف ہے لیکن ماں میں مجبور ہوں۔ میں یہاں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ وہ فوج میں ہے۔ پھر کیا ہوا۔ ہم اسے اپنے گاؤں لے آئیں گے اور انگور کے باغ میں مل کر کام کریں گے۔

ابا کی طبیعت کیسی ہے؟ یہ خط اسے نہ دکھانا۔ میریا کو پیار۔" چھوٹے بھائیوں کے لیے کچھ روپے بھیج رہی ہوں"

تمہاری بیٹی ...."لینورے ایمیل"

خط سن کر اس پر عجیب سی خود فراموشی کی حالت طاری ہو گئی۔ وہ کچھ سن بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ کچھ دیکھ بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ اس نے خواب ایسی کیفیت میں بوڑھی میزبان اور نیک صورت میریا کا شکریہ ادا کیا اور مکان سے باہر چل دیا۔ باورچی خانے کی دیوار کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے آلوچے کا پیڑ دیکھا۔ جس کی شاخوں پر سے پتے جھڑ چکے تھے اور سیاہ لمبی ٹہنیاں سوال بن کر اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ پیڑ کے پاس جا کر اس نے کانپتے ہاتھوں سے اسے آہستہ سے چھوا اور یوں پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا گویا وہ کسی کے سرخ اور بھورے بال ہوں۔ پھر اس نے بوجھل قدموں سے احاطے کا صحن عبور کیا اور انگور کے خزاں نصیب باغ میں سے ہوتا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خشک پتوں کے زرد اور سنہری قالین پر سے گزرتا سٹیشن جانے والی سڑک پر آ گیا۔ سپیدے کے گنجان شاخوں والے درخت اس پر جھکے ہوئے تھے اور پتلی سڑک دسمبر کی قہر آلود سردی میں دھندلی اور ویران تھی۔ پتھر کے پل پر وہ کسان ابھی تک بیٹھا تھا۔ کلہاڑی اس کے پاس پڑی تھی اور وہ مٹیالے رنگ کے بھدے پائپ میں تمبا کو بھر رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں وہ اطالوی لوک گیت یاد آ گیا جو اس نے لینورے کے پاس بیٹھے ہوئے ہوٹل میں القاہرہ میں سنا تھا۔

''میرے کھیتوں پر سے ابھی ابھی ایک بادل گزرا ہے

اور وہ برسا نہیں

اور وہ برسا نہیں

میں اب گھر جا کر کیا کہوں گا؟

دوسرا بادل کب آئے گا؟

دوسرا بادل کب آئے گا؟''

پھر اپنے آپ اس کی نگاہوں میں لمبے قد اور چھریرے بدن کی ایک لڑکی کی شکل آ گئی جس کے بال سرخ تھے جیسے پر پیچ شعلے منجمد ہو گئے ہوں۔ جس کی آنکھیں نیلی تھیں اور جس نے بالوں میں آلوچے کے سپید پھول سجا رکھے تھے اور جس نے ایک شام اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں بھرتے ہوئے کہا تھا:

''میرا یہاں جی نہیں لگتا جناب میں گھر جانا چاہتی ہوں۔

میں گھر جانا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔''

کیپٹن نے چینی ہلا کر چائے کا پیالہ ڈاکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس لڑکی کے متعلق میں تمہیں پھر کبھی بتاؤں گا۔''

دونوں دوست خاموشی سے چائے پینے لگے۔ باہر بارش مدھم ہو گئی تھی اور کھڑکی کے شیشوں پر بادلوں کے سائے سے گزر رہے تھے۔

◆◆◆

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کچھ یادیں کچھ آنسو

تمہیں سٹیشن پر چھوڑ کر میں ابھی ابھی اپنے کمرے میں آیا ہوں۔

تھوڑی دیر پہلے تم اس چھوٹے سے کمرے میں موجود تھیں اور میرے قریب پلنگ پر بیٹھیں تھیں اور موم بتی کی دھیمی روشنی میں ہم ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ تمہاری اداس پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور تم کہہ رہی تھیں:

''اب کیا ہوسکتا ہے؟ اب کچھ نہیں ہوسکتا''

تمہاری آواز میں افسردگی تھی' غم تھا سوگ تھا۔ جیسے شام کی ہوا جھڑے ہوئے پتوں پر سے گزر رہی ہو۔ تمہاری کلائی پر سنہری گھڑی بندھی تھی۔ تمہارے گلے میں سونے کی ست لڑی تھی اور میرے دونوں ہاتھ خالی تھے اور موم بتی کی روشنی مدھم ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔اب یہاں کوئی نہیں۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا ہے۔ مجھے اس کمرے کی خاموشی بہت عزیز ہے' اسی خاموشی کے بستر پر تمہاری آواز کی لہریں سو رہی ہیں۔ تم یہاں نہیں ہو' لیکن تمہارے بالوں کی مہک' تمہارے کپڑوں کی سرسراہٹ' تمہارے جسم کا لمس اور تمہاری گفتگو کے پھول یہاں موجود ہیں۔ پلنگ پر جہاں تم بیٹھی تھیں سپید چادر کی شکنیں اسی طرح ہیں۔ گلدان کو تم نے میز پر سے اٹھا کر کارنس پر رکھ دیا تھا۔ وہ اسی جگہ پڑا ہے اور نرگس کے زرد پھولوں نے اپنے سر جھکا دیے ہیں۔ میز کے کونے پر جلی ہوئی بتی ختم ہوگئی تھی اور میز کی سطح جلنے لگی تھی اور میں نے اس پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ایسا ہی داغ میرے دل کی سطح پر بھی ہے۔ یہ اس موم بتی کی نشانی ہے جس پر میں نے تمہارے نام لکھ کر اپنے دل میں روشن کیا تھا۔ یہ داغ ہمارے شگفتہ اور چمکیلے ماضی کا وہ اہرام ہے جس کے تاریک خانے میں ہماری محبت کی ملکہ دفن ہے۔ یہ ہمارے پیار کا آخری نشان ہے' ہماری بہار کا آخری پھول ہے اور ہمارے سایہ دار راستے کا آخری درخت ہے' اسی درخت کی چھاؤں میں ہم پھر کبھی نہ ملنے کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں۔

میرا کمرہ ویران ہے۔

الماری میں لگی ہوئی گرد آلود کتابیں خاموش ہیں۔ روشن دان میں سے غروب آفتاب کی اداس روشنی اندر آ رہی ہے۔ فضا میں افسردگی کا غبار سا اڑ رہا ہے۔ میرے تمام سگریٹ ختم ہوگئے ہیں۔ کیپسٹن کا ایک بجھا ہوا ٹکڑا میں نے کتابوں کے پیچھے سنبھال کر رکھ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھوڑا تھا۔ یہ ٹکڑا میری انگلیوں میں سلگ رہا ہے اور میں اس دردانگیز تنہائی میں تمہاری آواز کی صدائے بازگشت سن رہا ہوں' تمہارے بدن سے اٹھتی ہوئی خوشبو سونگھ رہا ہوں اور تمہارے تنفس کی حدت کو اپنے دل کے قریب محسوس کر رہا ہوں۔

کنیز! مجھے بتاؤ وہ روشنی کہاں چلی گئی جو تمہارے ساتھ اس کمرے میں آئی تھی؟

وہ کارواں کدھر کھو گئے جن کی گھنٹیوں کی آوازیں میری وادیوں میں گونج رہی تھیں؟ میرا سگریٹ ختم ہو رہا ہے اور وقت کے سمندر پر میری گمشدہ محبت کے جزیرے ایک کر کے ابھرتے چلے آرہے ہیں۔ تین پرسکون سال چمکیلی اور گرم دھوپ میں بسر کرنے کے بعد ان جزیروں کو پھر سمندری طوفانوں نے گھیر لیا ہے۔ دو روز پہلے نیلے آسمان تلے سمندر خاموش تھا اور درختوں کے پتے سنہری دھوپ میں سو رہے تھے اور میں انگور کی بیل کے سائے میں گھاس پر لیٹا تمباکو کو پی رہا تھا۔ دو روز بعد آسمان سیاہ بادلوں میں چھپ گیا ہے اور سمندر کی بپھرتی ہوئی موجیں چٹانوں سے ٹکرا رہی ہیں اور موسلا دھار بارش میں تناور درخت اکھڑ اکھڑ کر بہے چلے جا رہے ہیں۔ اس خوفناک طوفان نے مجھے گھنے اور تاریک جنگل میں اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ میرے چاروں طرف بارش کی دھواں دار چادر تنی ہے' اور بادلوں کی بھیانک گرج میں سمندر کا مہیب شور گم ہو رہا ہے۔

کچھ سجھائی نہیں دیتا' طوفان کب تھمے گا؟

سورج کب نکلے گا؟

کاش! میں تمہارے خالہ زاد بھائی سے کبھی نہیں ملتا۔ یہی بارش کا وہ پہلا قطرہ ہے جو اپنے ساتھ سمندروں کے خوفناک طوفان لایا۔ اتنی دیر تم سے جدا ہو کر مجھے تمہارے بغیر زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔ تم سے دور ہو کر میں زندگی کے اور قریب آ گیا تھا۔ میں تمہیں بھلا نہیں سکتا۔ لیکن تمہاری محبت کی انجیل کو جزدان میں لپیٹ کر اوپر طاق میں ضرور رکھ چکا تھا کہ اچانک تمہارے خالہ زاد بھائی سے ملاقات ہو گئی اور اس نے کافی ہاؤس میں پائپ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا:

''پرسوں کنیز کا نکاح تھا۔۔۔۔۔۔''

اور طاق مقدس انجیل سمیت زمین پر آن گرا اور میں نے جلدی سے انجیل کو سینے سے لگا لیا اور کافی ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ مال پر ہر شے اپنے معمول کے مطابق تھی۔ کاریں گزر رہی تھیں۔ لوگ پیدل آجا رہے تھے۔ کسی کو تمہارے نکاح کی خبر نہ تھی۔ کسی کو تمہارے نکاح کی پرواہ نہ تھی۔ کچھ دیر میں بس سٹینڈ پر کھڑا رہا۔ بس آئی تو لارنس کی طرف پیدل چل پڑا۔ دو لڑکے میرے قریب سے گزرے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک نے کہا: "پرسوں ہمارا ایسی فائنل تھا۔۔۔۔۔۔۔"

اور میں نے تمہارے خالہ زاد کی آواز سنی۔"

"پرسوں کنیز کا نکاح تھا۔۔۔۔۔۔"

لارنس باغ ویران سا تھا۔ دھوپ کا رنگ پھیکا زرد تھا اور خشک سی ہوا چل رہی تھی۔ کنیز! وہ کتنا اداس دن تھا۔ محسوس ہوتا تھا وہ کائنات کا آخری دن ہے۔ میں ایک سوکھے نالے کے قریب بنچ پر بیٹھ گیا۔ میرے اوپر آم کے درخت کا سایہ تھا۔ گھاس پر پتے بکھرے ہوئے تھے میں نے پائپ سلگا لیا۔ فضا میں تمباکو کی افسردہ خوشبو پھیل گئی۔

"چک چک چک"

آم کی گھنی شاخوں میں کوئی پرندہ بولا۔

چپ' چپ' چپ

میں چپ تھا خاموش تھا' مجھے اپنے آپ پر کسی جلاوطن کا شبہ ہو رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر آ گیا تو مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔ محلے دار مجھے مشکوک نگاہوں سے گھوریں گے اور میری بہنیں مجھے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر دروازہ بند کر لیں گی۔ ابھی لحظہ بھر پہلے میں لوگوں کو خندہ پیشانی سے اپنا خیر مقدم کرتے دیکھ رہا تھا۔ درخت خوشی سے اپنے بازو ہلا رہے تھے اور پرندے میرے قہقہوں کا ساتھ دے رہے تھے اور سڑکیں مجھے اپنے فٹ پاتھ پیش کر رہی تھیں اور اب ہر شے نے منہ موڑا تھا۔ پرندے چپ تھے۔ درخت ساکت تھے اور سڑکیں ویران تھیں۔ یہ ایک ہی پل میں جدائی کی خلیج کہاں سے حائل ہو گئی؟ یہ آن کی آن میں بے رخی کا قطب مینار کیسے تعمیر ہو گیا؟ یہ سب کچھ پرسوں کیوں نہیں ہوا؟ پرسوں تمہارا نکاح تھا۔ پرسوں سورج کو گہن کیوں نہیں لگا؟ پرسوں کا دن کتنی آسانی سے گزر گیا تھا۔ لیکن آج کا دن کیوں نہیں گزر رہا تھا۔ آج تو کسی مسجد کا گنبد نہیں گرا تھا۔ آج تو تمہارے خالہ زاد بھائی نے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ تم ہمیشہ کے لیے کسی کی ہو گئی ہو۔۔۔۔۔۔ لیکن اس نے مجھے یہ بھی کیوں' بتایا؟ آخر میں تم لوگوں کا کیا لگتا ہوں؟ مجھے کسی کے بیاہ شادی سے کیا سروکار؟

کاش! اس روز میں تمہارے خالہ زاد بھائی سے نہ ملتا!

تم سے جدا ہو کر میں نے زندگی کے تین سال ہنستے کھیلتے گزار دیئے تھے۔ میں ان تین لق و دق صحراؤں میں سے یوں گزر گیا تھا جیسے ہنس مکھ بچوں کی ٹولی نہر کے پل پر سے گزر جاتی ہے۔ لیکن اب ہر سال ایک مہیب پہاڑ کا روپ دھارے میرے سامنے کھڑا ہے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اوراس کی برف پوش چوٹی دھند میں گم ہے اور زندگی ہمالیہ کا طویل سلسلہ ہے جہاں تاریک گھاٹیاں ہیں۔ خطرناک جنگل ہیں۔ نوکیلی چٹانیں ہیں اور خونخوار درندے ہیں اور کوئی ریسٹ ہاؤس نہیں۔۔۔۔۔۔۔کوئی کیفے نہیں' کوئی سگریٹ نہیں' کوئی دوست نہیں

میں پائپ جیب میں ڈال کر اٹھا اور گھر کی جانب چل پڑا۔

گھر پیارا گھر! ہماری آخری پناہ گاہ!

لیکن کنیز! میرا گھر میرے راستے کا اولیں پتھر ہے۔ میرے گھر نے مجھے کبھی پناہ نہیں دی۔ اس نے کبھی میرے دل میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی' اور کبھی میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہمدردی کے دو بول نہیں کہے۔ میں اگر ہنستا ہوا آیا ہوں تو اس نے آنسوؤں سے میرا استقبال کیا ہے۔ میں روتا ہوا گیا ہوں تو اس نے قہقہوں سے میرے غم کا مذاق اڑایا ہے۔ میں نے چمکیلی دھوپ کی بات کی ہے تو اس نے بھری برسات کا ذکر چھیڑا ہے' اور میں نے گلاب کی ٹہنیاں پیش کی ہیں۔ تو اس نے آٹے کا خالی کنستر آگے کر دیا ہے۔ پھول اور کنستر۔۔۔۔۔۔۔میں اور میرا گھر!

میں گھر کی سیڑھیاں یوں چڑھ رہا تھا گویا کسی گہرے کھڈ میں اتر رہا ہوں۔ اوپر جا کر کیا کروں گا؟ اوپر میرا کوئی واقف نہ تھا۔ اوپر کسی اور کا مکان تھا۔ کسی دوسرے کا گھر تھا۔ اوپر تم نہیں تھیں لیکن تمہارا بھائی موجود تھا۔ وہ اس روز مجھے ملنے گھر آیا ہوا تھا اور درمیانی کمرے میں بیٹھا سگریٹ سلگائے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے ایا' اسی کمرے میں۔۔۔۔۔۔۔جہاں کچھ دیر پہلے تم میرے پاس بیٹھی تھیں اور جہاں میں اس وقت تنہا ہوں میں تمہارے بھائی سے اپنے چہرے کی اداسی چھپانا چاہتا تھا۔ میں اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا اور میری آواز زیادہ بلند' شگفتہ اور مسرور تھی۔ چائے پر اس نے مجھے بتایا کہ تمہارا نکاح ہو گیا ہے اور بہت جلد رخصتی بھی ہونے والی ہے اور رشتہ اپنے کنبے میں ہی کیا ہے۔ لڑکا بجلی گھر میں ملازم ہے۔ ایک سو بیس روپے تنخواہ پاتا ہے اور ترقی کی امید ہے۔ ویسے ان کا اپنا بزنس بھی ہے۔

میں نے کہا۔

''آج پلازا میں Gun Fighter دیکھی جائے''

میں موضوع بدلنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے سامنے تمہارے بیاہ کا تذکرہ چھیڑے۔ مجھے ڈر تھا کہیں وہ میری آنکھوں میں تمہارے غم کے سائے نہ دیکھ لے۔ میرے چہرے کی صلیب پر تمہاری محبت کی لاش لٹک رہی تھی۔ میں اس مصلوب

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

محبت کو تمہارے بھائی سے چھپانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس لاش ہر سے پردہ کھسکا رہا تھا۔ اس نے کہا وہ تمہیں ساتھ لے کر دوسرے روز پھر ہمارے گھر آ رہا ہے کیونکہ تم میری والدہ اور بہنوں سے ملنا چاہتی ہو۔ میں نے دبی زبان میں اس بات پر خوشی کا اظہار کیا اور سیاسیات پر گفتگو شروع کر دی۔

تمہارا بھائی کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔

اس رات مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔

تین سال کی طویل مدت کھینچ کر چھوڑے ہوئے ربڑ کی مانند ایک دم سمٹ کر میرے قریب آ گئی اور میں پلنگ پر لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھا اور میرے ساتھ ہی میری خوابیدہ محبت کے بادبانوں کی رسیاں کھل گئیں اور وہ آنکھیں ملتی بیدار ہو گئی اور بھیگی پلکیں اٹھا کر مجھے افسردگی سے تکنے لگی سوچا! سوچا۔ میری غریب محبت! میری بدنصیب سہیلی! ابھی صبح نہیں ہوئی' ابھی سورج نہیں نکلا۔ اب صبح کبھی نہیں ہو گی۔ اب سورج کبھی نہیں نکلے گا۔۔۔۔۔۔

دوسرے دن تمہارے ہمراہ بھابھی انو بھی تھی۔ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے میں نے بچوں کی آوازیں سنیں۔ میں تمہاری آواز سننا چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ تمہاری مہربان آواز میرا بازو تھام کر مجھے اندر لے جائے۔ بند دروازے سے لگے میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ تمہاری آواز کا انتظار کیا۔ لیکن اس دوران میں تم نے کوئی بات نہ کی۔ تم خاموش رہیں۔ میں آہستہ سے دروازہ کھول اندر آ گیا۔ کمرے میں حنا کی دھیمی دھیمی مہک بس رہی تھی۔ میں تمہارے بھائی سے ملا۔ بھابھی نے میرے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیا۔ میں نے اس کمرہ میں سب سے پہلے تمہیں دیکھنا چاہا۔ مگر سب سے آخر میں دیکھا۔ میں پلنگ پر بیٹھا تمہارے بھائی اور بھابھی سے باتیں کر رہا تھا اور بچوں سے کھیل رہا تھا اور تمہاری طرف نظریں اٹھاتے گھبرا رہا تھا۔ مجھے کچھ اس قسم کا احساس ہو رہا تھا جیسے میں کسی ہرے بھرے جنگل میں دھوپ' روشنی اور سبزے کا خواب دیکھ رہا ہوں اور تمہاری نگاہ اٹھتے ہی یہ خواب ایک دم ٹوٹ جائے گا اور حنا کی خوشبو اڑ جائے گی' مہربان چہرے تحلیل ہو جائیں گے اور پھر اس کمرے میں سوائے میرے اور آٹے کے کنستر کے اور کچھ باقی نہیں رہے گا۔ سالوں بعد میرے گھر نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور مجھے اپنی محبت بھری آغوش میں جگہ دی تھی۔ میں اس غیر متوقع خیر مقدم کو شک کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی دوستی پر شبہ ہو رہا تھا اور میں اپنا ہاتھ بڑھاتے ہچکچا رہا تھا۔ میں ابھی تک تجھے نہ دیکھ سکا تھا۔

پھر میں نے دیکھا کہ تمہارے سینڈل کا رنگ سرخ تھا اور تم نے ساٹن کی سپید شلوار پہن رکھی تھی۔ تمہاری قمیص پر نیلے نیلے پھول

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھلے تھے اور کلائی پر سنہری گھڑی کا فیتہ چمک رہا تھا اور انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں تھیں اور گلے میں چمکیلی ست لڑی۔۔۔۔۔۔

تم بھابھی اٹو کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ تم نے مخصوص انداز میں دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا اور تمہارے خوبصورت کانوں میں جھولتی ہوئی زرد بالیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ تمہاری نگاہیں فرش پر تھی اور میری نگاہیں تمہاری پلکوں آنکھوں ہونٹوں اور رخساروں کو چم رہی تھیں۔ تم پہلے سے کچھ دبلی ہوگئی تھیں۔ تین سال پہلے جب میں نے تمہیں آخری مرتبہ میو ہسپتال کے برآمدے سے میں دیکھا تھا تمہارے چہرے پر رونق اور تازگی تھی اور مجھے گمان ہوا تھا جیسے گولڈ فلیک کے تازہ ڈبے میں سے پہلا سگریٹ نکال رہا ہوں اور اب یہ سگریٹ ایش ٹرے میں پڑا تھا اور اس کا فلیور دھوئیں کی لکیریں بن کر اڑا جا رہا تھا۔ تمہارا چہرہ کچھ اترا اترا سا تھا۔ کچھ تھکا تھکا سا تھا۔ جیسے گزشتہ تین برس کی لمبی مدت تم نے مسلسل سفر میں گزاردی ہو۔ تم نے بیش قیمت زیور پہن رکھے تھے۔ اس کے باوجود میں اس شے کی جستجو میں تھا جو پہلی مرتبہ دیکھنے پر مجھے تمہارے چہرے پر نظر آتی تھی۔

تمہیں یاد ہے کنیز! پہلی مرتبہ میں نے تمہیں دیکھا تھا تو تمہارے گلے میں نکاح کی ست لڑی اور کلائی پر سنہری گھڑی نہ تھی۔ تمہارے بال کھلے تھے اور تم باورچی خانے کے باہر تخت پر بیٹھی چاول چن رہی تھیں۔ میں اس سے پہلے کبھی تمہارے ہاں نہ آیا تھا۔ ہماری رشتہ داری ذرا دور کی تھی اور ایک دوسرے سے ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس روز بھانجی رضیہ اپنے ساتھ مجھے بھی تمہارے گھر لے آئی اور جب میں تمہارے گھر میں داخل ہوا تو میری نگاہوں نے سب سے پہلے تمہارے بالوں کو دیکھا جو کھلے تھے اور تمہارے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر تم نے جلدی سے دوپٹہ سر پر کرلیا اور تخت پر بیٹھے بیٹھے سمٹ گئیں اور میں نے دیکھا کہ تمہارے کانوں میں سفید نگوں والے بندے چمک رہے ہیں۔ رضیہ نے تم لوگوں سے میرا تعارف کرایا اور مجھے تمہارے کنبے کے ہر فرد سے مل کر واقعی خوشی ہوئی بے حد خوشی ہوئی۔ جیسے ہم ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہوں اور عرصہ پہلے بچھڑ گئے ہوں اور آج اچانک ہماری ملاقات ہوگئی ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں تمہارے گھر سے نکل کر اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اپنے گھر سے نکل کر کسی غیر کے گھر کی سمت جا رہا ہوں۔ اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ مجھ پر گوتم بدھ کے نظریہ تناسخ کا انکشاف ہوا۔ یقیناً ہمارا جنم جنم کا ساتھ رہا ہے اور ہم وقت کے گھومتے ہوئے چکر کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ہم پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک سے کیوں گئے تھے؟ ہماری نگاہیں بار بار یوں کیوں اٹھ رہی تھیں؟ جیسے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ جیسے سوچ رہے ہوں کہ اس سے پیشتر ہماری ملاقات کہاں ہوئی تھی؟ شاید اس سے پہلے ہم نے جنوبی ہند کے گنجان جنگلوں میں دریا کے کنارے پھونس کے جھونپڑوں میں جنم لیا تھا اور ہم دن کو مچھلیاں پکڑتے تھے اور رات کو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تاڑ کے درختوں تلے' ٹھنڈی چاندنی اور گیلی ریت پر بربری قبیلوں کے گیت گایا کرتے تھے۔اور ڈھولک کی تال پر رقص کیا کرتے تھے۔یا شاید ہم برف پوش ہمالیہ کے دامن میں پیدا ہوئے ہوں اور ایک اونچے ٹیلے پر نرکل کی جھاڑیوں میں ہمارا گھر ہو۔جس کی دیواریں نیلے پتھروں سے چنی گئی ہوں اور جس کے دروازوں پر موگرہ کلی کی نازک پتوں والی بیلوں کے پردے لٹکتے ہوں اور صحن میں نرگس کے بسنتی کھیت ہوں۔ہمارے کپڑوں میں انگوروں کی مہک ہو اور بالوں میں پگڈنڈیوں کی گرد اور ہم دن بھر چراگاہوں میں ریوڑ چراتے ہوں اور رات کو دیئے کی مدھم روشنی میں اپنے بچوں کو درختوں' چشموں اور ناریل کے دیوتاؤں کی کہانیاں سناتے ہوں۔۔۔۔۔۔اور پھر کئی صدیاں گزر گئی ہوں اور بادلوں کے ساتھ اوپر اٹھا ہوا پانی پہاڑوں سے ٹکرا کر دوبارہ سمندر کی جانب بہہ نکلا ہو اور ہم ایک بار پھر ملنے کے اس دنیا میں آ گئے ہوں اور میں نے دیکھا ہو کہ تم لاہور کی ایک گلی میں ایک مکان کے باورچی خانے کے باہر بیٹھی چاول چن رہی ہو۔اور تمہارے سیاہ بال' جن میں ہمالیہ کی ٹھنڈک اور جنوبی ہند کے جنگلوں کی تاریکی ہے۔کھلے ہوں اور ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا ہو اور نیلے سمندروں پر چمکیلی دھوپ نکل آئی ہو۔اور بانس کے درخت ملایا کی طرف سے آنے والی ہوا کے جھونکوں میں سرسرانے لگے ہوں اور ناریل کے جھنڈوں پر نیلا چاند چمکنے لگا ہو۔

ادم لا امتیہ! زندگی کا چکر ہمیشہ گھومتا رہتا ہے۔۔۔۔۔۔

بدھ نے ٹھیک کہا تھا:

لا انتہا کو رسی سے مت ناپ! خاموشی بول نہیں سکتی۔تاریکی چمک نہیں سکتی۔

اپنے نازک چہرے اوپر اٹھاؤ اے جنگلی پھولو! اور جب تم نے اپنا نازک چہرہ اوپر اٹھایا تو میں تمہارے مکان کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا اور نیم روشن گلی میں سے گزر رہا تھا اور بازار میں آ گیا تھا۔تانگے میں بیٹھے ہوئے میں نے بھانجی رضیہ سے تمہارے متعلق پوچھا۔اس نے بتایا تم بڑی اچھی ہو اور تمہارا نام کنیز ہے۔

ہماری دوسری ملاقات مکان کی سیڑھیوں میں ہوئی۔سیڑھیاں ہمارے کلچر کا ایک حصہ ہیں۔یہی وہ مانسرور جھیل ہے جہاں سے ہماری محبتوں کے راوی' بیاس اور چناب نکلتے ہیں۔ہم گھروں میں محبت نہیں کر سکتے۔ہم بازار میں محبت نہیں کر سکتے اور بازار اور گھر کے درمیان سیڑھیاں ہی ہماری محبتوں کا لارنس باغ ہے۔ہماری محبت انہیں تنگ و تاریک سیڑھیوں میں جنم لیتی ہے اور یہیں دم توڑ دیتی ہے۔

یہ سیڑھیاں یہ لٹی ہوئی محبتوں کی قبریں!

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ ملاقات کس قدر مختصر لیکن ہمیشہ یادرہنے والی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔اس روز گول باغ میں کوئی جلسہ تھا۔میں تمہارے بھائی کو لینے آ رہا تھا۔میں سیڑھیوں پر تیزی سے اوپر جارہا تھا اور تم تیزی سے نیچے اتر رہی تھی۔عین درمیان میں ہم ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تمہارے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور میں بھی گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔تم سمٹ کر ایک طرف ہوگئیں اور میں نے مسکراتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔تم نیچے اتر گئیں۔تم دیوان خانے میں استری لینے جارہی تھیں۔جب میں اوپر پہنچا تو تمہارا بھائی جوتے پالش کرر ہا تھا۔

مجھے دیکھ کراس نے کہا:

''ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہے۔''

''نہیں جناب پندرہ منٹ باقی ہیں۔''

''بس ٹائی استری ہونے کی دیر ہے۔''

میں نے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگالیا۔بجھی ہوئی دیاسلائی میرے ہاتھ میں ہی تھی کہ تم استری لے کر اوپر آ گئیں اور اس کا شو پلگ میں لگا کر ٹائی پریس کرنے لگیں۔جب تم فارغ ہوچکیں تو میں نے جیب سے رومال نکال کر تمہارے آگے ڈال دیا۔

''ذرا اسے بھی پریس کردیں۔''

تم نے کچھ کہے بغیر رومال میز پر پھیلایا اور سر جھکائے خاموشی سے استری کرنے لگیں۔لیکن تمہاری محویت اور سنبھل سنبھل کر گرم استری پھیرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ تم میرا رومال نہیں اپنا دوپٹہ استری کررہی ہو۔اور شاید تمہیں یاد ہو اس دن تم نے ہلکے نیلے رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا جس کے کناروں پر سپید پٹی چمک رہی تھی۔یہ دوپٹہ تمہیں بڑا سجتا ہے اور اس روز میں نے تمہیں پہلی بار اس دوپٹے میں دیکھا تھا اور تم مجھے بہت پیاری لگی تھیں۔

جلسہ گاہ سے باہر نکلے تو آسمان بادلوں میں چھپ چکا تھا۔تمہارا بھائی مجھے اپنے ساتھ ہی لے آیا۔کھانا ہم نے اکٹھے کھایا۔قہوہ پینے کے بعد ہم دیوان خانے میں بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور تاش کھیل رہے تھے۔ریڈیو پر بچوں کا پروگرام ہورہا تھا اس دوران میں تم صرف دو بار نیچے آئیں۔پہلی مرتبہ دیاسلائی کی ڈبی دینے اور دوسری بار قہوہ کے خالی برتن اٹھانے۔دونوں مرتبہ ہم نے ایک دوسرے کو چوری چھپے دیکھا اور گھبرا سے گئے اور میں بات کرتے کرتے کھو سا گیا۔اور گفتگو کا موضوع بھول گیا اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ تمہاری موجودگی اس موضوع سے زیادہ قیمتی اور اثر انداز تھی۔

میں اگر سونف کے عرق کی باتیں کررہا تھا تو تم نے دارجلنگ کی ڈھلوانوں پر اگی ہوئی خوشبودار چائے کی یاددلادی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہاں دارجلنگ کی چائے اور کہاں سونف کا عرق!

ریڈیو نے رات کا آخری پیغام دیا۔

میں گھر چلنے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہوگئی۔ تمہارے بھائی نے مجھے وہیں پڑ رہنے کو کہا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ بارش رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد میں نے جوتوں کے تسمے کھول دیئے اور آرام سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ نصف شب کے بعد سبز چائے کا دوسرا دور چلا۔ بارش کی وجہ سے سردی ایک دم بڑھ گئی تھی۔ روشندانوں میں سے بھیگی ہوئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ آتشدان میں آگ روشن تھی اور ہم سب اس کے قریب بیٹھے تھے۔

میں، تم، تمہارا بھائی اور اس کی بیوی۔

ٹن، ٹنک، ٹن، ٹن

ٹین کے چھجوں پر بارش کے گیت، گرم کمرہ، سبز چائے کی پرسکون مہک اور محبوب چہروں کا قرب۔۔۔۔۔۔۔ انسان کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے؟

زندگی کی ساری مسرتیں سمٹ کر اس چھوٹے سے آتشدان کے قریب آ گئی تھیں۔ میں تمہارے بھائی کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔ تم گردن کو ذرا جھکائے پلنگ پوش پر سورج مکھی پھول کاڑھ رہی تھیں اور بھابھی سرخ اون کے موزے بن رہی تھی۔ اس کی بچی گود میں لیٹی سو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ننھا سا منہ ذرا کھلا تھا۔ ہم چپ تھے۔ لیکن ہماری خموشی گفتگو سے زیادہ دلچسپ اور قہقہوں سے زیادہ صحت مند تھی۔ کسی وقت تمہارا بھائی تاش کا پتہ زور سے پھینکتے ہوئے بول اٹھتا:

''ڈک لیئر۔۔۔۔۔۔۔''

اور تم آہستہ سے پلکیں اٹھا کر ہم دونوں کو دیکھتیں اور مسکرا کر سر جھکا لیتیں۔ وہ رات میری زندگی کی حسین ترین راتوں میں سے تھی۔ اس رات میں نے تمہاری محبت کی شبنم کو اپنے دل پر گرتے محسوس کیا تھا اور میرے کنول کی پتیوں نے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔ تم میرے لیے اوپر سے جو لحاف لائیں وہ ریشمی تھا۔ اس کا رنگ ٹرکش گرین تھا اور اس پر نیلے رنگ کے بڑے بڑے پھول بنے تھے۔ ڈیڑھ بجے کے قریب تم لوگوں نے مجھے شب بخیر کہا اور اوپر چلے گئے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور لیٹ کر نقش فریادی پڑھنے لگا۔ کچھ دیر مجھے اوپر تمہارے سینڈل کی مخصوص ٹک ٹک اور باتوں کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دی اور پھر بتی بجھانے کی آواز آئی اور خموشی چھا گئی۔ میں نے بھی بتی کا بٹن دبایا اور لحاف اوپر کر لیا۔ لحاف میں سے حنا کی مدھم خوشبو اٹھ رہی تھی اور مجھے گمان ہو رہا تھا کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں تمہارے سیاہ چمکیلے بالوں کی چھاؤں میں لیٹا ہوں۔ اس رات مجھے گہری نیند آئی اور میں نے کوئی خواب نہ دیکھا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو روشندان میں سے سنہری دھوپ کمرے میں آرہی تھی اور تم کارنس پر رکھے ہوئے گلدان میں تازہ پانی ڈال رہی تھیں۔ تمہاری پشت میری طرف تھی۔ میں نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے تمہیں غور سے دیکھا تھا۔ تمہارے لمبے بالوں کی دونوں لٹیں کھلی تھیں اور دوپٹہ بے دھیانی سے گلے میں لٹک رہا تھا۔ پھولوں کو گلدان میں سجا کر تم پیچھے مڑیں تو تمہاری نظریں مجھ پر پڑیں اور تم محجوب سی ہو کر سنگاردان کا آئینہ صاف کرنے لگیں۔

میں نے پوچھا:

''وقت کیا ہوگا؟''

اور تم نے سنگاردان کے دراز میں سے بھابی کی چھوٹی گھڑی باہر نکالتے ہوئے کہا:

''ساڑھے نو''

''ارے۔۔۔۔۔۔۔اتنی جلدی''

میں نے لحاف کے اندر ہی انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھا۔ تم نے میز پر سے کتابیں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''آپ سبز چائے پئیں گے یا میٹھی؟''

''پہلے سبز پھر میٹھی اور پھر پہلے سبز اور پھر میٹھی۔''

تم آہستہ سے ہنس دی تھیں اور دیوان خانے سے باہر نکل گئی تھیں۔ اور تمہارے بعد کارنس پر رکھے ہوئے پھول دیر تک مسکراتے رہے تھے اور تمہیں یاد کرتے رہے تھے۔

کنیز! تم نے فرائڈ پڑھا ہے؟

مجھے افسوس ہے کہ اس نے گناہ کی راتیں عرف ننگی جوانی' مجاہد کی واپسی عرف' مصری شاہ ایسی کتابیں نہیں لکھیں ورنہ تم نے اسے ضرور پڑھا ہوتا۔ شاید تمہارے لیے فرائڈ کا نام اجنبی ہو۔ بہرحال یہ شخص جنسی نفسیات کا خدا مانا جاتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں چند ایک بنیادی باتوں کے علاوہ اس کا سارا فلسفہ محض فراڈ ہے۔ سرد ممالک کے لیے اس کے نظریات ٹھیک ہیں مگر گرم ایشیائی سرزمین اس کے خیالات سے اختلافات رکھتی ہے۔ اس کے خیال میں محبت محض جنسی جذبہ ہے اور مجھے لفظ محض پر اعتراض ہے۔ محبت کی ابتداء جنسی تحریک سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ کنول دلدل میں اگنے کے باوجود ایک خاص مقام پر پہنچ کر اپنے کیچڑ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیسے کسی درخت کو عکس گندے جوہڑ میں پڑ رہا ہو۔ عکس کا وجود درخت سے قائم ہے۔ مگر اس درخت کا جوہڑ کے تعفن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پہلے پہل جس چیز نے مجھے تمہاری طرف متوجہ کیا ہو سکتا ہے وہ تمہارا گداز جسم ہو۔ لیکن اس وقت تمہارے بھرے بھرے جسم کی کشش کہاں کھو گئی تھی جب تم رات بھر میرے کمرے میں بستر پر اور میں آرام کرسی پر سویا رہا تھا؟ میں تم پر اپنی پاکدامنی کا رعب نہیں جمانا چاہتا تھا کنیز! کیونکہ میرے نزدیک کوئی شے فی الذات پاکیزہ اور غیر پاکیزہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ مجھے احمق کہیں۔ مگر میں اپنے طور پر مطمئن ہوں اور مجھے اپنی حماقتیں ان کی عقلمندیوں سے کہیں زیادہ عزیز اور پیاری ہیں۔ تم سے والہانہ محبت ہونے کے باوجود مجھے اتنا ہوش تھا کہ اگر میں تمہارے بستر میں چلا گیا اور بعد میں ہماری شادی نہ ہو سکی تو مجھے احمق کہنے والے تجھے گندا چیتھڑا سمجھ کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیں گے۔ میں جانتا ہوں تاریخ کے بڑے بڑے فیصلے عورت کے بستر پر ہوئے ہیں۔ میں بھی اس بستر سے محبت کرتا ہوں۔ مگر میرے دل میں اس بستر کی کچھ عزت بھی ہے۔ میں پھر کہوں گا کہ یہ پاکدامنی کا سوال نہیں ہے بلکہ ان قوانین کی حفاظت کا سوال ہے جو انسانی برادری میں رہتے ہوئے ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ ہم مذہب پرست ہوں خواہ مادہ پرست ہم پر ان قوانین کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑ سکتی۔ اور اگر کبھی ایسا ہو تو انسان ایک بار پھر اپنے تئیں مہیب غاروں کے دہانوں پر جنگلی درندوں میں گھرا ہوا پائے گا۔ نیچر کے ہاں اچھائی اور برائی کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن اس نے ہمیں کچھ بنیادی اصول ضرور دیئے ہیں۔ جن کی مدد سے ہم نے قرن ہا قرن کی محنت سے ایک خاص ضابطہ تیار کیا ہے جس کا نام اخلاق ہے۔ نیچر کے نام انسان اس سے بڑھ کر کوئی تحفہ پیش نہیں کر سکا۔ یہ مفید ہے یا غیر مفید؟ مسرت بخش ہے یا تکلیف دہ؟ میں نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ہم پر اس عظیم ترین اور تن آور درخت کی دیکھ بھال فرض ہے۔ جس کی جڑوں میں سقراط' گوتم' مسیح' کرشن' اور محمد کا خون گردش کر رہا ہے۔ میں تمہیں اخلاقیات پر لیکچر نہیں دے رہا کنیز! بلکہ تم پر اپنے ذہن کا وہ پہلو عریاں کر رہا ہوں جو آج تک تمہاری نگاہوں سے اوجھل رہا۔ میں جانتا ہوں تمہیں ان باتوں سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا مگر میری تسکین ضرور ہو جائے گی۔ اور اب میں تمہاری دلچسپی کی بات کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔! میں اکثر تمہارے ہاں آنے لگا تھا۔ کبھی بھانجی رضیہ کے ساتھ' کبھی آپا کے ہمراہ اور کبھی اکیلا۔۔۔۔۔۔ ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہو رہے تھے اور قریب سے قریب تر آ رہے تھے۔ اب گھر میں دوسرے افراد کے سامنے تم سے ہم کلام ہوتے ہوئے بالکل جھجک محسوس نہ کرتا۔ بلکہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ تم سے باتیں کرتا اور تمہیں دیکھتا رہتا اور تمہیں دیکھتے ہوئے تم سے باتیں کرتے ہوئے مجھے ہر بار کچھ اس قسم کا احساس ہوتا گویا میں کسی بلند ترین پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں اور ذرا ایڑیاں اٹھاؤں تو ستاروں کو چھو سکتا ہوں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمہاری چھوٹی بہن اور بھابھی کے بچے' جو پہلے اپنی امی کی آغوش میں سمٹ جاتے تھے' اب مجھے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کی آغوش سے نکل کر میری طرف تالیاں بجاتے بھاگ آتے۔ تمہارے گھر کی ہر شے مجھ سے مانوس ہو رہی تھی' میرے قریب آ رہی تھی۔ دیواریں' کھڑکیاں' پردے' تصویریں' قالین' ہر چیز' ہر شے تم لوگوں میں پہنچ کر مجھے محسوس ہوتا کہ میں آم کی ٹھنڈی اور خوشبودار چھاؤں میں آ گیا ہوں جہاں ایک قدم کے فاصلے پر ٹھنڈے پانی کا چشمہ ہے اور شیریں پھلوں سے لدے ہوئے درخت ہیں۔ تمہارے کنبے کا ہر فرد مجھے اپنا ہم شکل دکھائی دینے لگا تھا سوائے ایک آدمی کے۔ مجھے اس شخص سے باتیں کرتے ہوئے شبہ گزرتا کہ میں قد آدم آئینے کے بالمقابل کھڑا ہوا اور وہ آدمی تھا تمہارا ماموں۔ تمہارا بھینگی آنکھوں والا ماموں۔۔۔۔۔۔! شاید میں اسے ناپسند تھا۔ مجھ سے باتیں کرتے وقت اس کی بھنویں ایک طرف کو کھنچ جاتیں اور لہجہ طنزیہ ہو جاتا۔ جیسے میں نے اسے چینی کی بلیک مارکیٹ کرتے پکڑ لیا ہو۔ یا اس کے مکان کی پرمٹ منسوخ کرا دی ہو اور اب وہ مجھ سے بدلہ لینے کی فکر میں ہو۔ وہ اگرچہ شہر کی بڑی منڈی میں ہلدی اور سوکھے تمباکو کا دھندا کرتا تھا۔ لیکن اس کا پراسرار چہرہ دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ جعلی نوٹ بناتا ہے۔ اس کا اپنا چہرہ بھی جعلی نوٹ سے ملتا جلتا تھا۔ کنپٹیوں کے سفید بال دور سے خالص دودھ ایسے دکھائی دیتے۔ مگر قریب پہنچنے پر ان کا رنگ پھیکا پڑ جاتا جیسے دودھ میں پانی ملا ہو۔ آنکھیں دور سے ٹھیک معلوم ہوتیں لیکن قریب آ کر بھینگی ہو جاتیں۔ گالوں کے کھردرے بال نزدیک سے دیکھنے پر کانٹوں کی طرح ابھرے ابھرے دکھائی دیتے مگر دور سے منڈے ہوئے معلوم ہوتے۔ یہ بڑا چار سو بیس چہرہ تھا اور کسی ایسے دفتر سے ملتا جلتا تھا جس کی پیشانی پر ''یہاں نوکری ملتی ہے'' لکھا ہوا اور اندر فوج میں جبری بھرتی کا کام ہوتا ہو۔ پہلے روز میں بھی خوشی خوشی اس دفتر میں داخل ہو گیا تھا لیکن واپسی پر مجھے اپنے جوتے بھی اندر چھوڑنے پڑے۔۔۔۔۔۔۔ میں ہفتے میں جتنی بار تمہارے ہاں آتا تمہارے ماموں کو وہاں موجود پاتا۔ جو بات ابھی میرے ہونٹوں تک بھی نہ آئی تھی اسے اس کا پتہ چل گیا تھا اور وہ تم سے باتیں کرتے ہوئے میری طرف کنکھیوں سے دیکھا کرتا تھا۔ جیسے میری محبت کی بے بسی کا مذاق اڑا رہا ہو۔ میں نے اسے کبھی اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ ہاں مجھے تم پر افسوس ضرور تھا کیونکہ تم نے ہمیشہ میری تضحیک میں اس کا ہاتھ بٹایا تھا۔ جتنی مجھے اس سے نفرت تھی اس سے دوگنا تم اس کا خیال رکھتی تھیں۔ شاید تمہیں وہ دوپہر یاد نہ ہو۔ جب ہم سب لوگ دیوان خانے میں بیٹھے رمی کھیل رہے تھے۔ تم میری پارٹنر تھیں۔ لیکن مجھ سے چوری اپنے ماموں کو پتے دکھلا رہی تھیں۔ چنانچہ ہم ہار گئے اور تمہیں اپنے بھینگی آنکھوں والے ماموں کے جیتنے کی اتنی خوشی ہوئی تھی کہ مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں نے رمی کی اس بازی میں اپنا سب کچھ ہار دیا ہے۔ میں نے کھیلنا چھوڑ دیا اور دلی ریڈیو سننے لگا۔ مگر جب تمہارے ماموں نے ناک سکیڑ کر کہا:

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یہ ہندی گانے چھوڑو جی' کنیز ذرا لاہور تو لگاؤ"

تو تم نے فوراً سوئی لاہور کی طرف پھیر دی۔ تمہیں اس کا بالکل علم نہیں۔ مگر اس لمحے یوں لگا تھا گویا تم نے میری جیب سے سگریٹ نکال کر اسے پیش کر دیا ہو۔ اس کے بعد کئی روز تک تمہارے گھر نہیں آیا۔ لیکن ڈیڑھ ماہ بعد تمہاری محبت مجھے پھر کھینچ لائی۔ تم نے بھی گھر کے دیگر افراد کی طرح مجھ سے اتنے دن غائب رہنے کی وجہ پوچھی اور رسمی طور پر تعجب کا اظہار کیا میری خواہش تھی تمہارے پوچھنے کا انداز باقی لوگوں سے جدا ہوتا' تم انتظار کرتیں کہ ہم دونوں تنہائیوں اور جب تنہا ہوتے تو میں تمہیں کہتا۔۔۔۔۔۔

کنیز! اس بھیگی آنکھوں والے تمباکو کے بیوپاری سے گھل مل کر باتیں نہ کرو۔ وہ ہمارے زعفران کے کھیت میں تمباکو کے بیج بکھیر رہا ہے اور ہماری محبت کے تعاقب میں ہے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ نہ ہمیں تنہائی میسر آئی اور نہ تم نے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔

اب اس ڈرامے میں پروین داخل ہوتی ہے۔

وہ لمبی آنکھوں اور سیاہ بالوں والی لڑکی۔۔۔۔۔۔ جس کی آواز اس کے جسم سے زیادہ گداز اور مسکراہٹ اس کے دانتوں سے زیادہ چمکیلی تھی۔ جو تمہاری پھوپھی زاد بہن کم اور سہیلی زیادہ تھی۔ جس کے خوبصورت ہاتھ نے میری محبت کی نقاب کشائی کی اور اولین پریم سندیسہ تم تک پہنچایا۔ اس کا یہ احسان میرے دل کی انگوٹھی پر نگینہ بن کر ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ عام طور پر خوبصورت لڑکیاں احمق ہوتی ہیں۔ لیکن پروین عقلمند لڑکی تھی۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں میرے دل کا حال جان گئی اور اس نے ہمیں قریب سے قریب تر لانے کا فیصلہ کر لیا۔ پروین کو ایک بڑی سہولت یہ تھی کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ گھومنے لے جا سکتی تھی۔ چنانچہ وہ روشن ترین دن بھی طلوع ہوا جب سنہری دھوپ میں لارنس کے درختوں تلے گھاس پر نیلے پھول سو رہے تھے اور ہم دونوں ایک چھوٹی سی روش پر آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ تم نے نقاب الٹ رکھا تھا۔ ہمارے ایک جانب پہاڑ کی ڈھلوان تھی اور دوسری جانب لیچی اور پام کے درخت۔۔۔۔۔۔ دن نہایت خوشگوار اور پر سکون تھا۔ اپریل شروع ہو چکا تھا اور درخت خوشبو چھوڑ رہے تھے۔ میں سگریٹ پی رہا تھا۔ تم سے باتیں کر رہا تھا اور اپنے آپ کو شور مچاتے ہوٹلوں اور گرد اڑاتی سڑکوں سے بہت دور محسوس کر رہا تھا۔ کوئی شے مجھے یقین دلا رہی تھی کہ تمہارے ساتھ جنوبی سمندروں کے کسی دور افتادہ جزیرے میں گھوم رہا ہوں جہاں اگلے موڑ پر ہمیں پھولوں سے لدی ہوئی ناچتی گاتی لڑکیوں کی ٹولیاں ملیں گی اور اس کے آگے انگوروں کے باغات آ جائیں گے اور پھر سمندر آ جائے گا۔۔۔۔۔۔ عظیم پر سکون اور گہرا سمندر! لیکن اگلے موڑ پر پروین کھڑی تھی۔ جس نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔

"اب گھر چلنا چاہیے۔۔۔۔۔۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ پھولوں سے لدی ہوئی لڑکیاں اور انگوروں کے باغ اور گہرا سمندر کہاں تھا۔ یہ خواب اتنی جلدی کیوں ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہ سنہری مچھلیاں ہاتھ آتے ہی کیوں پھسل جاتی ہیں۔ یہ رنگ ہاتھ لگتے ہی کیوں اڑ جاتے ہیں اور خوبصورت لڑکیاں ہر موڑ پر اب گھر چلنا چاہیے کیوں پکار اٹھتی ہیں؟

کیا ہی اچھا ہو کہ شہر میں تمام گھروں کی چھتیں بیٹھ جائیں۔

ایک ماہ بعد تم کچھ دنوں کے لیے اپنی پھوپھی کے ہاں چلی آئیں۔ وہاں سے ایک رات میں تمہیں اپنے گھر لے آیا۔ پروین بھی ہمارے ساتھ تھی۔ گرمائی رات کا پہلا حصہ گزر گیا تھا۔ ہم شہر کی چاردیواری سے باہر سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ آسمان پر بادل تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جب گھر دو فرلانگ کے قریب رہ گیا تو ایکا ایکی تمہارے پیٹ میں درد شروع ہو گیا تھا۔ ہم نے تمہیں سڑک سے ہٹ کر ایک جگہ بٹھلا دیا درد کی شدت کے باعث تم نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے داب رکھا تھا اور تمہارے ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔ پروین تمہاری تیمارداری میں لگی تھی اور میں تانگہ ڈھونڈ رہا تھا۔ خالی تانگہ ملتے ہی ہم نے تمہیں اس میں سوار کرایا اور گھر لے آئے۔ گھر پہنچ کر امی نے اسی وقت میٹھا تیل گرم کر کے مالش کی اور آپا سونف کا پانی ابال کر لے آئی۔ تمہیں بہت جلد آفاقہ ہو گیا اور تم سو گئیں۔

دوسری صبح تم بالکل ٹھیک تھیں لیکن تمہارا چہرہ زرد تھا اور ہونٹ پژمردہ سے تھے۔ تم سپید چادر سے بدن ڈھانپے چارپائی پر لیٹی تھیں اور پروین، امی اور آپا باورچی خانے میں تھیں۔ میں نے تمہارے پاس آ کر جھک کر پوچھا:

''اب طبیعت کیسی ہے''

''تمہاری اداس آنکھوں میں چمک سی آ گئی تھی اور تم نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا''

''اچھی ہوں''

''آپا تمہارے لیے گرم قہوہ لے کر آ گئی اور میں ذرا پرے ہٹ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ دوسرے دن تم بالکل صحت یاب ہو گئیں۔ تمہارے چہرے پر پہلے کی سی شگفتگی آ گئی اور تم پہلے سے زیادہ دلکش نظر آنے لگیں۔ پروین نے راوی میں کشتی کا پروگرام پیش کر دیا۔ چنانچہ اسی رات کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے تانگہ لیا اور دریا کی طرف چل پڑے جیسے جیسے دریا قریب آ رہا تھا فضا زیادہ خوشگوار ہو رہی تھی اور ہوا میں درختوں کے گیلے تنوں اور پانی میں اگی ہوئی جھاڑیوں کی خوشبو شامل ہو رہی تھی۔ جب ہم پل پر پہنچے تو آخری تاریخوں کا سرخ اور زرد چاند کھجور کے مشرق جھنڈوں پر سے نمودار ہوا اور دریا کی ٹمیالی سطح پر اپنی افسردہ چاندنی بکھیرنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لگا۔ ہم نے کشتی کرائے پر لی اور اس میں سوار ہو کر راوی کی لہروں پر دھکیل دیا۔

شپ شپ شپ!

چپو چل رہے تھے اور اب ہم دریا کے وسط میں تھے۔ دریا کے پاٹ پر چاندنی کا پھیکا غبار چمک رہا تھا۔ کنارے کنارے کھجور کی آڑی ترچھی چھتریاں دور تک چلی گئیں تھیں۔ پہاڑوں کی طرف سے آنے والی ہوا کے جھونکے ٹھنڈے اور مرطوب تھے۔ پل کی بتیاں خاموشی سے ٹمٹما رہی تھیں اور ریشمی آنچل کا کنارہ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ چاندنی کے قالین پر لیٹی ہوئی وہ رات کس قدر حسین تھی کنیز! کاش میں زندگی کے چمکیلے دنوں سے اس نیم روشن رات کا سودا کر سکتا!''

''تم میرے بالمقابل بیٹھی تھیں اور پروین سے باتیں کر رہی تھیں اور میں چپو چلا رہا تھا اور پروین کے سیاہ بالوں کی ایک لٹ اس کے رخسار پر لہرا رہی تھی۔ تم کسی وقت مجھ سے کوئی بات کرتیں اور پھر خود ہی جھینپ کر چپ ہو جاتیں۔ تمہاری آنکھیں دھیمی چاندنی میں مجھے یونانی معبدوں کے پر اسرار تہ خانوں کی یاد دلا رہی تھی۔ ہم کچھ بھی نہیں کہہ رہے تھے۔ یہ سب کچھ ایک خواب کی طرح تھا۔ ہم کشتی پر سوار اور کشتی چاند کی طرف جا رہی تھی اور کنارے مدھم دھند میں ڈوب رہے تھے۔ بارہ دری کی طرف سے کسی ماہی گیری کی سوگوار آواز سنائی دی۔

''میری محبت راوی کنارے اگا ہوا درخت ہے''

جس کی جڑیں پانی میں ہیں

لیکن شاخیں پانی سے باہر۔

میری کشتی! راوی سدا بہتا ہے۔

تو بھی بہتی جا۔۔۔۔۔۔

ہم ذرا دیر سے لوٹے۔ اور گھر میں داخل ہو کر ہم نے دیکھا کہ تمہارا بھینگی آنکھوں والا ماموں امی کے پاس بیٹھا تھا۔ شاید وہ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے ہم تینوں کو دیکھا اور پھر امی سے باتیں کرنے لگا۔ تمہیں ڈر تھا کہ اب وہ تمہیں کبھی ہمارے ہاں نہ آنے دے گا اور تمہارا ڈر بجا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد نہ صرف ہمارے ہاں بلکہ پروین کے گھر بھی تمہارا آنا جانا بند ہو گیا۔ میں کئی روز تمہارے گھر نہ جا سکا۔ ایک ماہ اور گزر گیا۔

برسات نکلتے ہی تمہارے ہاں کسی کی شادی کا ہنگامہ ہوا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بیاہ کے روز ہمارا کنبہ بھی تمہارے ہاں موجود تھا۔ نچلی دونوں منزلوں میں خوب گہما گہمی تھی اور شور غل مچا تھا۔ میں تیسری منزل کے چھوٹے کمرے میں چارپائی پر لیٹا ''ہملٹ'' کے چوتھے ایکٹ کا وہ آخری سین پڑھ رہا تھا جہاں ملکہ لارٹیس کو بتاتی ہے کہ اوفیلیا چشمے میں ڈوب کر مرگئی ہے اور پھر درد انگیز الفاظ میں اس کی موت کا سوگوار منظر بیان کیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ پڑھتے پڑھتے مجھ پر غنودگی سی طاری ہوگئی اور میں کتاب سینے پر رکھ کر سو گیا۔ ایکا ایکی دروازہ کھلنے کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے تم کھڑی تھیں۔ بجلی کی نرم روشنی میں تمہارے ماتھے کا جھومر چمک رہا تھا۔ تمہارے ہاتھ میں اخروٹ کی لکڑی کا خالی طشت تھا۔ تم باقر خانیاں لینے اوپر آئیں تھیں۔ تم نے مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا

''آپ یہاں سو رہے ہیں؟''

''ہاں''

میں چارپائی پر بدستور لیٹا رہا اور تم بڑے ٹوکرے میں سے باقر خانیاں نکال کر طشت میں لگاتی رہیں۔ جب طشت بھر گیا اور تم باہر جانے کے لیے مڑیں تو میں نے تمہارا راستہ روک لیا۔

''کوئی آ جائے گا۔'' تم نے کانپتی ہوئی خشک آواز میں کہا

میں نے طشت میز پر رکھ دیا۔ تمہارے ہاتھ ٹھنڈے تھے لیکن ہونٹ گرم۔ تمہارا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور تمہارے جسم سے یاسمین کی مہک اٹھ رہی تھی۔ تمہارا جھومر میرے ماتھے کو چھو رہا تھا اور میرے ہونٹ تمہاری گردن کو چوم رہے تھے۔ نچلی منزل سے کسی نے تمہیں آواز دی۔

تم نے جلدی سے اپنے آپ کو الگ کیا اور طشت لے کر نیچے اتر گئیں۔ دوسرے مہینے مجھے پتہ چلا تمہاری منگنی کی بات چیت ہو رہی ہے۔

اس دوران میں ہم اپنے رشتے داروں میں کافی بدنام ہو چکے تھے اور ہمارا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بالکل بند ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی آپا کو شادی کی بات چیت کے لیے تمہارے ہاں بھیجا۔ لیکن تم لوگوں نے انکار کر دیا۔ تمہارے ماں باپ کا خیال تھا کہ اگر شادی ہوگئی تو وہ اور زیادہ بدنام ہو جائیں گے۔ مجھے اس انکار سے کافی صدمہ ہوا۔ میں نے پروین کے ہاتھوں تمہیں پیام بھیجا۔ تم نے اس کے سامنے روتے ہوئے کہا۔ تم عمر بھر کنواری رہو گی اور کسی دوسرے آدمی سے شادی نہیں کرو گی۔ میں نے تمہیں اپنے ساتھ بھاگ چلنے کو کہا۔ تم نے مجھے اپنے والدین کی عزت کا واسطہ دیا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماں باپ کی عزت بڑی شے ہے کنیز! ابوالہول سے بھی بڑی۔۔۔۔۔۔۔ آئندہ کسی سے محبت کرنے لگو تو ماں باپ سے ضرور پوچھ لینا تاکہ بعد میں تمہیں ان کی عزت کا واسطہ نہ دینا پڑے۔ میں خاموش ہو رہا اور تمہیں اپنے دل سے بھلانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے تمہاری محبت کا رخ ادب اور موسیقی کی طرف پھیر دیا۔ تم لوگوں نے مجھ سے میرے چشمے' پہاڑ' درخت اور میدان چھین لیے تھے مگر آرنلڈ ہیوگر برگ اور یوتاں مجھے ایسے چشموں پر لے گئے جن کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا اور برف سے زیادہ سرد تھا۔ انہوں نے مجھے ان جنگلوں کا نشان بتایا جہاں درختوں کے سائے تمہارے بالوں سے زیادہ گہرے اور زیادہ خوشبودار تھے۔ تمہارے گھر سے نکل کر میں نے کتابوں میں پناہ لی اور کتابوں نے مجھ پر ان پر اسرار ستاروں کے دریچے کھول دیئے جن کی نیلگوں فضاؤں میں میں نے سقراط کو ایتھنز کے بازاروں میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھومتے دیکھا اور قلوپطرہ کو نیل کے ساحل پر انطنی کے زانوؤں پر سر رکھے دیکھا اور میں نے کہکشاں کی چھتوں والے محل کی کھڑکی میں جیولٹ کو کہتے سنا:

اب رخصت رومیو! رات کے دیئے بجھ گئے ہیں۔

اور صبح' پہاڑوں پر ایڑیاں اٹھائے جھانک رہی ہے۔

ہمیں اب جدا ہو جانا چاہیے تاکہ کل پھر مل سکیں۔

اور رومیو نے کہا:

میری محبوبہ! جسے تم صبح کی روشنی سمجھ رہی ہو وہ ستاروں کا قافلہ ہے جو نیلے صحرا میں راستہ بھول گیا ہے۔ ابھی رات بہت ہے جیولٹ۔۔۔۔۔۔۔ اے دن کی روشنی قبل اس کے کہ تم محل کے جھروکے میں داخل ہو میری جیولٹ کو مجھ سے مت چھین۔۔۔۔۔۔۔

میں نے سپارٹا اور ایتھنز کے معرکوں میں شرکت کی۔ میں ہیون سانگ کے ہمراہ بدھی ادب لے کر چین گیا۔ میں ہیوگو کے ساتھ انقلاب فرانس میں شریک ہوا اور میں نے وان گاگ کی معیت میں ہالینڈ اور پیرس کے دیہاتوں کی سیر کی۔

اس طویل ذہنی آوارہ گردی نے مجھے کافی حد تک تسکین دی اور بالآخر میں نے وہ راستہ تلاش کر لیا جس پر میں تمہارے بغیر بھی زندگی کا سفر پورا کر سکتا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔۔۔۔۔۔۔ گزرتا گیا۔

جھیل ڈل میں تمہارا ہاؤس بوٹ ہمارے ہاؤس بوٹ سے تیسرا تھا۔ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس روز موسم بڑا خوشگوار تھا اور نیلے آسمان پر بگلوں کی سپید قطاریں گزر رہی تھیں۔ میں ہاؤس بوٹ کی چھت پر بیٹھا چمکیلی دھوپ کا لطف اٹھا رہا تھا کہ مجھے تمہارے ہاؤس بوٹ کی جانب سے لڑکیوں کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ تم لوگ کشتی میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوار ہو رہے تھے۔ تمہارے ساتھ بھابھی انور پروین اور چند ایک اور لڑکیاں تھیں۔ کشتی میں اترتے وقت تمہارا دوپٹہ ہاؤس بوٹ کی میخ سے اڑ گیا اور تم گرتے گرتے بچیں۔ باقی لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے انہوں نے میری گمشدہ محبت کا مذاق اڑایا ہو اور مجھ پر ہنسی ہوں۔ اسی شام میں نے اپنی کتابوں کا تھیلا اٹھایا اور سری نگر سے جموں والی بس پر سوار ہو گیا۔

میں ہسپتال کے بڑے کمرے کی سیڑھیاں طے کر کے دوسری منزل کے برآمدے میں پہنچا تھا کہ میری نگاہوں نے اچانک تمہیں اپنے سامنے پایا۔ تم زنانہ وارڈ کے باہر لوہے کے جنگلے پر جھکی ہوئی تھیں اور نیچے باغ میں کھیلتے بچوں کو دیکھ رہی تھیں۔ تم نے ہلکے بادامی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور تمہارے پاؤں میں پیازی رنگ کا سینڈل تھا۔ تمہارا نسواری دوپٹہ سر سے ڈھلک گیا تھا اور ایک کان میں سنہری ٹاپس کے نگینے چمک رہے تھے۔ ایکا ایکی تمہیں اپنے مقابل دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کتابوں کا سارا علم میرے ذہن سے بھاپ بن کر اڑ گیا ہے۔ ایک پل کے لیے میں اپنی جگہ سے بالکل نہ ہل سکا۔ یہ ایک پل ایک سال کا تھا یا ایک سیکنڈ کا؟

میں اندازہ نہ کر سکا۔ میں تمہارے پاس جا کر تم سے محبت کی افسردہ آواز میں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ تمہاری گہری اور پراسرار آواز سننا چاہتا تھا۔ تمہاری چمکیلی آنکھوں میں اتر کر اپنی کھوئی ہوئی محبت کے سیپ چننا چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے قدم تمہاری طرف نہ اٹھ سکے۔ میں آہستہ سے مڑا اور برآمدے کی دوسری جانب نکل گیا۔

ایک سال اور بیت گیا۔

اس دوران میں نہ پروین سے ملاقات ہو سکی اور نہ تمہیں دیکھ سکا۔ وقت نے نرم دل ماں کی مہربان تھپکیوں کی طرح میرے دل میں تمہاری محبت کو سلا دیا اور میں اپنی خوابیدہ محبت کے سرہانے بیٹھا روٹی کمانے کی فکر میں کھو گیا۔ میں تمہیں بھولا نہیں تھا۔ لیکن تم سے الگ ضرور ہو گیا تھا۔ جو زمانہ تمہاری محبت کی چھاؤں میں بسر ہوا تھا سایہ بن کر میرے تعاقب میں رواں تھا۔ فکر معاش کے جھکڑوں نے تمہاری محبت کے چہرے پر گرد کی تہیں چڑھا دی تھیں۔ میری وادیوں سے بہار رخصت ہو گئی تھی۔ درختوں نے اپنے پتے جھاڑ دیئے تھے اور ندیوں کا پانی سوکھ گیا تھا۔ پھر بھی کہیں کہیں جھاڑیوں میں مرجھائے ہوئے ایک آدھ پھول کا نشان اور پتھروں کے درمیان جمع شدہ پانی اس بات کی یاد دلاتا تھا کہ کبھی وہاں بھی بہار تھی۔ کبھی اس زرد پتوں سے ڈھکی ہوئی زمین پر بھی نیلے پھولوں کے جھاڑ مسکرایا کرتے تھے اور ان خشک ندیوں میں برف کا پانی لہریں مارتا تھا اور کناروں سے اچھل اچھل کر گھاس کا منہ چوما کرتا تھا۔

کنیزا یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری محبت میرے گلے سے پھولوں کا ہار اتار کر میری جھولی سوکھے پتوں سے بھر گئی تھی۔ لیکن مجھے یہ پتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان پھولوں سے بڑھ کر عزیز تھے۔ سورج غروب ہو کر جو رنگ چھوڑ جاتا ہے وہ دھوپ سے زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ میری محبت پہاڑوں کے عقب میں ڈوب گئی تھی۔ مگر اس کی لالہ رنگ شفق میرے دامن میں تھی۔ بادل برس گئے تھے۔ لیکن ان کا پانی میری شاخوں میں زندگی بن کر محفوظ تھا' بنیان کی طرح تمہارا خیال میرے جسم کے قریب ترین اس کا پہلا لباس تھا۔ اس کے باوجود میں نے بنیان کے متعلق کبھی نہ سوچا تھا اور میرا وقت بڑے اطمینان اور سکون سے گزر رہا تھا۔ گویا وہ دیہاتی بیل گاڑی پر سوار ہو اور بیل نیند میں چل رہے ہوں' کہ اچانک تمہارے خالہ زاد بھائی سے ملاقات ہو گئی اور اس نے کافی ہاؤس میں پائپ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

پرسوں کنیز کا نکاح تھا""

اور مقدس انجیل زمین پر گر پڑی تھی اور میں نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ مجھے اپنے قریب ہی کچھ اس قسم کا شور سنائی دیا جیسے کوئی تناور درخت جڑ سے اکھڑ کر دھڑام سے زمین پر آ گرا ہو اور میری سوئی ہوئی محبت چونک کر اٹھ بیٹھی اور میری کشتیوں کے سارے بادبان ایک ایک کر کے کھل گئے۔ میرا خیال تھا میں تمہاری شادی کی خبر بڑے اطمینان سے سنوں گا اور اسے کسی سینما گھر میں فلم کے ٹوٹ جانے سے زیادہ اہمیت نہیں دوں گا۔ لیکن جب فلم ٹوٹی تو مجھے ایسا لگا جیسے سارا سینما ہال میرے اوپر آن گرا ہو اور میں نے تمہارے نکاح کی خبر اس قیدی کے کانوں سے سنی جس کے سامنے اس کی رحم کی درخواست تردید پڑھی جا رہی ہو اور جس کے لیے اب عمر قید کی سزا ناگزیر ہو گئی ہو۔

اس سے اگلے روز تم بھابھی انو' اور اپنے بھائی کے ہمراہ ہمارے یہاں آئیں اور تمہاری قمیض پر نیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ تمہاری کلائی پر سنہری گھڑی تھی اور گلے میں زریں ست لڑی اور انگلیاں چمکیلی انگوٹھیوں نے ڈھانپ رکھی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کے لیے بظاہر بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ میں تمہارے سرخ سینڈل کی تعریف کر رہا تھا اور تم کہہ رہی تھیں:

"مجھے تو یہ ذرا پسند نہیں۔"

بھابی انو نے کہا:

"مگر ان لوگوں کو تو بہت پسند ہے۔"

میں نے پوچھا:

"کن لوگوں کو؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تم ایک دم خاموش ہوگئیں۔ تمہارا چہرہ اداس ہوگیا اور تم نے منہ پرلی طرف کرلیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم پھر بڑی آزادی سے گفتگو کرنے لگے۔ جیسے ہم بڑے ہی قریبی رشتہ دار ہوں اور ہمارے لیے ایک دوسرے میں کوئی۔۔۔۔۔۔غیر معمولی کشش نہ ہو جیسے ہم روز ہنستے مسکراتے ملتے ہوں اور ہنستے مسکراتے جدا ہو جاتے ہوں۔ مگر تمہیں یاد ہے کنیز! جس وقت میں نے سنگترہ چھیل کر تمہاری طرف بڑھایا تھا اور ہماری نگاہیں ملی تھیں تو ہمارے چہروں پر سے نقلی مسکراہٹوں کے نقاب گر پڑے تھے اور ہم یوں ایک دم چپ ہوگئے تھے گویا کہہ رہے ہوں ہم جو باتیں کر رہے ہیں وہ سب بکواس ہے' فریب ہے' دھوکہ ہے۔ ہم اپنی آوازوں کو بلند کر کے دل کی ویران خاموشی کو دبا نہیں سکتے۔ یہ خموشی ہماری محبت کا کفن ہے اور ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونے کا بڑا صدمہ ہے اور ہم نے دلوں پر گہرا زخم کھایا اور ہمارے قہقہوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی ہیں۔

رات کا کھانا ہم سب نے ایک دسترخوان پر کھایا۔

کھانے کے بعد ہم اکٹھے سینما دیکھنے چل دیئے۔ مجھے اس فلم سے قطعاً دلچسپی نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ تم میرے ساتھ میری محبت کا آخری وقت بسر کر رہی ہو اور دوسرے روز تم لاہور سے باہر جا رہی ہو اور اگلے ماہ تمہاری شادی ہو رہی ہے اور شادی کے بعد تم میری یاد کو سنگترے کے چھلکے کی مانند اپنے دل سے اتار کر گلی میں پھینک دو گی اور ہماری محبت کی آبدوز کشتی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سمندر کی تہہ میں غرق ہو جائے گی۔ برق رفتاری سے گزرتے ہوئے ان زریں لمحات کا میں زیادہ سے زیادہ لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ میں تمہارے بھائی کے ساتھ تانگے کی اگلی نشست پر بیٹھا تھا اور بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا۔ میرے صحت مند قہقہے تم لوگوں پر زندہ دلی اور شگفتگی کے پھول لٹا رہے تھے اور تمہیں یاد ہے' تم نے دم لیتے ہوئے کہا تھا:

''ہائے اللہ۔۔۔۔۔۔آپ تو ہمیں ہنسا ہنسا کر مار ڈالیں گے۔''

ہاں کنیز! میں تمہیں ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ اس سے پیشتر کہ تم دوسرے کی آغوش میں جاؤ' میں نے تمہیں شہر کی سب سے بلند عمارت پر سے نیچے دھکیل دینا چاہا تھا۔ میں ادیب ضرور ہوں کنیز! مگر محبت کے میدان میں جاہلوں سے بڑھ کر جاہل ہوں۔ لیکن میری جہالت ابھی غیر مکمل تھی' زیر تربیت تھی۔ میں تمہیں کچھ نہ کہہ سکا۔ ہم سینما ہال میں گیلری پر جا کر بیٹھ گئے۔ تمہاری ایک جانب بھابھی تھی اور دوسری جانب تمہارا بھائی۔۔۔۔۔۔فلم شروع ہوگئی اور مجھے بہت دیر پہلے کی ایک رات یاد آگئی جب ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے فلم دیکھ رہے تھے اور میں نے تمہارا ہاتھ دباتے ہوئے تم سے پوچھا تھا:

''کنیز! وہ پھول کن گھاٹیوں میں کھلتے ہیں جن کی خوشبو تمہارے ہونٹوں سے اٹھ رہی ہے؟''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور تم نے حیا آلود مسکراہٹ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

اور آج تم دور۔۔۔۔۔۔۔۔ دو پہریداروں کے درمیان بیٹھی تھیں اور میرے ہاتھ میں سیاہ پائپ بجھ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کاش ہمیں ایک پل کی تنہائی میسر آسکے اور میں تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تمہیں کہوں' کنیز! میں جن پھولوں کی تلاش میں تاریک گھاٹیوں میں گھومتا پھرا تھا وہ مجھے مل گئے ہیں اور اب میں تمہارے پاس کبھی نہ آؤں گا اور تمہیں شادی مبارک ہو اور سونے کی انگوٹھیاں مبارک ہوں اور تمہاری گھڑی کا فیتہ اور زریں ست لڑی تمہارے سوٹ سے خوب میچ کرتی ہے اور کنیز! تمہارے والدین تم سے بہت محبت کرتے ہیں ان کی ہمیشہ عزت کرنا۔ انہوں نے تمہارے لیے ایسا گھر تلاش کیا ہے جس کے فرش قالینوں سے ڈھکے ہوئے ہیں اور جہاں قالین پر بیٹھ کر ہلدی اور سوکھے تمبا کو کا حساب کتاب ہوتا ہے۔ جہاں شیکسپیئر' ابسن اور چیخوف کے ڈرامے ردی میں خریدے جاتے ہیں اور پھر ان میں ہلدی اور تمبا کو باندھا جاتا ہے۔ اور جہاں مجاہد کی واپسی اور بہشتی زیور کا مطالعہ ہوتا ہے اور قرآن کی آیات سے دردسر کا علاج کیا جاتا ہے اور جہاں کوئی سینما دیکھنے نہیں جاتا اور کوئی پمفلٹ نہیں پڑھتا۔ ایسے گھر میں تمہارے دل کو امن نصیب ہوگا اور تمہارے دماغ کو تسکین ملے گی۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تمہارا خاوند تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لیتا آیا کرے گا۔ کبھی اصلی ممیرے کا سرمہ' کبھی قصوری میتھی' اور کبھی نماز کے بعد پڑھنے والی مناجات کی کتاب۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ وہ آسائشیں ہیں جو میرے گھر میں تمہیں نصیب نہ ہوسکتی تھیں۔

ہوسکتا تھا جس روز میرا تنخواہ ملنے کا دن ہوتا گھر میں کچھ نہ پکا ہوتا اور تم خالی پیٹ کھڑکی کے پاس لگی میرا انتظار کررہی ہوتیں اور تمہارے پاس ہی الماری ملٹن' پریسٹلے' آرنلڈ' موپساں اور برونٹی کی کتابوں سے بھری ہوتی اور جب میں گھر میں داخل ہوتا تو تمہاری اداس نگاہیں اوپر اٹھتیں اور میرے ہاتھ میں نرگس کے پھول ہوتے اور جیب میں محض دو تین روپے میں سارے پیسے تمہارے آگے رکھ دیتا۔

"تنخواہ نہیں ملی' کچھ ایڈوانس لے آیا ہوں"

تم فوراً ایک روپے کا آٹا اور آٹھ آنے کی لکڑیاں منگواتیں اور چولہے میں آگ سلگ اٹھتی۔ میں پائپ سلگا کر چوکی پر بیٹھ جاتا اور نرگس کے پھولوں کو دیکھنے لگتا جنہیں میں تمہارے لیے لایا تھا اور جنہیں تم نے چھوا تک نہیں تھا۔ تم کمزور آواز میں کہتیں:

"آپ لوہاری گئے تھے تو وہاں سے ادرک بھی خرید لاتے"

ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ میں لوہاری گیا تھا مگر ادرک کی بجائے نرگس کے پھول خرید لایا تھا۔ اور نرگس کے پھول شلغم پکانے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کوئی مدد نہیں دے سکتے۔ میں آئندہ ہمیشہ ادرک خریدا کروں گا۔

نرگس کے پھول اور ادرک! گلستان فاطمہ اور لنڈا بازار!

انٹرول ہوا تو کہیں سے تمہارا بھینگی آنکھ والا ماموں بھی آ گیا۔

وہ تمہارے پاس ہی کرسی کے بازو بیٹھ کر تم سے باتیں کرنے لگا۔ تم بھی اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں اس نے دو تین بار مجھے طنز بھری نگاہوں سے دیکھا اور بالآخر گولڈ فلیک کا سگریٹ پیش کر دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ نقرئی طشت میں رکھا ہوا جوتا پیش کر رہا ہو۔ میں نے سگریٹ لینے سے انکار کر دیا۔ میں سگریٹ کیوں لیتا؟ آخر وہ میرا کون تھا؟ لیکن وہاں کوئی بھی تو میرا نہ تھا۔ تمہاری کلائی پر شادی کی گھڑی کا ڈائیل چمک رہا تھا تم میرے قریب ہو کر مجھ سے ہزاروں میل دور تھیں۔ ہم ایک انچ کے فاصلے پر بیٹھے تھے اور ہمارے درمیان سات سمندروں کا بعد حائل تھا۔ تم سب لوگ مجھے جانتے تھے اور تم میں سے ایک بھی مجھے نہ جانتا تھا پھر بھی تم لوگوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا اور میری مسکراہٹ تم لوگوں کو میرے پاس آنے سے روک رہی تھی اور وہاں میرا کوئی نہ تھا' تمہاری بھابھی نہ تمہارا بھائی اور نہ تمہارا ماموں!

فلم دوبارہ شروع ہوئی تو میں چپکے سے اٹھا اور سینما ہال سے باہر سڑک پر آ گیا۔

اے دل بے تاب' اب کہاں؟ اب کدھر؟

میں نے جیب سے پائپ نکالا۔ لیکن تمباکو ختم ہو چکا تھا۔ پائپ جیب میں ڈال کر میں نے یونہی ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ کافی دور نکل جانے پر میں ایک ایسی تنگ سی سڑک پر آ گیا جو دو رویہ کوٹھیوں کے درمیان سے ہو کر گزرتی تھی۔ یہ سڑک کچی تھی اور اس پر یوکلپٹس کے اونچے اونچے درختوں کا سایہ تھا۔ میں ایک جگہ چھوٹے سے پل پر بیٹھ گیا۔

وہ رات مجھ سے بھی زیادہ اداس تھی۔ کچے راستے پر ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ ایک کوٹھی کی کھڑکی پر بیل چڑھی ہوئی تھی اور اس میں سے پھیکے زرد رنگ کی کمزور روشنی باہر باغ میں پڑ رہی تھی۔ قریب ہی کہیں سے لیموں کے پھولوں کی ترش مہک آ رہی تھی۔ کھڑکی میں سے آتی ہوئی روشنی ایک دم بجھ گئی اور درختوں تلے اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ میں نے بجھا ہوا پائپ اپنے منہ میں دبا لیا اور سوچنے لگا تم اس وقت گیلری میں بیٹھی فلم دیکھ رہی ہو گی تمہارے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ تمہارے بالوں کی خوشبو محسوس کر رہے ہوں گے اور سینما کی تکونی چھت پر ستاروں کی دھیمی روشنی بکھر رہی ہو گی۔ میرے پاس کس قدر خاموشی تھی۔ مجھے سیفو کا ایک قدیم یونانی گیت یاد آ رہا تھا جو اس نے اپنی موت سے کچھ دیر پہلے لکھا تھا:

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''میں اکیلی ہوں اور

اندھیرا میرے شانوں پر جھک آیا ہے

اے پہاڑوں کے پیچھے چھپ جانے والی روشنی!

میں تیری طرف بڑھ رہی ہوں

میں تیری تلاش میں آ رہی ہوں..........''

کنیز! زندگی تم سے جدا رہ کر بھی گزر جائے گی! لیکن اگر زندگی بسر کرنے کا کوئی مقصد ہے تو میری زندگی مقصد سے خالی ہو گی اور میں زندگی نہیں بلکہ سفر میں آئی ہوئی ایک رات بسر کروں گا۔ کاش میں تمہیں سمجھا سکوں کہ مقصد کے بغیر زندگی گزارنا میرے لیے کس قدر مشکل ہے اور یہ مقصد اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس دشوار گزار راستے کے کسی موڑ پر اچانک کوئی کنیز مل جاتی ہے۔ پھر جگہ جگہ ٹھنڈے پانی کے چشمے ملتے ہیں اور ہر پڑاؤ پر ایک آدھ گڈریا دودھ اور روٹی لیے کھڑا ہوتا ہے۔ پھر زندگی نہیں گزرتی کنیز! پھر آنکھوں کے سامنے سے قوس قزح کے رنگ گزرتے ہیں اور کہکشاں کی دھند گزرتی ہے اور چاندنی کا نور گزرتا ہے پھر کسی کنیز کو نرگس کے پھول دیکھ کر اورک کا خیال نہیں آتا۔ پھر تنخواہ پہلی کو ملتی ہے اور گھر میں ہر روز گوشت پکتا ہے اور چائے ابلتی ہے۔

کتنی ہی دیر میں اس تنہا تنہا' اداس سی کچی راہگزار پر بیٹھا رہا۔ جب رات کافی گہری ہو گئی اور ستاروں کی ٹولیاں یوکلپٹس کے جھنڈوں میں چھپنے لگیں تو میں آہستہ سے اٹھا۔ پائپ جیب میں ڈالا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

اگلے روز تم لاہور سے باہر جا رہی تھیں۔

تھوڑی دیر کے لیے تم پروین کے ہمراہ ہمارے گھر آئیں۔ پروین تمہیں میرے چھوٹے سے کمرے میں لے آئی اور تمہارا سر جھکا ہوا تھا اور تمہاری پلکیں اداس تھیں اور پھر بجلی ایک دم فیل ہو گئی اور موم بتی کی دھیمی روشنی میں ہم دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے تمہاری آواز کمزور تھی اور میری ہر بات کے جواب میں تم آہستہ سے سر ہلا کر صرف اتنا ہی کہتیں:

اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب کچھ نہیں ہو سکتا''

تمہارا لہجہ افسردہ تھا' سوگوار تھا' جیسے شام کی ہوا جھڑے ہوئے پتوں پر سے گزر رہی ہو۔ تمہیں سٹیشن تک چھوڑنے میں بھی گیا۔

پلیٹ فارم پر تمہارا سارا خاندان موجود تھا۔ ان لوگوں میں تمہارا بھینگی آنکھوں والا ماموں اور تمہارے ہونے والا خاوند بھی تھا۔ میں تمہارے خالہ زاد بھائی کے ساتھ ٹی سٹال پر جھکا سگریٹ پی رہا تھا ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔ تم پروین کے ساتھ ریل کے ڈبے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں بیٹھی تھیں اور مجھے تمہاری گردن کی چمکیلی ست لڑی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ تمہارا بھائی سامان وغیرہ ٹھکانے لگا رہا تھا اور تمہارا باپ تمہارے ہونے والے خاوند کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ یہ لوگ ہمارے قریب ہی کھڑے تھے اور تمہارے خاوند کی جیب میں پارکر اکاون کا قلم تھا اور گلے میں ریشمی مفلر اور انگلیوں میں گولڈ فلیک کا سگریٹ تھا۔

گولڈ فلیک کے سگریٹ اس نے سٹیشن پر خریدے تھے اور مفلر شاید انارکلی میں خریدا تھا اور پارکر کا قلم بھی شاید وہیں سے خریدا ہو اور اب اگلے ماہ وہ تمہیں بھی خرید رہا تھا۔ خرید و خرید و۔۔۔۔۔۔۔ یہاں ہر شے کی ایک قیمت ہے۔ گولڈ فلیک سے پارکر اور پارکر سے کنیز تک یہاں ہر شے بکتی ہے۔ ہر شے فروخت ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔

کنیز کو حاصل کرنے سے پہلے تمہیں مجھ سے لڑنا ہوگا۔ ہم دونوں میں جو زندہ بچے گا وہی اس کا مالک ہوگا۔

لیکن افسوس یہ کہ میں آپ کو اس ڈوئل پر آمادہ نہ کر سکا اور الٹا مجھے اس پر ترس آنے لگا اور اس سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔

بے چارہ تمہارا خاوند۔۔۔۔۔۔!

سگنل کرتے ہی انجن نے سیٹی دی اور پروین تمہارے ڈبے سے باہر نکل آئی۔ تمہارے بھائی نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور تمہارے پاس جا کر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔۔ دوسری سیٹی پر گاڑی پلیٹ فارم پر سے کھسکنے لگی۔ بے شمار رومال فضا میں لہرائے۔ تم نے سر کھڑکی سے باہر نکال لیا۔ کچھ دور تک مجھے تمہارا افسردہ چہرہ دکھائی دیتا رہا اور پھر ہر شے ہر چیز نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے تمہاری گاڑی پھر لاہور سٹیشن پر واپس نہیں آئے گی اور میں اب کبھی تمہاری جھکی ہوئی اداس پلکیں نہ دیکھ سکوں گا اور تمہارے بالوں کی خوشبو نہ سونگھ سکوں گا اور تمہاری تھکی تھکی آواز نہ سن سکوں گا۔۔۔۔۔۔ جیسے میں تمہاری گاڑی کے پیچھے بھاگنے لگا اور میں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر تمہیں آوازیں دیں۔

مت جاؤ۔۔۔۔۔۔ مت جاؤ کنیز! غریب ہوں' لیکن میری محبت غریب نہیں ہے۔ گاڑی کی زنجیر کھینچ دو۔ ٹھہر جاؤ' میرا پبلشر میری نئی کتاب خرید رہا ہے۔ اس نے کہا ہے میں پہلے کار خریدلوں پھر تمہاری کتاب خریدوں گا۔ زنجیر نہیں کھینچ سکتی؟ گاڑی نہیں رک سکتی؟ تو تم میرا انتظار کرنا کنیز! تمہیں لینے ضرور آؤں گا۔ پھر ہم بھاگ کر کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے اور وہاں کورٹ میں پیش ہو کر شادی کرلیں گے اور پھر لمبی لمبی سیریں کریں گے اور جب پیسے ختم ہو جائیں گے تو اکٹھے خودکشی کرلیں گے اور زمین کے نیچے چلے جائیں گے۔۔۔۔۔۔ میں تمہیں لینے ضرور آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرنا۔ میں نے ریل کے کرائے کے لیے افسانہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ ابھی صرف ایک ہی صفحہ لکھا ہے۔ سیاہی ختم ہوگئی تھی۔ کل کچھ ایڈوانس لے کر سیاہی کا پورا ڈبہ لاؤں گا۔ فکر نہ کرو' کل ایڈوانس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضرور مل جائے گا اور اگر نہ ملا تو میں یہ نوکری ہی چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔۔"

پروین میرے قریب ہی کھڑی تھی مجھے اتنا یاد ہے اس نے مجھ سے کچھ پوچھا تھا۔ کیا پوچھا تھا؟ مجھے یاد نہیں۔ میں نے بجھا ہوا سگریٹ لائن کی خالی پٹڑیوں پر پھینک دیا اور سٹیشن سے باہر نکل آیا۔ میں اس ڈیوڑھی میں سے گزرا جہاں تمہارا تانگہ آ کر رکا تھا اور تم نے نیچے اترتے ہوئے بید کی چھوٹی سی ٹوکری مجھے پکڑا دی تھی۔

اب میرے ہاتھ خالی تھے اور میں اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اپنے چھوٹے سے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

میں ابھی ابھی اس کمرے میں آیا ہوں۔

میں نے اس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا ہے اور اس ایک دروازے نے بند ہو کر میری سوگوار یادوں کے سینکڑوں دروازے کھول دیئے ہیں اور ہر دروازے پر مجھے بھولے بسرے گیتوں کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

پروین نے کہا تمہیں اپنے ہونے والے خاوند سے نفرت ہے۔

لیکن کنیز تمہارے والدین کو اس سے نفرت نہیں! تمہیں اس سے نفرت کرنے کا کیا حق؟ اور پھر شادی کے بعد نفرت اور محبت کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ تمہارا خاوند ہر دوسرے سال تمہیں ایک بچہ دے گا اور تم سائے کی طرح اس کے قدموں میں بچھ جاؤ گی اور وقت کا سمندر تمہارے دل پر سے میری محبت کی مدھم تحریریں دھو ڈالے گا اور پھر جب کبھی اپنے بچے کو دودھ پلاتے ہوئے تمہیں میرا خیال آئے گا تو تمہارے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہو گا اور تم اپنے بچے کا منہ چوم کر دل میں سوچو گی۔

"میں بھی کس قدر پاگل ہو گئی تھی۔"

اور کنیز! میں بھی کس قدر پاگل تھا کہ تم سے محض محبت کرتا رہا اور جب تم جدا ہونے لگیں تو خاموش پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔ تمہارا خاوند عقلمند ہے جس نے پارکر قلم خریدنے کے بعد تمہیں بھی خرید لیا' اور جو محبت کے متعلق اس وقت سوچے گا جب تم اس کے سامنے پھولوں بھری سیج پر بیٹھی ہو گی اور تمہارا سر جھکا ہوا ہو گا۔ اور پھر اسے محبت کرنے کا حق بھی ہے اس کا باپ سوکھے تمباکو کا بیوپاری ہے اور اس کے پاس دولت ہے' عزت ہے' قالین ہیں' اس نے تمہیں سونے کے ڈائیل والی گھڑی لا کر دی ہے' زرتار ست لڑی چمکدار بندے اور بیش قیمت انگوٹھیاں پہنائی ہیں اور کنیز! محبت قالینوں پر ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ صوفوں پر ہوتی ہے' جب کلائی پر سونے کی گھڑی ہو اور جیب میں پارکر کا قلم ہو اور گلے میں زریں ست لڑی ہو۔ میں تم سے محبت کر سکتا ہوں؟ میری محبت نے تین ماہ سے مکان کا کرایہ بھی ادا نہیں کیا اور سگریٹوں والا کل بھی پیسے مانگ رہا تھا اور گرمیاں آ گئی ہیں اور میرے پاس ایک بھی ٹھنڈی پتلون نہیں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔۔۔۔۔۔"

میری محبت گمشدہ بچہ ہے جو تمہارے شہر کی گلیوں میں آ کر کھو گیا ہے۔ اور جو ہر راہ گیر سے اپنے گھر کا پتہ پوچھتا ہے لیکن جسے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ جیسے کوئی نہیں پہچانتا۔۔۔۔۔۔ تمہارے شہر نے مجھ سے اچھا سلوک نہیں کیا کنیز! اس نے اگر ایک ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا ہے تو دوسرے ہاتھ سے میری جیب کاٹ لی ہے۔ اس نے مجھے پانی ملا دودھ' ریت ملا پانی اور پھٹے ہوئے کپڑے دیئے ہیں۔ اس نے میرے اردگرد ایسے دوستوں کو جمع کر دیا ہے جو چائے خانوں میں میرے ساتھ ہوتے ہیں مگر سڑکوں پر میرا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں' جو پھول دار درختوں تک میرے ساتھ جاتے ہیں لیکن خاردار جھاڑیوں میں مجھ سے بچھڑ جاتے ہیں اور جو میرے بلند قہقہوں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں مگر جنہیں میری خاموشی مجھ سے جدا کر دیتی ہے۔ میرا وہ دوست کب آئے گا جسے میری باتوں اور قہقہوں کا لالچ نہ ہوگا' جو مجھ سے کوئی بات نہ کرے گا اور جس کی دوستی میری خاموشی سے غذا حاصل کرے گی اور جس کی خاموشی میری فریادوں کی ہم نوا ہوگی۔ اور جو اس وقت ہمہ تن گوش ہو جائے گا جب میرے ہونٹوں پر اداس محبت کا نغمہ بلند ہوگا۔ اور جو اس وقت آہستہ سے سر ہلا دے گا جب میرے گیت لوٹ کر سم پر آئیں گے۔

کنیز تم سے بچھڑنے کے بعد مجھے ایسا دوست کہاں ملے گا؟ میں اسے کون سے آسمان پر تلاش کروں؟ کون سے ستارے میں ڈھونڈنے جاؤں؟ میں تو اس دیس میں اجنبی ہوں' مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا' یہ لوگ دن کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں اور میں رات کے متعلق سوچ رہا ہوتا ہوں۔ یہ صحراؤں کی بات کرتے ہیں میں مرطوب سمندروں میں نکل جاتا ہوں۔ میں جسے مٹی سمجھ کر پھینک دیتا ہوں یہ سونا سمجھ کر اٹھا لیتے ہیں ان کے ہونٹوں پر گرم ہواؤں کا تذکرہ ہوتا ہے اور میرے ذہن میں برف کا منظر۔۔۔۔۔۔ جو ان کا سورج ہے وہ میرا چاند' جو ان کا سونا وہ میری مٹی' جو ان کی خزاں ہے وہ میری بہار۔۔۔۔۔۔

مجھے اس شہر سے کوچ کر جانا چاہیے' میں اس شہر سے بہت جلد چلا جاؤں گا کہیں' کسی طرف۔۔۔۔۔۔ لیکن جاؤں گا ضرور۔۔۔۔۔۔ میں نے اس شہر میں زندگی کے تین سال بہروں اور گونگوں میں بسر کیے ہیں۔ میں نے ان پستیوں میں بہت جھک کر پرواز کی ہے اور میرے پنجے زمین کو چھوتے رہے ہیں اور پر کھڑکیوں سے ٹکراتے رہے ہیں۔ تم سے باتیں کرنے کے لیے میں نے جنگلوں کی خاموشیوں سے رخصت طلب کر لی تھی۔ تمہاری گلیوں کی خاطر میں اپنے برف پوش پہاڑوں سے نیچے اتر آیا تھا اور تمہاری زمین کے لیے میں نے نیلے آسمان کو خیر باد کہا تھا۔ اور اب جب کہ تم مجھ سے جدا ہو رہی ہو' میں اپنی محبت کو آخری مرتبہ قبرستان میں دفن کر رہا ہوں اور اس کے مزار پر نرگس کے پھول رکھ رہا ہوں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوجا میری بدنصیب! اکیلی میری ویران محبت!

تیرے شہر کی گلیاں ویران ہو گئی ہیں' تیرے درختوں کے پتے جھڑ گئے ہیں' میرے پہاڑوں کے چشمے سوکھ گئے ہیں' اور تیرے میدانوں کی آگ بجھ گئی ہے اور تیرے آسمان کا سورج ڈوب گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ تیری پلکوں پر آئے ہوئے آنسو اب کوئی نہ پونچھے گا۔ تیری سنسان راتوں کے گیت اب کوئی نہ سنے گا۔ اب کچھ باقی نہیں بچا۔ اب یہاں کوئی نہیں۔۔۔۔۔۔ کوئی نہیں اپنے جوڑے میں لگے ہوئے پھول درختوں کو واپس کردے' اپنی مانگ کا سندور زمین کی جھولی میں ڈال دے۔ اپنے آنچل پر ٹکے ہوئے ستارے رات کی دہلیز پر رکھ دے اور اپنی خواب گاہ کی روشنیاں گل کردے اور اندھیرے کی چادر اوڑھ کر سو جا۔۔۔۔۔۔ میں تجھے پیار بھرے ہاتھوں سے تھپتھپاتا ہوں اور ان غمزدہ روحوں کی داستانیں سناتا ہوں جنہیں محبت' نخلستان سے کھینچ کر جلتے صحراؤں میں لے گئی اور جو محبت کی دیواروں میں زندہ چنوادی گئیں اور کھولتے لاوے میں کود گئیں۔

سوجا میری سسّو! میری انارکلی! میری اوفیلیا! تیرے ہملٹ کو زہر میں بجھی ہوئی تلوار چھو گئی ہے۔ وہ محل کی سیڑھیوں پر اوندھے منہ پڑا ہے اور اس کا سر پتھر پر ہے اور وہ تیرے نرم بالوں کو یاد کررہا ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔۔۔۔۔۔

الوداع! میری عظیم محبت! مجھے جو کچھ لکھنا تھا یہاں ختم ہوتا ہے۔

میری کمزور تحریر کو درگزر کرنا کیونکہ میں نے ستاروں کو گننے کی کوشش کی ہے اور پہاڑوں کو رسی سے ماپنا چاہا ہے اور قوس قزح کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔ کل طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں تجھے پھولوں کے بستر پر اور مجھے زندگی کی دہلیز پر ملیں گی' تجھے میٹھے چشموں پر اور مجھے کھارے سمندروں میں پائیں گی' تجھے درختوں کی چھاؤں اور مجھے رتیلے جھکڑوں میں الجھتے دیکھیں گی۔ اب شام کی دھیمی روشنی رات کے سایوں میں گم ہو رہی ہے۔ میرے کمرے میں اندھیرا بڑھ رہا ہے اور کارنس پر نرگس کے پھول گردنیں جھکا کر سو گئے ہیں۔

طلوع ہوا ے پہاڑوں کی روشنی! میرے پھول کی پنکھڑیوں کو اوپر اٹھا۔۔۔۔۔۔ میرا کمرہ تاریک ہے اور تیرے طلوع ہونے کا وقت آن پہنچا ہے۔

◆◆◆

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سماوار

میں اور لالی لاہور میں اکٹھے رہتے ہیں۔

پہلے وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ لدھیانے رہا کرتا تھا جہاں اس کا باپ طبلہ اور کلارنٹ بجانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ وہ چل پھر کر گراموفون کمپنیوں اور سفری تھیٹروں میں کام کیا کرتا تھا۔ فسادات شروع ہوئے تو یہ لوگ کلو اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے ہاں آ گئے۔ لالی کا باپ دلی میں تھا۔ فسادات زیادہ نازک صورت اختیار کر گئے تو لالی نے اپنی ماں کو ساتھ لیا اور پاکستان آنے والے قافلے میں شامل ہو گیا۔ پٹھان کوٹ کے قریب ان کے قافلے پر حملہ ہوا مگر وہ دونوں بچ کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ لاہور آ کر لالی نے اپنی ماں کو مہاجرین کیمپ میں ٹھہرایا اور خود کام کی تلاش شروع کر دی۔ ڈیڑھ ماہ تک مال اور میکلوڈ کی خاک چھاننے کے بعد جب روزگار کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو لالی اپنی ماں کو ساتھ لے کر گجرات کے قریب ایک گاؤں میں آ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ گاؤں میں وہ کم سے کم پیسوں میں بھی گزارہ کر سکیں گے۔ انہیں وہاں ایک کچا مکان مل گیا۔ لالی نے بڑی محبت سے مکان کی جھاڑ پونچھ کی اور بیڑی سلگا کر ماں سے کہا:

''اب ہم یہیں رہیں گے اور ابا کو بھی یہیں بلا لیں گے''

یہ جگہ بڑی اچھی ہے اور خاص طور سے یہاں کا پانی تو نمبر ون ہے''

پانی واقعی نمبر ون تھا لیکن لالی کے لیے وہاں روزگار کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لدھیانہ میں وہ ایک رنگساز کی دکان پر خاکوں میں رنگ بھرنے اور بورڈوں پر اردو انگریزی حروف لکھنے کا کام کرتا تھا۔ گاؤں میں رنگسازی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک روز اس نے ماں سے پانچ روپے لیے اور بوریا بستر باندھا اور ریل میں سوار ہو کر لاہور آ گیا۔

لاہور میں اسے جس سینما گھر میں نوکری ملی' میں بھی وہیں ملازم تھا۔ ہماری بہت جلد آپس میں دوستی ہو گئی۔ شروع شروع میں وہ لدھیانے کے ایک نائی کی دوکان میں سوتا تھا۔ پھر میں اسے اپنے پاس کوٹھری میں لے آیا۔

ہم دونوں صبح نو بجے سے چھ بجے تک سینما گھر میں کام کرتے ہیں اور رات کو اکٹھے ایک ہی کوٹھری میں سوتے ہیں۔ یہ کوٹھری سینما کے عقب میں ایک تنگ سی اندھیری گلی میں واقع ہے۔ آدھی کوٹھری ٹوٹی پھوٹی کرسیوں اور شکستہ بورڈوں کے بوسیدہ ڈھانچوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے بھری پڑی ہے۔ آدھے حصے میں ہم نے چار پائی بچھا رکھی ہے۔ میرا بستر چار پائی پر ہے اور لالی نے دروازے کے ساتھ زمین پر کھیس ڈال کر اس پر اپنا بستر لگا رکھا ہے۔ ایک دن میں چار پائی پر سوتا ہوں اور ایک دن لالی۔ میرے لحاف میں روئی جگہ جگہ اکٹھی ہوگئی ہے اور لالی کے لحاف کے کنارے میل سے بھرے ہوئے ہیں۔ استاد نے سینما والوں سے کہہ کر یہ کوٹھڑی خاص طور پر مجھے دلوائی ہے اور جب کبھی مجھ سے کوئی کام خراب ہو جائے تو رنگ پھیرنے والا بڑا برش اٹھا کر میری طرف لپکتا ہے اور ہمیشہ یہی جملہ دہراتا ہے۔

''سالو! سر چھپانے کو جگہ نہ تھی۔ کمرہ لے کر دیا اور اب ہڈحرامی کرتے ہو؟''

وہ میرا اور لالی کا مشترکہ استاد ہے اور سینما کا ہیڈ پینٹر ہے۔ سینما کی دوسری منزل پر وہ ایک کشادہ سے کمرے میں کام کرتا ہے۔ اس کے دو تین شاگرد اور بھی ہیں مگر چونکہ وہ ہم سے چھوٹے ہیں اس لیے ہمارا ان سے زیادہ ملاپ نہیں ہے۔ ہمارے استاد کا پورا نام خوشی محمد اختر پینٹر کاتب اینڈ آرٹسٹ ہے۔ اس نے اپنے گھر کے باہر بورڈ پر اپنے نام کے نیچے بال سے زیادہ باریک اور ہاتھی سے زیادہ موٹا لکھنے والا لاہور کا واحد کاتب' خاص طور سے لکھوا رکھا ہے۔ وہ چھوٹے قد، درمیانے جسم اور گندمی رنگت کا آدمی ہے۔ اس کے دانت بڑے گندے ہیں اور نچلا ہونٹ ہر وقت لٹکا رہتا ہے۔ اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ہمیشہ پانی بہا کرتا ہے اور جب وہ عورتوں کی باتیں شروع کرتا ہے تو اس کے منہ سے بھی پانی بہنے لگتا ہے۔ اس کی اپنی دو بیویاں ہیں پھر بھی عورتوں کے ذکر پر اس کے چوڑے نتھنے یوں پھیلنے سکڑنے لگتے ہیں جیسے پاس ہی گرم گرم ڈبل روٹیوں کا ٹوکرا پڑا ہو۔ وہ جالندھر کا مہاجر ہے۔ اس کی عمر چالیس کے قریب ہے مگر وہ خراسانی خچر کی طرح تازہ دم ہے۔ جالندھر میں وہ اپنے استاد کی لڑکی سے عشق لڑاتا تھا اور اب اپنے ایک شاگرد کی ماں پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ وہ ہر بات میں کسی نہ کسی طرح فسادات کا ذکر ضرور لے آتا ہے اور پھر جالندھر میں اپنی کارگزاریوں کی من گھڑت داستانیں بیان کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے پاس کبھی کبھی ایک نقلی ڈاکٹر آیا کرتا ہے جس کی شکل گائے سے ملتی جلتی ہے اور جس نے گرائپ واٹر کے مقابلے میں بچوں کے لیے کوئی گھٹیا سی طاقتور دوائی تیار کی ہے۔ اس ڈاکٹر کے ٹین کے چھوٹے چھوٹے کچھ بورڈ ہیں جنہیں ہمارا استاد بنائے بیٹھا ہے۔ یہ ڈاکٹر گوجرانوالے کا ہے۔ شلوار اور چھوٹے کوٹ کے اوپر کلاہ پہنتا ہے اور اردو میں خالص گوجرانوالہ کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی دن اچانک بیٹھک میں آن نمودار ہوتا ہے اور آتے ہی بولنے لگتا ہے۔

''بھائی صہیب! آپ نے تو ہمارے کاروبار میں ڈکا لگا دیا ہے''

ہمارا استاد پیار سے گردن کھجلاتے ہوئے سب سے چھوٹے شاگرد کو آواز دیتا ہے:

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''چل اوئے خراسی دیا پترا! ڈاک دار آئے ہیں۔ نکال خاں ذرا ان کے بورڈ''

ہمارا استاد اگرچہ گوجرانوالے کا نہیں لیکن اردو بولنے میں وہ بھی ڈاکٹر صاحب سے کم نہیں ہے۔ پھر وہ ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر بڑی شان سے کہتا ہے:

''اے لو بادشاہو! ابھی ڈبری ٹیٹ کر دیتے ہیں۔''

ڈاکٹر کا سارا غصہ رفو چکر ہو جاتا ہے اور وہ کلاہ اتار کر بیٹھ جاتا ہے اور حقہ پیتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتا ہے۔ استاد بہت جلد اسے عورتوں کے امراض پر لے آتا ہے اور اس کے بعد انہیں رام کرنے کے نسخے پوچھنے شروع کر دیتا ہے۔ وہ ڈاکٹر کی نئی دوائی کی بے حد تعریف کرتا ہے جس سن کر ڈاکٹر کا کپا سا منہ لال ہو جاتا ہے اور وہ اپنے بورڈ وغیرہ بالکل بھول جاتا ہے۔ وہ بات بات پر بچوں کی طرح اچھل اچھل کر ہنسنے لگتا ہے اور بڑی نزاکت سے کلاہ اٹھا کر سر پر جماتا ہے۔ جیسے وہ چینی کا بنا ہوا ور سلام علیک کے بعد باہر نکل جاتا ہے۔ اس کے نکلتے ہی استاد ٹین کے گرد آلود بورڈ اٹھوا کر الماری کے پیچھے پھنکوا دیتا ہے اور دھوتی کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے ہمیں مخاطب کر کے کہتا ہے۔

''دیکھا سالو! اسے کہتے ہیں کاروبار۔۔۔۔۔۔۔ کام بھی نہ ہوا اور گاہک کو شکایت بھی نہ ہوئی''

ہمارا استاد سینما کے ہر آدمی سے فحش مذاق کرنے کا عادی ہے۔ سینما کے آپریٹر یٰسین سے تو گالی گلوچ تک نوبت آ جاتی ہے۔ یٰسین لمبا چوڑا بھاری بھرکم آدمی ہے جو اونٹ کی طرح چلتا ہے اور ریچھ کی طرح سانس لیتا ہے۔ مشین کے اصلی کاربن بیچ کر نقلی کاربن سے کام چلانا اس کا دل پسند مشغلہ ہے اور جب روشنی مدھم ہو جانے ہر ہال میں اسے گالیاں پڑتی ہیں تو وہ غصے میں آ کر دیوار کے چورس سوراخ کے ساتھ منہ لگا کر چیخنے لگتا ہے۔

''چلو تمہاری ماں۔۔۔۔۔۔۔ تمہاری بہن۔۔۔۔۔۔۔ تمہاری۔۔۔۔۔۔''

سردیوں میں اس کے ہاتھ ہمیشہ بغل میں ہوتے ہیں اور گرمیوں میں وہ صرف ایک دھوتی باندھتا ہے۔ ہمارے کمرے میں آ کر جب وہ تخت پر بیٹھتا ہے تو اس کے تختے چرچرانے لگتے ہیں۔ وہ فلمی رقاصہ مس ککو کا عاشق ہے اور اسے ہمیشہ بلبل کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ربڑی کر دوں گا' اس کا تکیہ کلام ہے۔ ہمارے استاد کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مار کر وہ پکار اٹھے گا:

''حقہ پلا اوئے خوشے انہیں تو ربڑی کر دوں گا۔''

یٰسین حقے کا رسیا ہے۔ وہ حقے کی نے منہ میں رکھ کر سینما کی مشین سٹارٹ کرتا ہے۔ ہمارے استاد کے ہر فن مولا بڑے بھائی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے جنگ کی باتیں سن سن کر وہ بڑا حیران ہوا کرتا ہے اور کان میں دیا سلائی پھیرتے ہوئے پکار اٹھتا ہے:

''تم دیکھ لینا لالا! اب ہر جگہ انگریزوں کی ربڑی ہوگی''

''ہائے میری بلبل! مولا نے چاہا تو کبھی تیری بھی ربڑی کریں گے''

ہمارے استاد کا بڑا بھائی تاج شہر کے ایک پرائمری سکول میں ڈرائنگ ماسٹر ہے۔ اس نے دنیا کے ہر فن میں تھوڑی ٹانگ اڑا رکھی ہے۔ چھٹی کے دن وہ سارا وقت استاد کے پاس بیٹھک میں گزارتا ہے۔ وہ بے حد باتونی ہے اور ہر بات میں نکتے ڈھونڈا کرتا ہے۔ سردیوں میں وہ ایک لوئی اوڑھے رکھتا ہے اور گرمیوں میں کھدر کے کرتے پہنتا ہے۔ بوجھل آلکسی جسم اور سڑکتی ہوئی لمبی گھوڑے ایسی ناک لیے وہ کونے میں بوریئے پر بیٹھا حقے کا دھواں اڑایا کرتا ہے اور ہمارے استاد کے مرشد شاہ جی سے تصوف اور چرس کے نقصانات پر بحث کرتا رہتا ہے۔ جب برطانوی فوجوں نے سویز میں مصروں پر مظالم شروع کیے تو اس کا اتنا افسوس نحاس پاشا کو نہیں ہوا ہوگا جتنا تاج کو ہوا۔ وہ لوئی اوڑھ کر کونے میں اکڑوں بیٹھ گیا اور بار بار یہ جملہ دہرانے لگا:

''اب مصر کا کیا بنے گا؟ اب مصر کیا کرے گا؟''

اس پر اس کا چھوٹا بھائی تنگ آ کر چیخ اٹھا تھا:

''تمہاری ماں کا مصر مارا۔۔۔۔۔۔تم چاچے لگتے ہو مصر کے؟ ہزار بار منع کیا ہے کہ یہاں بیٹھ کر جنگ کی باتیں نہ کیا کرو۔ کیوں ہمارے پیچھے بھی سی ڈی لگا رہے ہو مگر اسے جب دیکھو وہی مصر' وہی جنگ۔۔۔۔۔۔''

تاج اپنے چھوٹے بھائی سے بہت دبتا ہے اور اس کی ہر بات بڑے آرام سے ناک پونچھتے ہوئے سہہ جاتا ہے۔ ویسے بھی اس کا مزاج سرد ہے اور وہ کبھی کسی بات پر آگ بگولا نہیں ہوتا۔ گھر کے لڑائی جھگڑوں کا حل وہ اپنے باپ کی زبانی بڑے ٹھنڈے دل سے سنا کرتا ہے۔ ایک روز ٹکٹ گھر کے باہر کسی نے طیش میں آ کر نوجوان کو چاقو گھونپ دیا۔ سینما میں کھلبلی سی مچ گئی۔ لالی' میں' استاد' استاد کا مرشد اور سارے کاریگر بھاگ کر نیچے آ گئے۔ جب ہم واپس آئے تو دیکھا تو تاج اپنی جگہ اسی طرح بیٹھا شطرنج پر جھکا ہوا تھا۔ شاہ جی کے دوبارہ بیٹھتے ہی اس نے ایک مہرہ بڑے آرام سے آگے بڑھا دیا۔

''شہ''

اسے کچھ نہ کچھ ایجاد کرنے کا شوق جنون کی حد تک ہے۔ وہ ہر اتوار کو کاغذ پنسل سامنے رکھ کر بیٹھ جاتا ہے اور آنکھ کے اشارے پر کھلنے والی تجوری' چور کی آہٹ پر غل مچانے والے برقی دروازے اور بیک وقت سرخ نیلی روشنائی دینے والے قلموں پر سوچ بچار

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرتا رہتا ہے۔ آج کل وہ اس فکر میں ہے کہ کسی نہ کسی طرح شطرنج کی ٹکڑیوں میں ترمیم کی جائے۔ ہمارے استاد کے مرشد بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔

وہ سبز رنگ کا چغہ پہنتے ہیں اور پاؤں سے ہمیشہ ننگے رہتے ہیں۔ گڑ کھانا اور مرغیوں کی باتیں کرنا انہیں بے حد مرغوب ہے۔ انہیں مرغیوں سے بڑا لگاؤ ہے اور انہوں نے کئی ایک مرغیاں پال رکھی ہیں اور وہ ہر رات ایک مرغی ساتھ لے کر سوتے ہیں۔ تاج ان کی صرف اس لیے عزت کرتا ہے کہ شطرنج بہت اچھی کھیلتے ہیں۔ جب شاہ جی نہیں ہوتے تو تاج منطق کی رو سے تصوف کو بے بنیاد ثابت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ایک مرتبہ کوئی صاحب اپنے بیٹے کو شاگرد بٹھلانے لائے۔ استاد وہاں موجود نہ تھا۔ لڑکا شرمیلا اور کم عمر تھا۔ تاج نے اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں دیکھیں۔ لمبی سی 'ہوں' کہی۔ اٹھ کر الماری کے نچلے خانے میں سے موٹی سی کتاب نکالی۔ پھونک مار کر اس کی گرد جھاڑی اور بولا:

"برخوردار اس کتاب میں ان پینٹروں کی زندگی کے حالات لکھے ہیں جنہوں نے بھوک سے تنگ آ کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ شاگرد ہونے سے پہلے اسے ضرور پڑھ لو۔

اس کے بعد تاج نے مصوروں کی زندگی کا نقشہ کچھ ایسے خوفناک انداز میں کھینچا کہ وہ لڑکا اور اس کا باپ دونوں سہم گئے۔ انہوں نے جوتے پہن کر مصافحہ کیا اور پھر کبھی ہماری بیٹھک کا رخ نہ کیا۔ تاج نے کتاب الماری میں رکھ دی اور ہماری طرف دیکھ کر بولا:

"اپنے استاد کو نہ بتانا۔"

شاہ جی سارا سارا دن ہمارے استاد کے پاس ہی بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ کھانا بھی وہیں پر کھاتے ہیں اور دوپہر کو سوتے بھی وہیں ہیں۔ جب وہ سو کر اٹھتے ہیں تو ان کی لال لال آنکھیں سوجی ہوتی ہیں۔ وہ چرس بہت پیتے ہیں۔ لالی ہر روز ان کے لیے چرس لینے تکیہ پیر کھڑکی شاہ جایا کرتا ہے۔ وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے چرس لا رہا ہے اور اب خود بھی پینے لگا ہے۔ میرے منع کرنے پر وہ ایک آدھ دن کا ناغہ ڈال دیتا ہے اور پھر شروع کر دیتا ہے۔

ہمارا استاد کبھی کبھی شاہ جی کو اپنے اس شاگرد کے گھر بھی بھیج دیتا ہے جس کی ماں سے وہ عشق لڑا رہا ہے۔ شاہ جی وہاں بیٹھ کر اپنے مرید کی خوبیوں اور ہزاروں روپے کی آمدنی کے گیت گاتے ہیں۔ استاد ایک سال سے اس عورت کو قابو میں لانے کے جتن کر رہا ہے اور شاہ جی کا اندازہ ہے کہ اب صرف دم باقی رہ گئی ہے۔ کسی وقت یلین اپریٹر اسے ایسی باتوں سے باز آ جانے کی تلقین کرتا ہے۔

"سالے ایک نہ ایک دن پچھتائے گا۔ دوسروں کے مال پر ہاتھ مارتے ہو کہیں اپنے مال کی بھی ربڑی نہ ہو جائے" اس پر استاد

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے موٹی سی گالی دے کر چپ کرا دیتا ہے۔

جما مشین مین بڑا ایکٹر مزاج ہے۔

پہلے وہ چندر موہن کا عاشق تھا اور مشین روم میں کھڑے ہو کر وہ گھنٹوں فلم پکار کے مکالمے بولا کرتا تھا۔ آج کل وہ دلیپ کمار پر فدا ہے۔ وہ ہر بات میں اس کی نقل اتارتا ہے۔ بالوں کی ایک لٹ ہر وقت اس کے ماتھے پر جھولتی رہتی ہے جسے وہ بار بار پیچھے جھٹکتا رہتا ہے۔ اس کے بال لہریالے ہیں۔ تیل بھرا چیتھڑا ہر وقت اس کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ وہ صوبہ سرحد کا رہنے والا ہے۔ اس کی عمر تیس پچیس کے قریب ہے۔ بچپن ہی میں وہ گھر سے بھاگ کر لاہور آ گیا تھا۔ پندرہ برس کی عمر تک وہ سینما کے بورڈ اٹھاتا رہا۔ بعد میں وہ سینمائی جلوس کے آگے گھنٹی بجانے پر لگا دیا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن اسے کسی فلم میں ہیرو یا اس کے دوست کا پارٹ ضرور مل جائے گا۔ لیکن یہاں آ کر اس کے خوابوں کی رنگین فلم ایسی ٹوٹی کہ پھر نہ جڑ سکی۔ کچھ مدت بعد وہ مشین روم میں آ گیا۔ اور آج بھی وہیں ہے۔ وہ دلیپ کمار کے انداز میں ذرا آنکھیں سکیڑ کر باتیں کرتا ہے اور ہمارے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر کر لیتا ہے۔ کسی وقت جب ہم بڑے انہماک سے کام کر رہے ہوتے ہیں تو وہ دروازے میں کھڑے ہو کر ہمیں دیکھ کر آنکھوں کو بھینگا کرتا ہے اور ہمیں ہنسا کر خود بھی ہنسنے لگتا ہے۔

ہمارے استاد کا باپ شہر میں گھوڑوں کے دلال خانے میں منشی گیر ہے وہ بیٹھک میں عام طور پر کھڑکی کے پاس بیٹھتا ہے اور سڑک پر سے گزرتے ہوئے ہر گھوڑے کی نسلی تاریخ بیان کرنے لگتا ہے۔ وہ بڑا اپیٹو ہے اور اپنے بیٹے کے شاگردوں کے پاس آ کر ہمیشہ پوچھا کرتا ہے:

''آج کیا کھا کر آئے ہو؟''

''رات تمہارے ہاں کیا پکا تھا؟''

کسی وقت وہ اپنے وطن کا ذکر بڑے درد بھرے لہجے میں کرتا ہے۔''

جالندھر میں بھلے بیچنے والے پکوڑیوں پر دہی زیادہ ڈالا کرتا تھے'

ایک روز گائے کے منہ ایسا نقلی ڈاکٹر اس کی موجودگی میں آ گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بڑا گرم سرد آیا اور آتے ہی بورڈوں کا تقاضا شروع کر دیا۔ استاد نے دو تین باتوں میں اس کی ساری گرمجوشی ختم کر دی اور اس سے عورتوں سے لذت حاصل کرنے کے نسخے پوچھنے لگا۔ جب ڈاکٹر چلا گیا تو آپ نے بڑے بزرگانہ انداز میں فرمایا:

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''خوش رہئے بیٹا! اختلاط کم کردو۔''

استاد دھوتی سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا:

''ابا تم مست رہو۔''

میں اور لالی دیر تک ''اختلاط'' کے معنوں پر سر دھنتے رہے۔ شام کو ہم نے ہر فن مولا تاج سے اس کے معنی پوچھے وہ اپنی گھوڑے ایسی ناک چڑھا کر بولا:

''یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اس کے معنی مت پوچھو۔''

چنانچہ یہ لفظ خطرے کا لال نشان بن کر ہمارے ذہن میں بھڑکنے لگا۔

صبح صبح جب ہم سینما آتے ہیں تو ہماری بیٹھک بند ہوتی ہے۔ چوکیدار سے چابی لے کر ہم اسے کھولتے ہیں۔ لالی ڈول میں پانی بھر کر لاتا ہے اور فرش پر چھڑکاؤ کرتا ہے۔ جب پانی ذرا سوکھ جاتا ہے تو میں زمین پر جھاڑو دیتا ہوں تخت پر بچھا ہوا بوریا جھاڑتا ہوں۔ برشوں کو پانی میں بھگو کر اسے صاف کرتا ہوں۔ لالی شاہ جی کا حقہ تازہ کرتا ہے اور ساتھ ساتھ انہیں گالیاں بھی دیئے جاتا ہے۔ جب ہم سب کام ٹھیک ٹھاک کر کے بیڑیاں سلگا کر بیٹھتے ہیں تو ہمارا استاد آ جاتا ہے۔ ہم بیڑیاں فوراً بجھا دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد دوسرے کاریگر بھی آ جاتے ہیں اور یوں فحش باتوں اور گندی گالیوں سے بھرے ہوئے بے حیا دن کا آغاز ہوتا ہے۔

ہم دونوں کو ساٹھ ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے جو بڑی جلدی خرچ ہو جاتی ہے۔ لالی تنخواہ میں سے تیس روپے ماہوار اپنی ماں کو گاؤں منی آرڈر کر دیتا ہے۔ اور باقی پیسوں میں بڑی تنگی ترشی سے گزارا کرتا ہے۔ اسے ہر مہینے بشیر گیٹ کیپر سے ادھار مانگنا پڑتا ہے۔ بشیر بڑا اچھا آدمی ہے۔ اس نے لالی کو قرض دینے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ لالی بھی تنخواہ ملتے ہی اس کا حساب صاف کر دیتا ہے۔ بشیر سینما کا بڑا پرانا گیٹ کیپر ہے۔ وہ دن کو ریلوے مال گودام میں کام کرتا ہے اور رات کو سینما کی نوکری کرتا ہے۔ وہ دوسرے درجے کے گیٹ پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس نے بکنگ کلرک سے ساز باز کر رکھی ہے۔ انہوں نے چند ایک اپنی خاص اصطلاحیں ایجاد کر رکھی ہیں۔ جس روز رش ہوتا ہے وہ ایک ہی ٹکٹ کو کئی بار فروخت کرتے ہیں۔ اگر اس دوران میں چیکر آ جائے تو بشیر وہیں بکنگ کلرک کو خبردار کرتے ہوئے پکار اٹھتا ہے۔

''اش ٹی فین۔۔۔۔۔۔''

اور سارا معاملہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ بشیر کو عورتیں پھانسنے میں کافی مہارت حاصل ہے۔ وہ بے دھڑک ہو کر عورت کو چھیڑ دیتا ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

اور بعد میں معافی مانگ لیتا ہے۔ ٹکٹ کاٹ کر دوبارہ تھماتے ہوئے وہ عورت کے سینے پر ہاتھ ضرور لگائے گا۔ ایک روز کوئی بھدی سی درمیانی عمر کی نوکرانی روتے ہوئے بچے کو چپ کرانے ہال سے باہر لائی تو بشیر نے اسے اپنے پاس کرسی پر بٹھالیا۔ بچہ چپ نہ ہوتا تھا۔ بشیر اس عورت کو ساتھ لے کر اوپر کے خالی بکس میں لے گیا۔ جب وہ بکس سے باہر نکلے تو بچہ چپ تھا مگر خادمہ رو رہی تھی اور بشیر اسے چپ کرا رہا تھا۔

لالی کا خیال ہے کہ بشیر کے پاس کوئی گیدڑ سنگھی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ خود گیدڑ سنگھی ہے۔

جس سڑک کے پچھواڑے ہماری کوٹھڑی ہے وہ بڑی بارونق سڑک ہے۔ اس سڑک پر کئی ایک سینما گھر ہیں۔ جب شو ٹوٹتے ہیں تو یہاں تانگوں موٹروں اور سائیکلوں کی اس قدر بھیڑ لگ جاتی ہے کہ گزرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ سڑک شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ یہاں پہنچ کر اندھیری گلیوں' بوسیدہ مکانوں اور جھکی ہوئی نگاہوں والی اداس دلہنوں کا شہر ختم ہو جاتا ہے اور چمکیلی فراخ سڑکوں' بلند عمارتوں' بیش قیمت ہوٹلوں' اڑتے فراکوں اور اچھلتی کودتی ننگی ٹانگوں کا شہر شروع ہوتا ہے۔ یہاں چھپ چھپ کر بہنے والے آنسوؤں کے گیت ختم ہوتے ہیں اور کھوکھلے قہقہوں کا شور شروع ہوتا ہے۔ یہاں پر خشکی ختم ہو جاتی ہے اور پانی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ہر آدمی کپڑے اتار دیتا ہے۔ یہ سڑک دو ملکوں' دو تہذیبوں اور دو کلچروں کو ملاتی ہے۔ یہاں الف لیلہ ختم ہوتی اور ہسٹری آف اکنامکس شروع ہوتی ہے۔ یہ سڑک منزل بھی ہے اور دروازہ بھی' منبع بھی اور دہانہ بھی۔

یہ وہ پل ہے جو دو کناروں کو ملاتا ہے اور وہ گھاٹ ہے جہاں ہر جانور آ کر اپنی پیاس بجھاتا ہے۔

ہمارا ڈیرہ ایک گندی اور اندھیری گلی میں ہے۔

یہ گلی آگے جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں مکانوں کے نچلے حصے بند رہتے ہیں۔ کہیں گودام ہیں تو کہیں ٹوٹی پھوٹی موٹروں کے فالتو پرزے بند پڑے ہیں۔ ہماری کوٹھڑی میں کوئی روشندان نہیں۔ دروازہ پرانی طرز کا ہے اور پوری طرح بند نہیں ہوتا۔ سردیوں میں برفیلی ہوا کے نوکیلے جھونکے ہمیں تنگ کرتے ہیں اور گرمیوں میں مچھر سارا دن چیں پیں کرتے رہتے ہیں۔ اگر لالی چرس بھرا سگریٹ سلگا لے تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ چرس کا مشک کافور کی بو ایسا دھواں اندر بھر جاتا ہے اور مجھے خواہ مخواہ یقین سا ہو جاتا ہے کہ لالی بہت جلد مر جائے گا۔ ویسے اس کا ڈھانچہ بہت کمزور ہے۔ اس کی عمر بیس کے قریب ہے لیکن اس کی صحت ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ پتلا سا جسم' لمبا ہونے کی وجہ سے ذرا آگے کو جھکا جھکا' پیازی پیازی ملول آنکھیں' میل میں جمے ہوئے بال' پھٹی ہوئی پتلون' گھسی ہوئی ایڑیوں والے بوٹ۔ ایک میں تسمہ تو دوسرے میں سن کی رسی۔ یہ ہے لالی میری طرح اس نے بھی پانچویں جماعت کے بعد اسکول

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جانا ترک کر دیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو بڑے موٹے موٹے سلیس لفظوں میں خط لکھا کرتا ہے اور نیچے تمہارا تابعدار لال دین' کافی خوشخط کر کے لکھتا ہے۔ ہم چونکہ ہوٹل کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے اس لیے کھانا خود ہی پکاتے ہیں۔ کوٹھڑی میں ایک طرف اینٹیں جوڑ کر ہم نے چولھا بنا رکھا ہے۔ پرانے بورڈوں کی بہت سی کھپچیاں ہمیں مل گئی ہے اور جب کچھ نہ ہو تو ہم ٹوٹی پھوٹی کرسیوں میں سے کسی نہ کسی کی ٹانگ اکھیڑ کر جلا لیتے ہیں۔ لالی سالن بڑا اچھا پکا لیتا ہے اور مجھے روٹیاں پکانے میں کافی مہارت حاصل ہے۔ ہم دن میں صرف ایک بار روٹی پکاتے ہیں اور سالن تو کئی کئی دن چلتا ہے پچھلے دنوں ہم نے شلغم بنائے۔ وہ اتنے سارے بن گئے کہ ہفتہ بھر تک ختم نہ ہوئے۔ چائے ہم کیتلی میں بناتے ہیں۔ یہ کیتلی دھوئیں سے کالی ہو گئی ہے اور اس کا منہ سر دکھائی نہیں دیتا۔ کسی وقت ہم سلائیٹ ہوٹل میں بھی چائے پینے چلے جاتے ہیں۔ اصلی شکر کی چینی ہمیں بناسپتی سٹور والے پنساری سے ادھار مل جاتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ہم اسے سینما کا پاس لا دیتے ہیں یہ پنساری ہمارا بڑا لحاظ کرتا ہے۔ اسے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ ہم چکر مارکہ بیڑی نہیں پیتے اور جمع خرچ کا باقاعدہ حساب نہیں رکھتے۔ جب کبھی وہ کالی ٹوپی سر پر منڈھے چکر بیڑی سلگائے ہماری کوٹھڑی میں آتا ہے ہمیں نصیحتیں کرنے لگتا ہے:

''پردیس میں آئے ہو۔ فائدہ کیا ہوا جو سو پچاس جمع نہ ہوئے آج ہی نوٹ بک منگوا کر ہر شے کا باقاعدہ اکاؤنٹ کھول دو۔''

پھر وہ اپنے کاروبار کا رونا لے بیٹھتا ہے:

''بارہ پیٹیاں منگوائی تھیں' ویسے ہی پڑی ہیں' اب تو۔۔۔۔۔۔۔ بناسپتی گھی میں بھی ملاوٹ شروع ہو گئی ہے۔ جنگ لگے تو کاروبار بھی کھلے' گلے میں تو کالا پیسہ تک نہ رہا۔۔۔۔۔۔''

وہ ''کالا پیسہ'' بہت استعمال کرتا ہے اور لالی نے اس کا نام ہی کالا پیسہ رکھ دیا ہے۔ ویسے ہم دونوں بیڑیاں پیتے ہیں مگر جب لالی کو چرس پینی ہوتی ہے تو وہ پاسنگ شو کا سگریٹ بنا کر استعمال کرتا ہے' کالے پیسے' کی نگاہ کہیں نہ کہیں سگریٹ کا بجھا ہوا ٹکڑا ڈھونڈ نکالتی ہے۔

''سگریٹ مت پیا کرو بھائیو! چکر بیڑی پیو چکر بیڑی۔ دماغ میں نئے نئے ایڈیئے آئیں گے۔''

اس کے باہر نکلتے ہی لالی اس کی نقل اتارنے لگتا ہے۔ وہ اسی طرح بیڑی کا کش لگاتے ہوئے ایک آنکھ بند کر لیتا ہے اور اس کا گل چٹکی بجا کر جھاڑتے ہوئے کہتا ہے:

''ہاں بھائیو ہمیشہ چکر بیڑی پیو تا کہ تم بھی چکر میں پڑ جاؤ اور کالا پیسہ تک غائب ہو جائے۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لالی کو نقل اتارنے میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ استاد کے ناک پھلا کر بات کرنے سے لے کر محلے کے چمار کے لنگڑا کر چلنے تک وہ سب کی نقل بڑی خوبی سے اتارتا ہے۔ جب وہ مشین مین کا بہروپ بھر کر دلیپ کمار کی طرح بال ماتھے پر لا کر جھٹکتا ہے اور آنکھیں بھینگی کر لیتا ہے تو میرا ہنسی کے مارے برا حال ہو جاتا ہے۔ ساتھ والی کوٹھڑی میں ایک نیم پاگل رنگریز رہتا ہے جو چوک والی لانڈری میں ملازم ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کا ہے اور اس کے اکثر بال سفید ہیں۔ دن کے وقت وہ بھلا چنگا ہوتا ہے۔ دوکان پر بڑے انہماک سے کام کرتا ہے۔ لیکن رات کو جیسے اس کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ پہلے وہ دیر تک قرآن شریف کی آیات پڑھتا رہتا ہے۔ پھر سسکیاں بھر کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے بعد بڑی دردانگیز لے میں گانے لگتا ہے۔ وہ ہمیشہ پنجابی کا یہی شعر گاتا ہے:

تساں نوں مان وطناں دا

اسیں ہاں یار پردیسی

(تم کو اپنے وطن پر ناز ہے اور ہم پردیسی ہیں)

پھر کسی شیریں نامی عورت سے باتیں شروع کر دیتا ہے۔

''شیریں! پیاری شیریں! سو گئیں؟ اچھا سو جاؤ۔ لحاف اوپر کر دوں؟ آج تو بڑی سردی ہے۔''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پھر اس کی آواز سنائی دیتی ہے:

''دو بج گئے کیا؟ نہیں! پانچ بج گئے ہوں گے۔''

ساری رات ساتھ والی کوٹھڑی میں یہ ناٹک شروع رہتا ہے۔ صبح جب ہم اسے بڑی سنجیدگی اور متانت سے کوٹھڑی سے باہر نکلتے اور دروازے پر تالہ ڈالتے دیکھتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ یہ وہی آدمی ہے جو رات بھر پاگلوں کی طرح درودیوار سے باتیں کرتا رہا تھا۔ ایک دن اس کے مالک نے ہمیں بتایا کہ وہ فیروز پور کا رہنے والا ہے۔ وہاں اس کی بیوی نے ساس کے روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی۔ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر شہر میں لانڈری کا کام کرتا تھا۔ بیوی کی موت کے بعد اس کے دونوں بیٹے بھی یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بھائیوں کے ساتھ اس کا جھگڑا ہو گیا۔ اس نے بڑی محنت سے روپیہ اکٹھا کر کے اپنی الگ دوکان کھول لی۔ ابھی دوکان پر کام شروع نہ ہوا تھا۔ کہ فسادات شروع ہو گئے۔ جب مجبوراً شہر چھوڑنا پڑا تو اس نے ایک رات چپکے سے مٹی کا تیل چھڑک کر اپنی دوکان میں آگ لگا دی اور پاکستان آ گیا۔ ایک دفعہ کسی بات پر اس کے مالک نے اسے طیش میں آ کر ماں کو گالی دی۔ اس رات وہ نیم پاگل مہاجر رات بھر اپنی کوٹھڑی میں روتا رہا اور بلند آواز میں اپنی ماں کو آوازیں دیتا رہا ماں کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بلا تار ہا جو فیروز پور کے قبرستان میں دفن تھی۔

پچھلے دنوں ریڈیو کے ذریعہ کسی زنانہ دستکاری سکول کی جانب سے بچوں کی گڑیوں میں رنگ بھرنے کے لیے نوجوان پینٹروں کو دعوت دی گئی۔ لالی کو چوک والے پنساری کالے پیپے نے بتایا۔ چنانچہ ایک دن میں اور لالی اس زنانہ سکول پہنچ گئے۔ چپڑاسی نے ہمیں پرنسپل صاحبہ کے کمرہ میں پہنچا دیا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت لمبا کوٹ پہنے کرسی پر بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ ہمیں کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر اس نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور بولی:

''تشریف رکھیے۔''

لالی اس روز اپنی نیلی پتلون پہنے تھا جو اس نے لنڈا بازار سے خرید کر خاص خاص موقعوں کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ آج اس کے بالوں میں تیل بھی لگا تھا۔ جب پرنسپل صاحبہ کو پتہ چلا کہ ہم پینٹر ہیں اور ریڈیو والے اعلان کے سلسلے میں آئے ہیں تو انہوں نے ہمیں پہلے تو ملک کی صنعتی ترقیات کی سکیموں پر ایک لمبا چوڑا لیکچر دیا اور بعد میں فرمایا:

''گڑیوں میں رنگ بھرنے کا کام تو ہماری استانیاں بھی کر سکتی ہیں۔ لیکن ہم ملک کے نوجوانوں کی ہمت افزائی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اپنا کام شروع کر دیں۔ آپ کے نمونے ولایت جائیں گے۔ اگر پاس ہو گئے تو انعام میں سرٹیفکیٹ ملیں گے۔ آپ لوگ پیسے کا خیال نہ کریں۔ یہ تو قوم کی خدمت ہے۔۔۔۔۔۔''

لالی نے اسکول سے باہر سڑک پر آ کر اپنے کوٹ کے تینوں بٹن کھول دیئے اور دونوں ہاتھوں پتلون کی جیب میں گھسیڑ کر بولا:

''قوم نے ہمارے گھر میں کون سے دانے ڈال دیئے ہیں؟''

کبھی کبھی ہم سلائٹ ہوٹل میں بھی چائے پینے چلے جاتے ہیں۔

یہ ہوٹل ہمارے قریب ہی بڑے بازار میں واقع ہے۔

اس کے اندر بڑے بڑے قد آدم آئینے لگے ہیں اور فرش پتھر کی رنگ برنگ ٹائیلوں کا ہے۔ شام کو یہاں بہت رونق ہوتی ہے اور اس کے دروازے پر سرخ اور نیلی بتیاں روشن ہو جاتی ہیں۔ کچھ دنوں سے اس ہوٹل کے کاؤنٹر پر گول گول آنکھوں اور لال لال ہونٹوں والی ایک ایک گڑیا نما لڑکی بیٹھنے لگی ہے۔ لالی کو یہ لڑکی بڑی پسند ہے اور وہ اب عموماً شام کو چائے اسی ہوٹل میں پیتا ہے۔ ہوٹل آنے سے پہلے وہ پاسنگ شو کے سگریٹ میں چرس بھر کر بڑے اہتمام سے پیتا ہے اور پھر لال لال آنکھیں سکیڑے ہوٹل میں جا کر بیٹھ جاتا ہے اور اس لڑکی کو ٹکٹکی باندھ کر گھورنا شروع کر دیتا ہے۔ چائے کا پہلا گھونٹ چڑھا کر وہ دوسرا سگریٹ سلگا لیتا ہے اور زیر لب

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہولے ہولے گنگنانے لگتا ہے:

''مکھ موڑ موڑ مسکات جات۔۔۔۔۔۔''

ایک رات جب ہم سلائٹ ہوٹل سے واپس اپنی کوٹھڑی میں آئے تو لالی چار پائی پر دیوار سے ٹیک لگا کر لیٹ گیا۔ اس روز میری باری زمین پر سونے کی تھی اور لالی نے چرس کے پورے دو سگریٹ پی رکھے تھے۔ اس کے خشک ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں اور وہ ان پر بار بار زباں پھیر رہا تھا۔ مجھے اپنی گہری گہری سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اس نے بیڑی کا دھواں اگلتے ہوئے کہا:

''تم دیکھ لینا ایک نہ ایک دن یہ لڑکی ضرور میرے پاس آئے گی۔ میں آج نوٹ کر رہا تھا کہ وہ مجھے چوری چوری تک رہی تھی۔ چوری چوری تکنا بھی کیا ہوا؟ وہ تو چوروں کا کام ہے اور وہ ملکہ ہے ملکہ وکٹوریہ ہے۔ میں کہتا ہوں ضرور اسے بھی مجھ سے عشق ہو گیا ہے۔ میرا باپ کہا کرتا تھا: ''بیٹا عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا اور دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔''

میرا باپ بھی ہمیں چھوڑ گیا ہے۔ پتہ نہیں وہ دلی میں ہے یا بمبئی میں۔۔۔۔۔۔ تم نے دیکھا آج اس کا گریبان کتنا کھلا تھا اور اس کی چھاتیاں۔۔۔۔۔۔ پانی کہاں ہے؟ یار آج تو حلق سوکھ رہا ہے۔۔۔۔۔۔''

لالی حسب معمول چرس پی کر بے ربط سی باتیں کر رہا تھا اور میں اپنے بستر میں چپکا لیٹا سن رہا تھا۔ پھر اس نے بھی جوتے اتارے اور کوٹ سمیٹ لحاف میں گھس گیا۔ کتنی ہی دیر لحاف میں وہ گھٹی گھٹی خشک آوازوں میں گنگناتا رہا۔

''مکھ موڑ موڑ مسکات جات۔۔۔۔۔۔''

پھر وہ سو گیا اور مجھے بھی نیند آ گئی۔

رات نہ جانے کتنی بیت چکی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے کچھ یوں سنائی دیا جیسے لالی اپنی چار پائی پر کسی سے کشتی لڑ رہا ہے۔ میں نے جلدی سے ماچس جلائی۔ لالی کا لحاف درمیان سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے آواز دی:

''لالی؟۔۔۔۔۔۔ لالی جاگتے ہو؟''

لحاف ایک دم بیٹھ گیا اور لالی کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی:

''نہیں۔۔۔۔۔۔''

صبح میں نے لالی کو رات کا واقعہ سنایا تو وہ ہنسنے لگا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''رات کلو پہلوان سے کشتی ہوگئی۔ بس چاروں شانے چت گرادیا۔''

لیکن لالی کی حالت ہارے ہوئے پہلوان ایسی تھی۔ اس دن وہ سارا وقت کھویا کھویا سا رہا اور مجھ سے زیادہ نہ بولا۔ اس نے چرس بھی دن میں تین بار پی۔ اب لالی جس روز چارپائی پر سوتا کسی نہ کسی پہلوان سے کشتی ضرور لڑتا۔ نہ معلوم کیا دنگل تھا جس نے لالی کو پہلے سے کمزور کرنا شروع کر دیا۔ اس کا رنگ زیادہ زرد ہوگیا اور آنکھیں اندر کو سکڑنا شروع ہوگئیں۔ وہ چرس بھی پہلے سے زیادہ پینے لگا۔ جب میں نے اسے منع کیا تو وہ بڑی اداس ہنسی ہنس کر بولا:

''یہی تو ایک شے ہے جو میری ہے''

میں نے کہا:

''لالی یہ بڑی بری شے ہے۔ تمہاری صحت تباہ کر دے گی۔''

لالی چارپائی پر بیٹھا بیڑی کو آگ دکھا رہا تھا۔ اتنا سن کر اس کی بھنویں اکٹھی ہوگئیں اور وہ مدھم لہجے میں بولا:

''میرا باپ بھی یہی شے پیتا تھا اور استاد کا مرشد بھی پیتا ہے۔ کسی کی صحت تباہ نہیں ہوئی۔''

مگر لالی استاد کا مرشد دن میں پانچ بار گوشت کھاتا ہے۔'' لالی ذرا جھنجھلا کر بولا:

''میں بھی کھاتا پیتا ہوں۔ میں بھی کسی سے کم نہیں ہوں۔''

اس نے بیڑی کا کش لگایا' گل جھاڑا' کوٹ کے کالر اوپر کئے اور کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔

اس وقت ابھی شام ہوئی ہی تھی اور ہم کام سے واپس آ کر ذرا دم لینے بیٹھے تھے۔ لالی چلا گیا تو میں دیئے کی روشنی میں اپنے پھٹے پاجامے کی مرمت کرتے ہوئے لالی کے متعلق سوچنے لگا۔ وہ میرا ساتھی تھا اور مجھے اس سے دلی ہمدردی تھی۔ اتنے بڑے شہر میں میرا صرف ایک وہی یار تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لالی یوں اپنی زندگی برباد کرتا پھرے۔ مجھے صرف اس کا ہی نہیں بلکہ سفید بالوں والی اس ماں کا بھی خیال تھا جو شہر سے دور گاؤں میں اپنے بیٹے کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ پاجامہ مرمت کر کے میں نے پہنا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے باہر سڑک پر آ گیا۔ سلائٹ ہوٹل کے آگے سے گزرتے ہوئے میں نے لالی کو کاؤنٹر کے بالمقابل میز پر کہنیاں رکھے بیٹھے دیکھا۔ چائے کا پیالہ اس کے سامنے تھا اور وہ ٹکٹکی لگائے لال لال ہونٹوں والی لڑکی کو تک رہا تھا۔

میں نے اس وقت اسے بلانا مناسب نہ سمجھا اور آگے نکل گیا۔ جب واپس آیا تو دیکھا لالی ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔ میں کوٹھڑی میں آ گیا' تھوڑا بہت کھا پی کر میں نے بیڑی سلگائی اور لحاف میں لیٹ کر لالی کے تیزی سے بڑھتے ہوئے عشق کے متعلق سوچنے لگا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سردی زیادہ تھی۔ باہر گلی بہت جلدی سنسان ہو گئی تھی۔ کسی مکان کا پرنالہ بہہ رہا تھا اور پانی نالی میں گر رہا تھا۔ اس کی آواز کانوں کو بڑی ناگوار محسوس ہو رہی تھی۔ رات گئے گلی میں لالی کے بے ربط قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے لحاف اوپر کر لیا۔ لالی نے اندر آ کر دروازہ بند کیا۔ دیا جلایا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر جانے کیا تلاش کرتا رہا۔ اس روز اسے زمین پر سونا تھا۔ بستر میں گھس کر اس نے بیڑی سلگائی۔ چند لمحوں کے بعد لالی کی پھونک سے دیا بجھ گیا اور کوٹھڑی میں خاموشی طاری ہو گئی۔

شاید چار ساڑھے چار بجے رات کا عمل ہو گا کہ ساتھ والی کوٹھڑی میں نیم پاگل رنگ ریز کے بلند آواز میں رونے اور گانے کی آواز نے مجھے بیدار کر دیا۔ وہ بڑی رقت بھری آواز میں اونچی لے میں گا رہا تھا۔ اس کی آواز میں ہچکیوں کے تار ٹوٹ رہے تھے اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی عزیز کی موت پر بین کر رہا ہے۔ لالی بھی اٹھ بیٹھا۔ اس نے لیمپ جلا کر مجھے آواز دی۔ میں بستر پر بیٹھ گیا۔ لالی سہم کر میری چارپائی پر آ گیا۔ ہم خلاف معمول ڈر گئے تھے اور ہمیں اس نیم پاگل کی سوگوار آوازیں قبرستانوں کی یاد دلا رہی تھیں۔ لالی نے آہستہ سے کہا:

''آج اس کی حالت زیادہ خراب ہے''

میں کچھ نہ بولا اور ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگا۔ آج واقعی وہ پہلے سے زیادہ دردناک اور کسی حد تک ڈراؤنی آواز میں گا رہا تھا۔ وہ رک رک کر اوپر اٹھتی اور ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرتی آواز میں بار بار یہ شعر دہرا رہا تھا

اری بلبل اری بلبل تو کیوں اس شاخ آ بیٹھی
نہ باغ اپنا نہ شاخ اپنی تو کیوں دعویٰ جما بیٹھی

اس معمولی سے شعر میں درد کی ایک الم ناک چیخ تھی جو زخمی پرندے کی طرح در و دیوار سے سر ٹکرا رہی تھی۔ پچھلے پہر کی سنسان خاموشی میں یہ آواز کسی شکستہ قبر کے کھنڈر سے نکلتی سنائی دے رہی تھی۔ ہمارے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ میں نے لالی کو مشورہ دیا کہ ساتھ والی کوٹھڑی میں جا کر اس بدنصیب رنگریز کو دلاسا دیا جائے جس پر لالی نے جلدی سے کہا:

''وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں پاگل کا کیا اعتبار؟''

کچھ دیر گزرنے پر وہ خود بخود چپ ہو گیا' اور فضائیں یوں خاموش ہو گئیں جیسے یہاں کبھی کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی اور یہاں کبھی کوئی آواز پیدا نہیں ہو گی۔ لالی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ میرے لحاف میں اکڑوں بیٹھا' ٹھوڑی گھٹنے پر رکھے کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر آپ ہی آپ آہستہ سے بولا:

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''خدا میرے گناہ معاف کردے' وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔بھلا یہاں ہمارا کون ہے جو ہم یہاں آ گئے ہیں۔ہم کس لیے صبح سے شام تک کام کرتے ہیں؟ ان پیسوں کے لیے جو ہمیں اچھا کھانا اور اچھے کپڑے نہیں دے سکتے' وہ کیا شعر گا رہا تھا۔۔۔۔۔؟

اری بلبل اری بلبل تو کیوں اس شاخ آ بیٹھی

لالی کی آواز بھاری ہو گئی اور اس نے سر جھکا لیا۔ میں نے کندھے سے پکڑ کر لالی کا چہرہ اوپر کیا تو حیران رہ گیا۔ لالی رو رہا تھا۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھوں میں انار کے دانوں ایسے میلے میلے آنسو تھے۔ میں پہلی بار لالی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا تھا۔ میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

''پاگل ہو گئے ہو؟ بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے؟''

لالی میرے سینے سے لگ کر بچوں کی طرح رونے لگا اور اس نے مجھے آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان بتایا کہ اس کی ماں بیمار ہے اور اس کے پاس دوائی کے لیے پیسے نہیں ہیں۔

''میں نے کل استاد سے کچھ پیسے مانگے تھے۔ اس نے کہا ہفتہ بعد ملیں گے۔ خدا جانے ایک ہفتہ بعد کیا ہو۔ خدا کرے میری ماں ایک ہفتہ اور زندہ رہ سکے۔ پھر میں پیسے لے کر خود اس کے پاس چلا جاؤں گا اور اس کے لیے شہر سے ڈاکٹر بلاؤں گا۔ اس نے میرے لیے بڑی تکلیفیں سہی ہیں۔ مجھے اس سے بڑی محبت ہے۔ میں نے آج تک اس کی کوئی خدمت نہیں کی۔ لدھیانے میں ہمارے پاس ایک بھینس تھی جس کا دودھ روز صبح اٹھ کر بلویا کرتی تھی اور میری روٹی میں کتنا سارا مکھن بھر دیا کرتی تھی۔ ان دنوں وہ بڑی خوشحال اور صحت مند تھی۔ اس کا چہرہ سرخ تھا اور بال سیاہ تھے۔ لیکن آج وہ درخت سے ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح مرجھا گئی ہے اور اس کے بال سفید ہو گئے ہیں اور وہ گجرات کے ایک گاؤں میں بیمار پڑی ہے۔ آج ہمارا کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔کوئی نہیں ہے۔ وہ پاگل ٹھیک کہتا تھا۔

''نہ باغ اپنا نہ شاخ اپنی۔۔۔۔۔۔''

لالی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں اسے تسلی دینا چاہتا تھا مگر الفاظ میرے ہونٹوں تک ہی آ کر رہ گئے اور میرا بھی دل بھر آیا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر دیر تک روتے رہے۔۔۔۔۔۔۔روتے رہے۔ باہر رات سنسان تھی اور گلی والا پرنالہ بہہ رہا تھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک ہفتہ بعد استاد نے لالی کو بیس روپے پیشگی دیئے۔ جنہیں لے کر وہ سیدھا اپنی ماں کے پاس گاؤں پہنچ گیا۔ چار دن بعد واپس آیا تو اس نے بتایا کہ ماں کی حالت بالکل ٹھیک ہے۔ صرف کمزوری باقی رہ گئی ہے۔ دو روز تک وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اور تیسرے دن وہ چرس بھرا سگریٹ سلگا کر سنلائیٹ ہوٹل میں جا بیٹھا۔ اس رات واپسی پر وہ بڑا خوش خوش کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ وہ گلی میں ہی گاتا چلا آ رہا تھا۔ اندر آ کر اس نے کوٹ اتار کر چارپائی پر پھینکا اور چولھے کے پاس بیٹھ کر مجھے پیازی پیازی نشے میں بھیگی ہوئی آنکھوں سے گھورنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ان جانی مسرت کپکپا رہی تھی۔ میں روٹیاں بنا رہا تھا۔ میں نے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے پوچھا:

''آج کیا بات لالی سیٹھ۔۔۔۔۔۔۔ بڑے چہک رہے ہو۔''

لالی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

آج میدان مار لیا بھیا۔۔۔۔۔۔''

''کیسا میدان؟''

لالی سگریٹ نکال کر اسے سلگانے لگا۔

''فکر نہ کرو اس میں چرس نہیں ہے۔''

''لیکن بات تو بتاؤ!''

لالی چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ دیے کی نرم روشنی میں اس کا چہرہ خوشی سے جھلملا رہا تھا۔

''آج میں نے اس سے بات کر ہی لی۔''

میں فوراً سمجھ گیا کہ سنلائٹ ہوٹل والی لڑکی کا قصہ ہے۔

''کیا بات کر لی؟''

لالی بڑی پرجوش آواز میں بولنے لگا:

''اتفاق سے میری پیالی میں مکھی پڑ گئی۔ میں نے موقع غنیمت جان کر پیالی ہاتھ میں پکڑی اور کاؤنٹر پر چلا گیا۔ وہ بیٹھی بل بنا رہی تھی۔ مجھے پاس کھڑے دیکھ کر اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور ذرا سا مسکرائی۔ سچ مانو میرے ہاتھ میں پیالی کانپنے لگی۔ میں نے جلدی سے سنبھل کر کہا۔۔۔۔۔۔ جناب آپ کے ہوٹل میں یہ کیسا انتظام ہے' ہم تو روز کے گاہک ہیں' اگر آپ کو ہمارا ابھی خیال

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں تو ہمیں کہہ دیجئے، ہم کوئی دوسرا ہوٹل تلاش کر لیں گے۔۔۔۔۔۔۔اس نے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔

''لیکن بات کیا ہوئی ہے جناب؟''

میں نے پیالی آگے کر دی۔ وہ بے چاری یوں شرمساری ہوگئی جیسے مکھی اس نے ڈالی ہو۔ اس نے کچھ اس انداز سے معذرت کی کہ میں شرمندہ ہوگیا اور مجھے یوں لگا گویا مکھی میں نے ڈالی ہو۔ میں نے کہا۔ ویسے کوئی خاص بات نہیں۔ ہم تو روز کے گاہک ہیں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہوٹل نہیں چھوڑ سکتے۔ لیکن آپ کو خیال ضرور رکھنا چاہیے۔

اس پر وہ ذرا شرما کر بولی۔

ہمیں آپ کا پورا پورا خیال ہے، یقین کیجئے آئندہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ اس نے بیروں کو بلا کر اچھی طرح ڈانٹا اور مجھے تازہ چائے منگوا کر دی۔ میں خوشی سے پھول گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے سینما کا ہیڈ پینٹر ہوں اور میرا نام خوشی محمد اختر کاتب پینٹر اینڈ آرٹسٹ ہے۔''

اس پر ہم دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''بس اب ہر بات ٹھیک ہوجائے گی۔ تم دیکھ لینا میں اب چرس بالکل نہیں پیوں گا اور پورا صوفی بن جاؤں گا۔ مجھے اس لڑکی سے بڑی محبت ہے مجھے یقین ہے۔ وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں کل بھی وہ بازار میں سے گزرتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کی زندگی کا بڑا خیال ہے۔ ایسے خراب ہوٹلوں میں رہ کر وہ خراب ہوجائے گی۔ وہ اصل میں کسی شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ تم اس کی شکل نہیں دیکھتے کتنی بھولی بھالی ہے! کیا معلوم بے چاری کن حالت میں گھر کر نوکری کر رہی ہے۔ اگر اسے بھی پیار ہوا تو میں فوراً شادی کر لوں گا۔ اگر پیار نہ بھی ہوا تو کیا ہے شادی کے بعد خود بخود پیار ہوجائے گا۔ پھر میں اسے لے کر ماں کے پاس چلا جاؤں گا۔ میری ماں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔ تمہیں نہیں معلوم اس کی شکل میری خالہ زاد بہن سے بہت ملتی جلتی ہے اور میری شادی کی بات پہلے وہیں پکی ہوئی تھی لیکن فسادات میں وہ لوگ سارے کے سارے مارے گئے۔ میری ماں اپنی بہو کو دیکھ کر پھولی نہ سمائے گی۔ میں کچھ دن وہاں گزار کر واپس لاہور آجاؤں گا اور یہاں اپنی دوکان کروں گا۔ تم بھی میرے ساتھ مل جانا۔ ہم دونوں جب کام کریں گے تو خدا کی قسم اس سے چوگنا کمائیں گے۔ ہمارا استاد تو ہمارا خون پی رہا ہے۔ اچھا اب تم یہ باتیں کسی سے نہ کرنا۔ جب تک شادی نہیں ہوتی ہر بات چھپی رہنی چاہیے۔ پھر جب ایک دم لوگوں کو پتہ چلے گا تو کتنا مزا آئے گا؟ ہے ناں؟''

اس رات لالی کتنی ہی دیر جاگتا رہا اور میرے ساتھ سٹلائیٹ ہوٹل کے کاؤنٹر پر کھڑی ہونے والی لڑکی اور اپنی ہونے والی بیوی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ دوسرے روز اس نے سر درد کا بہانہ بنا کر استاد سے آدھے دن کی چھٹی لی اور شہر میں گھوم پھر کر خالی دوکان کی تلاش شروع کر دی۔ میرا خیال تھا کہ یہ عشق اس کے دماغ کا بھوت ہے جو کچھ روز بعد اتر جائے گا۔ مگر جب میں نے اسے بڑی سنجیدگی سے دوکان کی تلاش میں سرگرداں دیکھا تو چپکا ہو رہا۔ شام کو وہ تھکا ہارا کوٹھڑی میں داخل ہوا تو میں نے پوچھا:

''کوئی دوکان ملی؟''

لالی نے پانی پیا اور چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔

''ملی تو نہیں لیکن مل ضرور جائے گی''

''لالی کیوں تیری مت ماری گئی ہے۔ بھلا ہوٹل میں بیٹھنے والیاں بھی کبھی اچھی لڑکیاں ہو سکتی ہیں۔''

لالی جیسے غصے میں آ گیا۔

''بکواس ہے۔ محض بکواس ہے۔۔۔۔۔۔ تم دیکھ لینا وہ کتنی اچھی بیوی ثابت ہو گی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی ہیں کہ وہ دل کی نیک ہے۔ ہمیں کیا خبر وہ رات کو گھر جا کر نماز پڑھتی ہو۔''

کچھ دن گزر گئے۔ اس دوران میں لالی بلا ناغہ سلائیٹ ہوٹل میں حاضری دینے جاتا۔ دوکان کی تلاش میں اس نے شہر کا ایک ایک کونہ چھان مارا تھا مگر خالی دوکان کا سراغ کہیں نہ ملا تھا۔ اس اثنا میں اس میں کئی ایک تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ اس نے چرس بالکل چھوڑ دی تھی۔ وہ جمعہ کی نماز پڑھنے لگا تھا۔ وہ چرس کے نام سے گھبراتا تھا' اور نفرت سے منہ سکیڑ لیتا تھا۔

''میں نہیں چاہتا کہ جب وہ میرے گھر آئے تو اسے چرس کے سگریٹوں کے ٹکڑے ملیں یا لوگ اس سے یہ کہیں کہ اس کا خاوند چرسی ہے۔۔۔۔۔۔ شادی کرنے والوں کو بڑا صوفی منش ہونا چاہیے۔''

لالی کی زبان سے یہ الفاظ مجھے بڑے عجیب سے لگتے تھے۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ بھی چرس چھوڑ سکتا ہے۔ وہ تو چرس کا اس قدر رسیا تھا کہ خود چرس بھرا اسگریٹ بن کر رہ گیا تھا۔ ویسا ہی پر شکن ''ادھ موا' بھینگا ٹیڑھا۔۔۔۔۔۔ سلائیٹ ہوٹل میں وہ بلا ناغہ شام کو جاتا۔ اب وہ اپنے کپڑوں کا بھی خاص خیال رکھنے لگا تھا۔ لنڈا بازار سے اس نے نیلے رنگ کی ایک نئی جیکٹ خرید لی تھی جسے وہ سفید پتلون کے ساتھ پہنتا تھا۔ شام کو وہ کپڑے پہن' بال پانی میں تر کر کے ان میں ٹوٹی ہوئی کنگھی سے چھلے بناتا' جوتے چمکاتا اور بڑی شان سے راج ہنس کی چال چلتا ہوٹل پہنچ جاتا۔ اگر کاؤنٹر کے سامنے والی میز رکی ہوتی وہ کاؤنٹر کے پاس کھڑا ہو کر اس لڑکی سے ادھر ادھر کی گپیں ہانکنے لگتا۔ وہ لڑکی بھی لالی سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتی۔ یہی اس کا پیشہ تھا اور اسی کے عوض وہ تنخواہ لیتی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لالی ساری باتیں رات کو مجھے سنا دیتا۔ کسی دن میں بھی اس کے ہمراہ چلا آتا۔ ویسے لالی عام طور پر اکیلا ہی جایا کرتا۔

تنخواہ ملی تو لالی نے تیس روپے ماں کو منی آرڈر کر دیئے۔ بیس روپے کھانے پینے کے کھاتے میں ڈال دیئے اور پانچ روپوں کے چھوٹے چھوٹے سنہری بندے خرید لیے۔ وہ یہ بندے اپنی محبوبہ کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ سارا دن اسی اودھیڑ بن میں رہا کہ بندوں کا تحفہ کس ڈھنگ سے پیش کرے۔ اسے اس بات کا بھی دھڑکا تھا کہیں وہ لڑکی بندے لینے سے انکار نہ کر دے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ بے دھڑک ہو کر بندے اسے پیش کر دے اور ساتھ ہی کہہ دے کہ یہ میری محبت کی نشانی ہے۔ یہ میں نے آپ کے لیے خریدے تھے۔''

لالی کو محبت کی نشانی والی بات پسند نہ آئی۔ دوسرے جملے پر اس نے اتفاق کر لیا اور بڑی بے صبری سے شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اس دن کام میں اس کا ذرا جی نہ لگا۔ استاد کئی بار دو فٹہ لے کر اس کی طرف لپکا۔

''اوئے سور دیا سورا۔۔۔۔۔۔۔۔ کیوں حرام پر کمر کس لی ہے؟''

چھٹی کے بعد لالی اور میں جلدی جلدی اپنی کوٹھڑی میں پہنچے۔ لالی نے منہ ہاتھ دھو کر نیلی جیکٹ اور سفید پتلون پہنی۔ بالوں میں پانی لگا کر چھلے بنائے۔ بندوں کی سنہری ڈبی جیب میں رکھی اور بن سنور کر میرے ساتھ سٹلائیٹ ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے خاص طور سے مجھے ساتھ لیا تھا۔ اسے یونہی وہم تھا کہ وہ اکیلا اس لڑکی کو بندوں کا تحفہ پیش نہ کر سکے گا۔ سڑک پر آ کر ہم نے ہوٹل کی سرخ اور نیلی بتی دیکھی۔ لالی خاموش تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور ہونٹ بار بار خشک ہو رہے تھے۔ جس وقت ہم ہوٹل میں پہنچے ہماری نگاہ سب سے پہلے کاؤنٹر پر گئی جہاں گنجی کھوپڑی والا پروپرائیٹر بیٹھا سامنے کئی ایک رجسٹر کھولے ان میں اندراج کر رہا تھا۔ لالی کا خیال تھا کہ وہ یہیں کہیں ہو گی ابھی آ جائے گی۔ میرا خیال تھا کہ وہ چھٹی پر تھی۔ ہم کاؤنٹر کے سامنے والی میز پر بیٹھ گئے اور چائے منگوا کر پینے لگے جب ہم چائے بھی ختم کر چکے اور وہ لڑکی نہ آئی تو میں نے ایک واقف بیرے کو بلا کر اس کے متعلق پوچھا۔

بیرے نے گردن کھجلاتے ہوئے ایک آنکھ میچ کر کہا:

''وہ اڑ گئی بھائی۔''

میں نے جلدی سے پوچھا:

''کہاں؟''

''یہ پتہ لگ جائے تو اسے پکڑ نہ لائیں۔ سالی ہوٹل کا سارا کیش بھی ساتھ ہی لے گئی۔ ہم نے بھی تھانے میں رپٹ لکھوا دی ہے۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لالی کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا اور اس کی آنکھیں یوں سکڑ گئیں جیسے کسی نے اس کے سامنے ایک دم تیز روشنی چکا دی ہو۔ وہ جلدی سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی باہر سڑک پر آ گیا۔

اس رات لالی بہت رویا۔

کبھی وہ اپنی ماں کو آوازیں دیتا اور کبھی اپنے باپ کو پکارتا جو انہیں چھوڑ کر اپنا کلارنٹ اٹھا خدا جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ میں نے بہتیرا حوصلہ دلانے کی کوشش کی لیکن لالی کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ اس دوران میں 'کالے پیسے' والا پنساری بھی آیا اور چکر بیڑی کا دھواں پھیلا کر چلا گیا۔ اندھیرے میں وہ لالی کو روتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔

اگلے دن اتوار تھا۔ لالی سارا دن بستر میں پڑا رہا۔ اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں اور ان کے گرد حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ تیسرے پہر میں نے اسے زبردستی بستر پر سے اٹھایا اور سیر کے بہانے لارنس باغ لے آیا۔ ہم ایک جگہ گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہمارے سروں پر ارول کا ایک اداس درخت جھکا ہوا تھا جس کے پتے سرخ اور زرد ہو رہے تھے لالی کی آنکھوں کی طرح ۔۔۔۔۔۔۔ ہمارے سامنے پلاٹ میں پانی دیا ہوا تھا۔ جھکے ہوئے درخت کا عکس پانی میں پڑ رہا تھا۔ کسی وقت کوئی پتا ٹہنی سے ٹوٹ کر چکراتا ہوا پانی کی سطح پر چپکے سے آن گرتا۔ لالی میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے دونوں پاؤں گھاس پر پھیلا رکھے تھے۔ اس کی پتلون گھٹنوں سے پھٹ گئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا:

''میں یہ شہر چھوڑ دیتا ہوں۔ یہاں میرا ذرا جی نہیں لگتا۔ میں اپنی ماں کو ساتھ لے کر کلو جانا چاہتا ہوں۔ کلو بڑی اچھی جگہ ہے۔ وہاں کوئی کسی کو بھگا کر نہیں لے جاتا اور کوئی لڑکی ہوٹل میں نہیں بیٹھتی۔ پہاڑ بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ میں یہ شہر چھوڑ دوں گا' ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔''

وہ یوں بول رہا تھا جیسے خواب میں کسی سے باتیں کر رہا ہو۔ وہ اپنے آپ چپ ہو گیا اور اس کی آواز افسردگی کے گہرے بادلوں میں کہیں ڈوب گئی۔ میں بھی خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے گمان ہو رہا تھا کہ اگر میں بولا تو بے خیالی میں میرا ہاتھ کسی ایسے تار کو چھو دے گا جس میں سے غم واندوہ کی چیخیں ابل پڑیں گی۔ میں چپ چاپ پانی میں تیرتے ہوئے زرد پتوں کو دیکھتا رہا۔ ہم یوں ایک دام اداس اور غمگین ہو گئے تھے جیسے ہمارے درمیان کسی عزیز دوست کی کفنائی ہوئی لاش پڑی ہو۔ لالی کے چہرے پر سردیوں کی سہ پہر کی زرد دھوپ تھی اور وہ کوئی ایسا شعلہ معلوم ہو رہا تھا جو کسی چتا میں سے اٹھا ہو اور وہیں منجمد ہو گیا ہو۔ وہ آہستہ سے بولا:

''لیکن کلو کیسے جاؤں؟ اتنے پیسے کہاں سے لاؤں؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا: ''لالی بھائی! تم کہیں نہ جاؤ۔ تم میرے پاس ہی رہو۔ ہم ایک سال تک خوب محنت سے کام کریں گے اور پھر اسی شہر میں کہیں اپنی الگ دوکان کھول لیں گے۔ پھر تم اپنی ماں کو بھی یہیں بلا لینا۔''

لالی نے گہرا سانس لیا اور ہاتھ سے ماتھے پر بیٹھی ہوئی مکھی اڑاتے ہوئے بولا: 'شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے یہیں رہنا چاہیے۔ اس بڑھاپے میں ماں کو لیے کہاں مارا مارا پھروں گا؟ میں یہیں رہوں گا۔ مگر اس ہوٹل کے سامنے سے کبھی نہیں گزروں گا۔ تم نہیں جانتے مجھے یوں لگتا ہے گویا اس ہوٹل میں میرا باپ اور میری ماں دفن ہے۔۔۔۔۔۔ میں اب چرس کو بھی دوبارہ ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ میں کل سے باقاعدہ نماز شروع کردوں گا۔ یہ مجھے گناہوں کی سزا ملی ہے۔ خدا مجھے معاف کرے۔''

اس دن لالی میرے ساتھ بازار گیا۔ بندے پیچ کر اس نے ایک جانماز خریدی اور واپس آ گیا۔ رات کو اس نے پہلی نماز کوٹھڑی میں ہی ادا کی اور صبح اٹھ کر مسجد میں مولوی صاحب سے قرآن مجید کا سبق لینا شروع کر دیا۔ میں اس خوشگوار انقلاب پر بے حد خوش ہوا اور لالی کا پہلے سے بڑھ چڑھ کر خیال رکھنے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی نماز شروع کردی۔

لالی کو اس نئی زندگی میں داخل ہوئے بمشکل ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ ہمارے سینما ہال میں قائداعظم فنڈ کے لیے شہر کی مشہور طوائفوں کا زندہ ناچ گانا ہوا۔ کام سے فارغ ہوکر ہمارا سارا عملہ اپنے استاد کے ساتھ گیلری میں جا کر بیٹھ گیا۔ شو شروع ہو گیا۔ نیم عریاں، گول گول جسموں والی عورتیں کولہے مٹکا مٹکا کر ناچنے لگیں۔ تالیوں سیٹیوں اور آوازوں کے شور میں وہ وحشیوں کی طرح اپنے جسموں کو ڈھلکا رہی تھیں۔ میں اور لالی اکٹھے بیٹھے تھے۔ لالی نے ایک طوائف لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

اس لڑکی کی شکل اس ہوٹل والی سے کتنی ملتی ہے!

میں نے اس لڑکی کو اچھی طرح دیکھا۔ وہ سینے کی آخری حدوں تک عریاں تھی اور ناچتے وقت اس کی رانیں اوپر تک ننگی ہو جاتی تھیں۔ اس پر سرخ روشنی پڑ رہی تھی اور وہ دور سے بھڑکتا ہوا سرخ۔۔۔۔۔۔ گہرا سرخ شعلہ معلوم ہو رہی تھی۔

پروگرام ختم ہوا تو میں روٹی پکانے کوٹھڑی میں آ گیا اور استاد نے لالی کو شاہ جی کے لے چرس لانے بھیج دیا۔ رات دس ساڑھے دس کے قریب لالی آیا تو اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ وہ چرس کے نشے میں چور تھا۔ اور اس کی آنکھیں سکڑ کر چھوٹی ہوگئی تھیں۔ میں نے روٹی کو پوچھا تو وہ ہوں ہاں کیے بغیر لحاف میں دبک گیا۔ اس روز میری باری زمین پر سونے کی تھی۔ میں نے دیئے کو پھونک ماری اور سرہانے پر سر رکھ کر لالی کے متعلق سوچتے سوچتے سو گیا۔ نہ جانے کس وقت اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

لالی اپنی چارپائی پر کسی پہلوان سے کشتی لڑ رہا تھا۔

◆◆◆

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

ڈاچی والیا

یہ چھوٹی سی کچی سڑک ۔۔۔۔۔۔ جو باغ میں سے گزرتی ہے پیدل چلنے والوں کے لیے ہے۔

اس پر زرد اور بھورے رنگ کی بجری بچھی ہے اور ٹاہلی اور سفیدے کے درختوں کا سایہ ہے۔ اس کی دونوں جانب گھاس کے چھوٹے چھوٹے قطعے ہیں جہاں کہیں باڑھ کھینچ کر گلاب اور گیندے کے پھول اگائے ہوئے ہیں اور کہیں جلے ہوئے مکانوں کے ملبے کے ڈھیر لگے ہیں۔ ٹاہلی اور سفیدے کے درختوں میں گھرا ہوا یہ راستہ شہر کے ایک دروازے کو دوسرے دروازے سے ملاتا ہے۔ ماہ چیت میں جب ٹاہلی کی شاخوں پر بور آتا ہے تو سارا راستہ دھیمی دھیمی شیریں خوشبو سے مہک اٹھتا ہے۔ سفیدے کی لٹکتی' لمبی' نازک ٹہنیاں بدلتی رات کے خوشگوار جھونکوں میں جھولنے لگتی ہیں اور کسی وقت ٹاہلی کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی ہیں۔ ٹاہلی اور سفیدے میں' کافی اور مکھن' باہُن اور وارث شاہ کا فرق ہے۔ لیکن جب بہار کا پہلا شگوفہ پھوٹتا ہے اور ہوا نئی نویلی' ہری بھری پتیوں کا منہ چوم چوم کر گزرتی ہے اور سرسراتی شاخوں میں بہار کے سر جاگتے ہیں تو کافی میں مکھن ڈال کر پیا جاتا ہے اور ٹاہلی کی چھاؤں میں باہُن کی نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ پھر سب فرق مٹ جاتے ہیں اور سب دروازے کھل جاتے ہیں مگر اس کچی سڑک پر چیت کی خوشبودار ہوائیں چیت کے مہینے میں بھی کبھی کبھار ہی چلتی ہیں۔

بہار اپنے ساتھ زمین کے سارے گیت لاتی ہے۔ اس کا پہلا بوسہ سرد بے جان ٹنڈ منڈ درختوں میں زندگی کا گرم خون دوڑا دیتا ہے اور ان کی سیاہ اور ننگی ٹہنیاں نازک اور کومل پتیوں سے لد جاتی ہیں اور ہوا کے ہر جھونکے پر تالیاں سی بج اٹھتی ہیں۔ بھدی شاخیں سبز پتوں میں چھپ جاتی ہیں اور ان میں بسیرا لینے والے پرندے میٹھے راگ چھیڑ دیتے ہیں۔ دن چڑھے' جب اس چھوٹی سی سڑک پر بچھی ہوئی بجری سورج کی آڑی ترچھی سنہری کرنوں میں چمکنے لگتی ہے تو شہتوت بیچنے والے ایک ایک کر کے گزرنے لگتے ہیں۔ سروں پر اٹھائے ہوئے چوڑے ٹوکروں میں کالے' قرمزی' ہلکے سرخ اور ہلکے سبز رس دار شہتوت پتوں اور گلاب کے پھولوں میں چھپے ہوتے ہیں اور یہ ٹوکرے جہاں جہاں سے گزرتے ہیں میٹھی مہک پھیلائے جاتے ہیں اور شہد کی مکھیاں ان کے ساتھ ساتھ جاتی ہیں۔

دن ڈھلے جب سورج آخری بار گنجان مکانوں کے عقب میں سے اس کچی سڑک کو دیکھتا ہے تو درختوں کے سائے لمبے ہو کر گہرے ہو جاتے ہیں اور گھنیری شاخوں میں پرندوں کا شور بڑھ جاتا ہے اور نوزائیدہ کونپلیں ڈھلتی دھوپ کی ملگجی چمک میں شرما جاتی ہیں اور سرخ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو جاتی ہیں۔ جدائی کی گھڑی بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ کوئی سر جھکائے پلکوں میں آنسوؤں کے دیپ جلائے جدا ہوتا ہے اور کوئی شور مچاتا ہے۔ سورج کی جدائی عظیم ہے۔ وہ کچھ نہیں کہتا کچھ نہیں مانگتا۔۔۔۔۔۔۔صرف جدا ہو جاتا ہے۔ یہ کچی سڑک بھی کسی سے کچھ نہیں کہتی مانگتی صرف خاموش رہتی ہے۔ سب کچھ دیکھتی ہے سب کچھ سنتی ہے اور صرف خاموش رہتی ہے۔

اس کے شروع میں بائیں جانب ایک پلاٹ ہے۔ اس پلاٹ میں بچوں کے کھیلنے کا سامان لگا ہے اور باہر لکڑی کی تختی پر لکھا ہے۔"

"چودہ سال سے کم عمر بچوں کے لیے۔۔۔۔۔۔۔خلاف ورزی

کرنے والوں کو حوالہ پولیس کیا جائے گا۔۔۔۔۔۔۔

اندر چودہ سال سے زیادہ عمر کے بچے پینگیں جھولتے ہیں 'پھسلنوں پر سے پھسلتے' دنبے اور بٹیرے لڑاتے ہیں اور حوالہ پولیس کرنے والے تکیہ بلاقی شاہ کے سامنے تخت پوشوں پر بیٹھے رہتے ہیں اور حقے پیتے رہتے ہیں۔ تاش کھیلتے ہیں اور جب کوئی کام نہ ہو تو ٹانگوں پر تیل ملوانے لگتے ہیں۔ یہ تکیہ باغ سے ذرا ہٹ کر گندے نالے پر واقع ہے۔ پیپل کے گنجان درخت کی سب سے بلند ٹہنی پر جھکے ہوئے بانس کے ساتھ سفید چیتھڑا سا لہرا رہا ہے۔ یہ جھنڈا تکیہ بلاقی شاہ کا نشان ہے۔ یہ نشان دور دور تک لڑائی جھگڑا کرنے والوں کو صلح آشتی کا پیام دیتا ہے مگر جب تکیے میں دنگا فساد ہوتا ہے تو کوئی صلح کا جھنڈا نہیں لہراتا۔ کوئی امن و آشتی کا پیام لے کر نہیں آتا۔ سفید ے جھنڈے تلے ہمیشہ خون ہوا ہے اور امن کے جھنڈے تلے ہر دور میں تلواریں جھنجھنائی ہیں۔ بھینگی آنکھ والا کوچوان سانٹا بغل میں دبائے ڈبل اینٹ پر بیٹھا کلیاں پی رہا ہے اور مجاور کے چھوٹے بھائی سے باتیں کر رہا ہے۔

ہسپتال کے سنتری نے کہا۔ گھوڑی نابالغ ہے میرے ساتھ چلو۔ میں نے کہا' بادشاہو پکی عمر کی پٹھی ہے جانے دو۔ بولا' بک بک مت کرو۔ میں نے ذرا پرے لے جا کر اٹھنی تھما دی اور گھوڑی بالغ ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔یا علی مدد!

خلیفہ۔۔۔۔۔۔۔نکی نہیں آیا آج۔۔۔۔۔۔۔

خلیفہ نکی عموماً شام کو آتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے جھکے جھکے چلا آ رہا ہوتا ہے۔

اس کی داہنی کلائی میں کانچ کا سبز کڑا ہوتا ہے اور پاؤں سے ننگا ہوتا ہے۔ تکیے میں آتے ہی وہ میلی چادر اتار کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ یا علی مدد کا نعرہ لگاتا ہے اور ہر ایک سے سلام دعا لیتا چرس پینے والے کلیاں تازہ کرنے شروع کر دیتا ہے۔ بڑی محبت سے وہ چلموں میں پھنسا ہوا میل کھرچتا ہے اور بانس کی نے میں لوہے کی سلاخ بار بار پھیرتا ہے۔ پھر آنگن میں پانی کا چھڑکاؤ کرتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مزار کے آس پاس فرش پر بڑے خضوع وخشوع سے مور کے پروں کا جھاڑو پھیرتا ہے۔ مجاور کی گھوڑی کو پانی پلاتا ہے۔ اس کے پاؤں اور گھٹنے دھوتا ہے اور کپڑے سے اس کے بدن پر مالش شروع کر دیتا ہے۔ جب اس کا دم پھول جاتا ہے اور گھوڑی کی سیاہ کھال چمکنے لگتی ہے تو وہ گندے اور کمزور دانت نکال کر بڑے فخر سے ہنستا ہے۔ اس کی پیٹھ تھپتھپاتا ہے اور بڑے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ' بڑے مجاور کے پاؤں دبانے لگتا ہے۔ خلیفہ نکی دن کے وقت شہر کی گلیوں میں گھوم پھر کر مسی' سرمہ' مہندی اور وسمہ بیچتا ہے۔ اس کی ایک جوان لڑکی جس کی عمر تیس سے اوپر جا رہی ہے ابھی تک کنواری بیٹھی ہے۔ پچھلے ماہ سے اس کی بڑی لڑکی بھی طلاق لے کر اپنے گھر آ گئی ہے۔ اس کا خاوند شراب پی کر اسے روز پیٹا کرتا تھا۔ اس نے اس کا سارا زیور بیچ ڈالا تھا اور اب چاہتا تھا کہ اپنی بیوی کے کپڑے بھی بیچ ڈالے۔ لیکن وہ نیک بخت اپنے بدبخت باپ کے گھر بھاگ کر آ گئی اور بعد میں طلاق لے لی۔ خلیفہ کا بڑا لڑکا۔۔۔۔۔۔۔ اکلوتا لڑکا لوکو ورکشاپ میں پونے تین روپے روز کا کاریگر تھا۔ فسادات کے دنوں میں وہ ایک شام کام سے واپس آ رہا تھا کہ ریلوے سٹیشن کے باہر کسی نے اس کی پشت میں چھرا گھونپ دیا۔ پونے تین روپے روز کا کاریگر لڑکھڑا کر اوندھے منہ گر پڑا اور اس کا روٹی لے جانے والا ڈبہ لڑھک کر نالی میں گر پڑا۔ اکلوتے بیٹے کی موت نے خلیفہ نکی کے دونوں بازو توڑ دیئے اور وہ وقت سے پہلے بہت بوڑھا ہونے لگا۔ پائی پائی جوڑ کر سنسان دوپہروں میں گلی کوچوں کے چکر کاٹ کر اس نے اپنی بڑی لڑکی کی شادی کی جو آباد نہ ہو سکی اور طلاق لے کر گھر آن بیٹھی۔ وہ گھر آ گئی اور خلیفہ نکی تکیے جا بیٹھا۔ اسے گھر جاتے ہوئے خوف آتا تھا۔ پہلے پہل وہ بے حد فکر مند رہا کرتا تھا۔ لیکن جب سے مجاور نے اسے کہا ہے۔

''خلیفہ اللہ کی ذات پر ڈور چھوڑ دو۔ یوں فکر کرنے سے کچھ نہ بنے گا۔ ان بچیوں کی شادی میرے مولا کی ذات ہی کرے گی۔''

خلیفہ نکی کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اسے پورا یقین ہو گیا کہ اس کی لڑکیوں کی شادی اللہ کی ذات ہی کرے گی۔ وہ نہیں کر سکتا۔ اس غریب کی بساط ہی کیا ہے۔

جمعرات کو اس تکیے میں بڑی رونق ہوتی ہے۔ نذر و نیاز گزاری جاتی ہے۔ چڑھاوے چڑھتے ہیں۔ بھنڈارا پکتا ہے تبرک تقسیم ہوتا ہے۔ قوالیاں ہوتی ہیں۔ کوکین چرس اور شراب بکتی ہے۔ خلیفہ نکی کو سر کھجلانے کی فرصت نہیں ہوتی۔ کبھی اس ٹولی کو چرس بھر کر دے رہا ہوتا ہے تو کبھی اس ٹولی میں تبرک بانٹ رہا ہوتا ہے۔ جب سب لوگ چلے جاتے ہیں اور مجاور خفیہ طور پر بچی ہوئی شراب اور کوکین کا مزار کے پاس بیٹھ کر حساب کتاب کرنے لگتا ہے تو خلیفہ چرس میں گھٹ' گھڑا بغل میں دبا کر پیپل کے چبوترے پر بیٹھ جاتا ہے اور مریل کبوتر ایسی آواز میں سر جھکا کر گانے لگتا ہے:

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تیری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں
میں تاں ماہی مناون چلیاں
ڈاچی روندی اے زار و زار وے
ڈاچی والیا موڑ مہار وے

سالہا سال سے ڈاچی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ سالہا سال سے خلیفہ کی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ سالہا سال سے ڈاچی رو رہی ہے اور اس کی آنکھیں بند ہیں اور وہ ریت کے جھکڑ اڑاتے ویران صحراؤں میں سفر کر رہی ہے اور رو رو کر اپنے ماہی سے کہہ رہی ہے' ڈاچی والے سے کہہ رہی ہے۔۔۔۔۔۔ موڑ مہار وے۔۔۔۔۔۔ موڑ مہار وے۔۔۔۔۔۔

لیکن ڈاچی والا خاموش ہے' چپ ہے' وہ بالکل نہیں بولتا۔ کوئی جواب نہیں دیتا اور خلیفے کی غمزدہ آواز اڑتی ریت میں ابھر ابھر کر ڈوب رہی ہے۔

ڈاچی والیا۔۔۔۔۔۔ ڈاچی والیا۔۔۔۔۔۔!

دن چڑھے اسکول جاتے ہوئے لڑکیاں اسی پکی سڑک پر سے گذرتی ہیں۔

نیلے کالے برقعوں اور سفید کاسنی دوپٹوں والی لڑکیاں۔ چوتھی' پانچویں چھٹی اور ساتویں آٹھویں جماعت کی لڑکیاں۔ سیدھے سادے کورے چہروں اور نیلی سیاہی کے دھبے لگی شلواروں والی لڑکیاں۔ وہ کمزور مرغیوں کی طرح ٹولیاں بنا کر چلتی ہیں اور راہ چلتے باتیں بھی کرتی جاتی ہیں۔ اسکول کی استانیوں اور آنے والی چھٹیوں کی باتیں' جیومیٹری اور خاندان غلاماں کی باتیں' دینیات کے پیریڈ اور مدھو بالا کے خوبصورت کپڑوں کی باتیں۔ ان میں ہر ایک کچھ نہ کچھ کھا کر آئی ہے۔ کسی نے دودھ میں انڈا پھینٹ کر پیا ہے اور کسی نے اولٹین والی چائے کے ساتھ مکھن لگے توسٹ کھائے ہیں۔ کوئی رات کے باسی چاول کھا کر آئی ہے اور لسی پی کر' کوئی نمکین چائے پی کر اور کوئی صرف پانی پی کر۔۔۔۔۔۔ لاہور کا پانی بہت طاقتور ہے۔ اس میں سارے وٹامن موجود ہیں۔ اس میں نمک بھی ہے' اور سوڈا بھی۔ کالے پانی کی طرح۔۔۔۔۔۔ اسے پی کر ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں اور زبان پر کانٹے ابھر آتے ہیں۔ پانی پی کر آئی ہوئی لڑکیاں اسکول میں خوب جی لگا کر پڑھتی ہیں۔ ان کے سر چکراتے ہیں' آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا ہے لیکن وہ خوب جی لگا کر پڑھتی ہیں۔ ان کے معدے درد کرنے لگتے ہیں' معدے ہضم ہونے لگتے ہیں' وہ نیم جاں سی ہو کر آنکھیں بند کر لیتی ہیں اور استانی انہیں کان سے پکڑ کر زور سے ہلاتی ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''نیند آ رہی ہے؟۔۔۔۔۔۔اتنا کھا کر نہیں آنا تھا۔''

نیند دونوں طرح آتی ہے۔زیادہ کھانے سے بھی اور کچھ نہ کھانے سے بھی۔۔۔۔۔۔ان میں بڑا تھوڑا فرق ہے۔پلک جھپکنے کا فرق ہے۔پہلی نیند بیدار ہونے کے لیے ہوتی ہے اور دوسری سونے کے لیے محض سونے کے لیے اور پھر کبھی نہ اٹھنے کے لیے!

آہا! یہ نیند کتنی اچھی ہے! لاہور کا پانی کتنا اچھا ہے! یا علی مدد! چلو پانی پئیں اور یاد کریں پیاس۔۔۔۔۔۔

ایک کمسن بچی سلیٹ اور قاعدہ سینے سے لگائے خاردار تار کے ساتھ ساتھ جا رہی ہے۔اس کے سیاہ گھنگھریالے بال سرخ فیتے سے بندھے ہیں اور پاؤں میں چھوٹا سرخ سینڈل ہے۔وہ ہر گزرنے والے کو بھولا بھالا منہ اٹھائے تکتی ہے اور تکتی چلی جاتی ہے۔اب وہ لڑکوں کے پرائمری اسکول کے برآمدے میں لیٹے ہوئے درویش کو تک رہی ہے۔یہ درویش دن رات اسی برآمدے میں ٹوٹی ہوئی چارپائی پر گندے چیتھڑوں میں لپٹا پڑا رہتا ہے۔اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا خیال ہے کہ وہ کوئی بڑا پہنچا ہوا فقیر ہے۔دوسرے ماسٹر بھی اس خیال سے متفق ہیں۔کارپوریشن بھی اس خیال سے متفق معلوم ہوتی ہے۔اسی لیے کوئی اسے وہاں سے اٹھوانے نہیں آتا۔وہ چارپائی پر آنکھیں چھت پر لگائے لیٹا رہتا ہے اور اس کے جسم پر مکھیاں اڑتی رہتی ہیں۔کبھی کبھی ہیڈ ماسٹر صاحب کھانے والی کوئی چیز لے کر فقیر کے سرہانے آن بیٹھتے ہیں اور اسے کھلاتے ہوئے جھک کر سرگوشیوں میں پوچھنے لگتے ہیں۔

پھر بابا جی کیا نکلے گا آج' کونسا حرف پڑے گا؟

''ایں؟ کیا کہا؟ اٹھی؟''

اور کسی وقت وہ درویش زور سے چیخ اٹھتا ہے:

''تیری ماں کا سر پڑے گا۔۔۔۔۔۔تیری ماں کا سر نکلے گا۔۔۔۔۔۔پکڑ لو پکڑ لو حضرت خضر خواص کو بلاؤ۔۔۔۔۔۔بلاؤ۔۔۔۔۔۔بلاؤ۔۔۔۔۔۔''

اسکول کے لڑکے اس درویش کو واہی تباہی بکتے دیکھ کر ہنسا بھی کرتے ہیں اور سوچا بھی کرتے ہیں۔وہ ہنستے ہیں یہ کیسا آدمی ہے! وہ سوچتے ہیں ایسا کیوں ہے؟ ہر سوچ سوالیہ نشان سے شروع ہو کر پہلے سے بڑے سوالیہ نشان پر ختم ہو جاتی ہے۔ہنسنے سے کچھ نہیں ہوتا۔سوچنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔پہلے ہنسو اور اس کے بعد بھی ہنسو۔ہنسو ہنسوائے دنیا والو! یہ فلم نشاط میں چلی تھی۔بڑی اچھی تھی۔ماسٹر بھگوان نے تو کمال ہی کر دیا تھا۔وہ ہر آدمی کو مکا مار کر گرا لیتا تھا اور اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر گرج کر کہتا تھا:

''اب بچ کر کہاں جائے گا سالے؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور پھر کلے پھلا کر ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھ کر زور زور سے قہقہے لگاتا تھا۔ ہاہاہا۔۔۔۔۔۔۔ہاہاہا۔۔۔۔۔۔۔

ماسٹر صاحبان بید اور بانس کی سونٹیوں سے لڑکوں کو میدان میں ہنکائے لیے جا رہے ہیں۔ وہاں قطاروں میں کھڑے ہو کر وہ خدا کی حمد گائیں گے۔ وہ ترچھی قطاروں میں کھڑے ہو گئے ہیں۔ چھوٹی جماعتوں کے لڑکے پیچھے ہیں اور بید کی چھڑیوں کے ڈر سے سہمے کھڑے ہیں۔ حمد شروع ہو گئی ہے۔

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا

حساب والا ماسٹر تاریخ والے ماسٹر سے کہہ رہا ہے:

"چوبارے پر نئی برساتی بنائی تھی' کل وہ بھی ڈھے گئی"

تاریخ والا ماسٹر ناک چڑھا چڑھا کر ہوا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہے:

"ہمارا بھی نیا بھٹہ بیٹھ گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ دار چینی کی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟

ہیڈ ماسٹر صاحب درویش کے سرہانے بیٹھے اس کے کھلے منہ میں لال لال شہتوت ڈال رہے ہیں۔ درویش کی پھٹی پھٹی سفید آنکھیں پوری کھلی ہیں اور منہ مشین کی طرح چل رہا ہے۔ کسی وقت وہ اپنے آپ چیخ اٹھتا ہے:

"تیری ماں کا سر پڑے گا۔۔۔۔۔۔۔۔ تیری ماں کا سر نکلے گا۔۔۔۔۔۔۔"

اسکول کے برآمدے میں دیوار پر سیاہ بورڈ لٹک رہا ہے۔ اس بورڈ پر جلی حروف میں لکھا ہے۔

جھوٹ مت بول۔ ہمیشہ سچ بول'

اس بورڈ کے نیچے دینیات کا ماسٹر کرسی پر بیٹھا تنخواہ کے پیسے گن رہا ہے اور چپڑاسی سے کہہ رہا ہے۔

"عطا محمد حکیم آئے تو اسے کہہ دینا۔ ابھی تنخواہ نہیں ملی۔ ساگودانے کے پیسے اگلی تنخواہ پر ملیں گے۔۔۔۔۔۔۔ ابھی بڑا خرچ ہے"

چپڑاسی کہہ رہا ہے:

زناب آپ سیکنڈ ماسٹر کو بھی خبردار کر دیں۔"

بورڈ پر لکھے ہوئے حروف مسکرا رہے ہیں۔ جلی حروف! جعلی حروف! سکھ چین کی الجھی ہوئی شاخوں میں چڑیاں آزادی سے اچھل کود رہی ہیں اور اس ٹھنڈی چھاؤں میں' گھاس پر جماعت لگی ہے۔ دوسری جماعت کے لڑکے سلیٹیں گود میں لیے بیٹھے سوال حل

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرتے ہوئے نقلیں اڑا رہے ہیں۔ استاد سٹول پر بیٹھا بیڑی پی رہا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ بچوں کو سوال حل کرتے دیکھ رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے اور جی ہی جی میں یہ سوچ رہا ہے کہ پڑھ لکھ کر بڑے ہوں گے۔ کبوتر پالیں گے۔ ان کی کابکیں بنائیں گے۔ گنڈیریاں بیچیں گے۔ کباب لگائیں گے۔ خود بھی کھائیں گے اور ماسٹر صاحب کو بھی کھلائیں گے۔ بڑا ہو کوئی سائیکلوں کی دکان کھولے گا' کوئی پان کی دوکان کرے گا۔ کوئی طبلوں پر آٹا لگائے گا اور کوئی آٹے کی بلیک کرے گا۔ پھر ان کے بیاہ ہوں گے۔ چاندی سی دلہنیں گھر آئیں گی اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر قبرستان جائیں گی۔۔۔۔۔۔

دوسری جانب ایک لڑکا ماسٹر صاحب کو نظم سنا رہا ہے۔

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت

پہلی جماعت کی ٹولی میں ایک بچہ ناک چڑھاتے ہوئے بلند آواز میں سبق پڑھ رہا ہے۔

اب جا۔۔۔۔۔۔کل آ۔۔۔۔۔۔ڈرمت۔۔۔۔۔۔گنا چھیلو

ماسٹر صاحب اس کا کان مروڑ رہے ہیں۔ لڑکا دہرا ہوا جا رہا ہے'

''اوئے حرام زادے! گنا کیوں چھیلو؟ اوئے تیری ماں نے وہاں گنے لگائے تھے؟

ایں؟

لڑکا رو رہا ہے اور آنکھوں سے وہ سارا سرمہ بہنے لگا ہے جو اس کی ماں نے بڑی محبت سے ڈالا تھا۔ وہ ناک چڑھاتے ہوئے روتے روتے پڑھ رہا ہے۔

اب جا۔۔۔۔۔۔کل جا۔۔۔۔۔۔مرغی چھیلو۔۔۔۔۔۔جیبیں کاٹو۔۔۔۔۔۔یہ مسجد ہے۔۔۔۔۔۔وہ تکیہ ہے۔۔۔۔۔۔آؤ جوتے چرائیں۔۔۔۔۔۔آج تو بلیک مارکیٹ کا دن ہے۔

اور ماسٹر صاحب سر ہلا ہلا کر کہہ رہا ہے:

''شاباش شاباش! بہت خوب''

تاریخ والا ماسٹر بید سے ایک لڑکے کی مرمت کر رہا ہے اور بار بار پوچھ رہا ہے:

''بتا تیرا باپ محمود غزنوی ہندوستان کیا کرنے آیا تھا؟''

لڑکا کانپتے ہونٹوں سے کہہ رہا ہے:

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''جی۔۔۔۔۔۔۔۔جی اسلام پھیلانے''

''ہاں اب کیسے پتہ چلا؟ پہلے کیوں نہیں کہہ دیا؟''

لڑکے نے پہلے کچھ اور کہا تھا۔شاید اس نے کہا ہو محمود غزنوی ہندوستان میلہ چراغاں دیکھنے آیا تھا۔دنگل دیکھنے آیا تھا۔سونا لینے آیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔احمق لڑکا! بھلا بادشاہوں کو سونے کی کیا پرواہوتی ہے۔وہ تو خود پارس ہوتے ہیں اور جس کو ہاتھ لگالیں سونا بن جاتا ہے۔محمود غزنوی کو یہی خواہش ہندوستان لائی تھی۔وہ سومنات کے بت کو اپنے ہاتھ سے چھونا چاہتا تھا تاکہ وہ سونا بن جائے اور پھر وہ اسے اپنے ساتھ غزنی لے جائے۔اس نے کئی ایک دیوداسیوں کو بھی چھوکر سونے میں بدل دیا تھا۔اور انہیں بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔محمود نے ایک بت گرایا تھا۔اس نے اسلام کو یہاں چادر کی مانند پھیلایا تھا اور اس میں سومنات کا سونا لپیٹ کر لے گیا تھا۔وہ بڑا عقلمند بادشاہ تھا۔اگر وہ یہاں رہ جاتا اور سڑکوں کی مرمت'سراؤں کی تعمیر اور کنوؤں کی کھدائی میں لگ جاتا تو اس کی قبر بھی کہیں ایک روڈ کے پاس ہی نالی پر ہوتی۔۔۔۔۔۔۔محمود غزنوی اپنی لاش بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ہیل محمود غزنوی! غازی محمود غزنوی!

تاریخ والا ماسٹر انڈی پن کرنب پر دھاگہ لپیٹ رہا ہے۔کسی وقت وہ خرگوش کی طرح ناک سکیڑ کر فضا میں سونگھتا ہے اور اپنے آپ سے سوال کرتا ہے:

''یہ سالی دار چینی کی خوشبو آج کہاں سے آرہی ہے؟''

اس مکان میں کسی لڑکی کی شادی ہے۔آج مہندی کی رسم ہے اور دوسری منزل پر ایک بڑے سے دیگچے میں قہوہ پک رہا ہے۔دو پکی عمر کی دبلی پتلی عورتیں دیگچے کے پاس بیٹھی آگ جلا رہی ہیں۔وہ جبڑے ہلا ہلا کر آنکھیں گھما گھما کر باتیں کر رہی اور پیالیوں میں بار بار قہوہ چکھ رہی ہیں۔

''میٹھا تیز ہے بہن پھامو''

''میٹھا پھیکا ہے بہن جانو''

بہن پھامو قہوے میں چینی ڈال رہی ہے اور بہن جانو پانی۔۔۔۔۔۔۔اور میٹھا کبھی تیز ہو رہا ہے اور کبھی پھیکا۔

ہونے والی دلہن کے بال کھلے ہیں اور ان میں چنبیلی کا تیل رچایا جا رہا ہے۔اس کے بازوؤں' گردن اور پنڈلیوں پر حنا کی مالش ہو رہی ہے۔سہیلیاں اس سے چہلیں کر رہی ہیں۔اس سے ہنسی مذاق کی باتیں کر رہی ہیں۔دلہن کی ہتھیلیوں پر مہندی سوکھ گئی ہے۔وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے ناخنوں سے کھرچ رہی ہے اور شرم سے دوہری ہوئی جارہی ہے۔ وہ کچھ نہیں بول رہی ہے۔ وہ خاموش ہے اور ہونٹ دانتوں تلے دبائے شرما رہی ہے۔ ہمارے ہاں لڑکیاں صرف شرمانا جانتی ہیں۔ وہ بہت شرماتی ہیں۔ ڈولی میں بیٹھتے ہوئے بھی اور ڈولی سے نکلتے ہوئے بھی۔

آپا تمہاری شادی کب ہوگی؟ اور آپا شرما جاتی ہے اور کچھ نہیں بولتی۔

بیٹی تمہیں یہ لڑکا منظور ہے؟' اور بیٹی شرما جاتی ہے اور کچھ نہیں کہتی۔ شرمانا ہی ہماری زندگی ہے اور اس میں ہماری موت ہے۔ یہی ہمارا زیور ہے اور یہی ہمارا سنگار ہے۔ ہم پیدا ہوتے ہوئے بھی شرماتے ہیں اور مرتے ہوئے بھی۔۔۔۔۔۔ ہمیں ضرور شرم کرنی چاہیے ہمیں ضرور شرم آنی چاہیے۔۔۔۔۔۔۔ شیم! شیم!

دلہن کا باپ دیوان خانے میں حقہ لیے بیٹھا ہے۔ وہ نائی کو براتیوں کی تعداد بتا رہا ہے اور کہہ رہا ہے:

''پلاؤ بے شک بچ جائے مگر کم نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔ اور ہاں آلو بخارے کی چٹنی ضرور ہو۔۔۔۔۔۔۔ کیا سمجھتے ہو؟''

ہاں۔۔۔۔۔۔۔ آلو بخارے کی چٹنی ضرور ہو اور بناسپتی گھی کا کوئی کنستر باہر نظر نہ آئے۔ کیا سمجھے ہو؟''

نائی سب کچھ سمجھ رہا ہے۔ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ بوڑھا کہاں سے قرض لے کر آلو بخارے کی چٹنی بنوا رہا ہے اور گھی کے کنستر منگوا رہا ہے۔ کیا سمجھے ہو؟

دلہن کی چھوٹی بہن کھڑکی میں کھڑی ہے۔

اس کے کیسری سوٹ پر گوٹا لگا ہے۔ وہ ہاتھ کھلے پٹ پر رکھے اور دوسرے ہاتھ میں باقر خانی لیے کھا رہی ہے اور نیچے اپنے بھائیوں اور دوسرے رشتہ دار لڑکوں کو کیلے کے پتروں اور کاغذ کی رنگ برنگ جھنڈیوں سے گلی سجاتے دیکھ رہی ہے۔ عین سامنے والے مکان کے غسل خانے کی کھڑکی میں سے ایک نوجوان لڑکا' تولیہ کندھے پر ڈالے اسے معنی خیز نگاہوں سے گھور رہا ہے۔ پہلے وہ اس کی بڑی بہن کو گھورا کرتا تھا اور کل سے چھوٹی بہن کو گھورا کرے گا۔ یہاں ہر نوجوان گھورتا ہے۔ کبھی بڑی بہن کو۔۔۔۔۔۔۔ کبھی چھوٹی بہن کو۔۔۔۔۔۔!

چھوٹی بہن بڑے لاابالی انداز میں باقر خانی کھا رہی ہے اور اس کا منہ ہل رہا ہے۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دو آنکھیں اسے کہیں قریب سے گھور رہی ہیں اور اسے بری طرح باقر خانی چباتے دیکھ رہی ہیں۔ وہ فوراً دوپٹے سے منہ پونچھتی ہے اور بڑی اچھی طرح باقر خانی چبانے لگتی ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دلہن کی سہیلیوں نے ڈھولک پر رخصتی کا گیت شروع کر دیا ہے۔ ڈھولک کی دھیمی دھیمی تھاپ پر گھریلو' کنواری اور پردہ پوش آوازیں اٹھ رہی ہیں۔

میری ڈولیہ نوں لگڑے کلیرے نی ماں
مینوں ودیا کرنے میرے ویرے نی ماں
جناں آپ کھڈایا جھولی نی ماں
.... اج رکھ لے میری ماں!

دلہن کی آنکھ بھیگ رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ اپنی ماں کے گھٹنوں پر سر رکھے بال گندھوا رہی ہے اور وہ ہولے ہولے سسکیاں بھرنے لگتی ہے۔ ماں اسے پیار سے تھپتھپا رہی ہے۔

''بچی!.......لڑکیاں تو پرایا دھن ہیں''

دلہن کا جی بھر آتا ہے اور وہ دوپٹے کا کنارا دانتوں تلے دبا لیتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ چیخ چیخ کر روئے اور لوگوں کو بتائے کہ اسے اپنا گھر' اپنی ماں' اپنی سہیلیاں اور اپنے بھائی چھوڑنے کا بہت غم ہے اور سسرال جانے کی خوشی ہے اور اسے شادی سے نفرت ہے اور وہ بڑی دیر سے شادی کا انتظار کر رہی تھی۔ اور وہ کہیں نہیں جانا چاہتی اور کہیں نہ کہیں ضرور جانا چاہتی ہے۔ لیکن وہ رو رہی ہے اور شرما رہی ہے اور دوپٹے کا کنارا دانتوں سے کاٹ رہی ہے اور سسک رہی ہے۔

دو تین مکان چھوڑ کر ایک اور لڑکی دانتوں میں دوپٹے کا کنارا دبائے ہونک رہی ہے۔ اس کے ماتھے پر بھی پسینہ ہے اور اس کی آنکھوں میں بھی آنسو ہیں۔ اس کا بدن روئی کے گالوں کی طرح گویا دھنکا جا رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے اس کے منہ سے بے اختیار ایک درد انگیز لمبی چیخ نکل جاتی ہے اور اس کے ارد گرد بیٹھی ہوئی دو تین عورتیں اسے تسلیاں دے رہی ہے اور شہد چٹا رہی ہیں۔ اور پھر معاً کسی ننھی سی جان کے رونے کی آواز آتی ہے۔ اور دائی نومولود بچے کو ماں کی آغوش میں لٹا دیتی ہے اور ماں کے درد بھرے زرد چہرے پر سکون انبساط کی قندیلیں سی جگمگا اٹھتی ہیں۔ وہ منہ پھیر کر ننھی سی جان کو دیکھتی ہے اور اپنی ساری اذیت اپنی ساری تکلیف' اپنا سارا دکھ درد بھول جاتی ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے محض ایک کمزور ناتواں بچے کو نہیں بلکہ اپنے ایسے جوان' خوبصورت اور زندگی کی حرارت سے گرم جسم کو جنم دیا ہے۔ دودھ خون آنسوؤں میں نہائی ہوئی ماں کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔

اس نے زندگی' حسن فن اور آرٹ کے ان میناروں کو چھو لیا ہے جہاں صرف ایک عورت ہی پہنچ سکتی ہے۔ اور جہاں پہنچے کے بغیر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کوئی عورت مکمل نہیں ہوتی۔ ننھی سی جان دودھ پی رہی ہے اور ماں کے چہرے پر سکون ہے' درد ہے' تبسم ہے' کرب کا احساس ہے۔۔۔۔۔۔اچانک ایک ٹیس اٹھتی ہے اور اس کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل جاتی ہے۔

ایک ٹیس۔۔۔۔۔۔ایک چیخ!

دنیا میں صرف یہی چیخ جاری وساری ہے۔ عورت کی چیخ' پیدائش کی چیخ' تخلیق کی چیخ' اس میں سبھی کچھ ہے۔ درد' کرب' سکون اور مسرت۔۔۔۔۔۔زندگی کے تمام رخ' زندگی کے سارے موڑ۔ یہ چیخ اذیت کی فریاد بھی ہے اور خوشیوں کا سہرا بھی۔ درد کے آنسو بھی اور آسودگی کے پھول بھی۔۔۔۔۔۔بچہ آنکھیں بند کئے غٹا غٹ دودھ پی رہا ہے۔ ماں کے سینے سے دودھ کی دھاریں برساتی جھرنوں کی طرح پھوٹ رہی ہیں۔ شاید کبھی عورت اس کیفیت کو بیان نہ کر سکے جو پہلے بچے کو دودھ پلاتے ہوئے اس پر طاری ہوتی ہے۔ بچہ دودھ پی رہا ہے۔ ماں اسے چوم رہی ہے اور اسے اپنا خاوند یاد آ رہا ہے۔ وہ خاوند پر جھکی اس کا منہ چوم رہی ہے اور اسے اپنا بچہ یاد آ رہا ہے۔ خاوند' بچہ' بچہ' خاوند۔۔۔۔۔۔اور ماں۔۔۔۔۔۔عورت کا معراج' ہمالیہ کی آخری چوٹی' زمین کا محور اور کائنات کا منبع! کل یہ عورت بہت کچھ تھی' سب کچھ تھی' صرف عورت نہیں تھی۔ بہت کچھ ہے۔ اس نے اپنے خون سے زندگی کی تخلیق کی ہے' یہ ماں ہے فطرت کا سب سے بڑا فنکار ہے' سب سے بڑا شہکار! آج سب کچھ پیچھے رہ گیا ہے۔ ادب' فن آرٹ' قانون بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ آج وہ اس بچے سے بھی چھوٹا' کمزور اور ادنیٰ ہے۔

میری ڈولی نوں لگڑے لاچے نی ماں

ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیاں بدستور گا رہی ہیں۔

اور ٹاہلی کے درخت تلے حکیم صاحب بوریا بچھا کر بیٹھ گئے ہیں۔ وہ دوائی کی بوتلیں یوں قرینے سے لگا رہے ہیں جیسے بیڑے پکڑ پکڑ کر بٹھلا رہے ہوں۔ ہر بوتل پر مرض کا نام جلی حروف میں لکھا ہے۔ پہلی قطار میں درد گردہ' درد معدہ' درد زہ' مرگی' سرطان اور دانت کے درد کی بوتلیں ہیں اور دوسری قطار میں پوشیدہ بیماریوں کے نام کھلے لفظوں میں دانت نکال رہے ہیں۔ ٹاہلی کے تنے پر ٹین کا ایک بورڈ جڑا ہے۔

شمس الحکما حکیم قبر بخش گورکنی ولد حکیم لحد دین میانوی

حاذق وسند یافتہ طبیہ کالج بھوتن پورہ خاص بیمارو! کدھر جاتے

ہو کدھر کا خیال ہے؟ تم لوگوں کا تو یہی ایک ہسپتال ہے۔"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حکیم صاحب کے پاس ادھیڑ عمر کا ایک دبلا پتلا سیاہ بدن چرخ سا آدمی اپنے جوتوں پر بیٹھا حقہ پی رہا ہے وہ کہہ رہا ہے:

''کل سے پیشاب پھر لگ کر آنے لگا ہے۔''

حکیم صاحب پتھری کو نڈی جھاڑتے ہوئے کہہ رہے ہیں:

پتھری پیدا ہو رہی ہے جھنڈے شاہ پتھری۔۔۔۔۔۔ایک تو یہ چائے تمہیں نہیں چھوڑتی۔''

''حکیم جی چائے تو آج کل ہر آدمی پیتا ہے۔اس وقت تو کسی ایسے نبی کی ضرورت ہے جو آتے ہی اسے حرام کر دے۔''

''کیوں حرام کی باتیں کرتے ہو جھنڈے شاہ؟''

ایک کمزور بوڑھے کو حکیم جی نے سرمہ ڈالا ہے اور وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا ہے اور اس کی آنکھوں سے لگاتار پانی بہنے لگا ہے۔ اسے درد محسوس ہو رہا ہے اور کہہ رہا ہے:

''حکیم جی پانی لگ کر آ رہا ہے۔''

اور جھنڈے خان کہہ رہا ہے:

''پتھری پیدا ہو رہی ہے بابا جی پتھری۔۔۔۔۔۔''

حکیم صاحب مریض کی آنکھیں گھما پھرا کر دیکھ رہے ہیں۔

''بابا جی! آپ کے ڈیلے مجھے بناوٹی لگتے ہیں۔''

''نہیں جی۔۔۔۔۔۔بالکل اصلی ہیں قدرتی ہیں''

حکیم صاحب زیادہ گھور کر دیکھتے ہیں۔

''اچھا۔۔۔۔۔۔میں دوائی دیئے دیتا ہوں۔گھر جا کر اسے گندھک میں ملا کر آنکھوں پر اس کا لیپ کر دینا۔انشاءاللہ کل ہی آرام آ جائے گا۔''

بابا جی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے حکیم صاحب کو تک رہے ہیں اور جھنڈے خان اپنی پتھری کو فراموش کئے حقے کا دھواں چھوڑتے ہوئے گا رہا ہے:

کسے دی زوائی پٹھاں دل ساڈا آ گیا

یہ نور زہاں بھی ابل لبر گاتی ہے۔اپنا جی دھوبی اس کے کپڑے دھویا کرتا ہے۔اس کے سارے کپڑے اپنی بیوی کو پہناتا ہے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور پھر انہیں بھٹی میں ڈالتا ہے۔ یہ قوم بھی اول نمبر قوم ہے۔ بھولی نیازیئے نے وہ مسلے خوب کہے تھے کہ

ول دھوبیاں ویاہ سبحان اللہ
ایدھر دن متھے ادھر گنڈ پے گئی
تن سیر روپئے دے چاول آئے
پنج سیر پکی اتے کھنڈ پے گئی
دھوبی جوڑ کے سراں نوں بیٹھ گئے
کئے بے وقوفاں دی ونڈ پے گئی
بھولی پھڑ کے کجاور تاون لگا
جدھر کھنڈ مکی ادھر ڈنڈ پے گئی

سامنے ایک لڑکا چلا آ رہا ہے۔ وہ دھوتی قمیض پہنے ہے۔ اس کے گلے میں تولیہ لپٹا ہے۔ اس کی چپل کا ایک پاؤں ٹوٹ گیا ہے اور وہ جنگلے کے ساتھ ساتھ قدرے لنگڑا کر چل رہا ہے۔ یہ لڑکا ہر روز یہاں سے گزرتا ہے' اور اس کے ہمراہ سیاہ برقعہ اوڑھے ایک لڑکی ہوتی ہے۔ دونوں بڑے مزے سے باتیں کرتے ہنستے کھیلتے گزرا کرتے تھے۔ لیکن آج یہ لڑکا تنہا چلا آ رہا ہے وراس کے ساتھ ہنسنے کھیلنے' اچھلنے کودنے والی کسی اور کے ساتھ تانگے میں جا رہی ہے۔ کسی اور کے ساتھ اچھل کود کر رہی ہے۔ لڑکیوں کو اچھل کود بہت پسند ہے۔ وہ تانگے میں بیٹھی پیچھے مڑ کر دیکھ رہی ہے۔ اس غریب اور اداس لڑکے کو جو ٹوٹی چپل کا پاؤں گھسیٹتا اپنے گھر کی سمت جا رہا ہے۔ اب وہ پیچھے مڑ کر کیا دیکھ رہی ہے؟ اب پیچھے دیکھنے سے کیا ہوگا؟ اب ہر شے اس کے سامنے آئے گی۔ اب ہر چیز اس کے آگے آئے گی۔ لڑکے کی چپل کا فیتہ اکھڑ گیا ہے۔ وہ چپل کا پاؤں گھسیٹتا اپنے گھر کی سمت جا رہا ہے۔ اب وہ پیچھے مڑ کر کیا دیکھ رہی ہے؟ اب پیچھے دیکھنے سے کیا ہوگا؟ اب ہر شے اس کے سامنے آئے گی۔ اب ہر چیز اس کے آگے آئے گی۔ لڑکے کے چپل کا فیتہ اکھڑ گیا ہے۔ اس نے چپل کا ایک پاؤں ہاتھ میں اٹھا لیا ہے اور شہتوت کے گھنے درخت تلے بنچ پر بیٹھ گیا ہے۔ وہ تولیے سے چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ رہا ہے اور پتھر سے چپل میں کیل ٹھونک رہا ہے۔ جوتا گھاس پر پھینک اس نے سگریٹ سلگا لیا ہے اور یونہی ایک طرف تکتے ہوئے اس لڑکی کو یاد کر رہا ہے جس نے ہمیشہ ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا اور جو اب ہمیشہ کے لیے ناطہ توڑ گئی تھی۔ جو اس پکی سڑک پر سے گزرتے ہوئے اسے کہا کرتی تھی:

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہم کبھی جدا نہ ہوں گے۔ ہمیں کوئی طاقت الگ نہ کر سکے گی۔ سمندروں سے اٹھنے والے بادل کی مانند ہم بازو پھیلائے ایک ساتھ وادیوں پر پرواز کریں گے' ایک ساتھ چراگاہوں پر برسیں گے اور گزر جائیں گے اور کبھی جدا نہ ہوں گے۔"

لیکن جب سمندر سے گہرے سرمئی رنگ کے گرجتے' برستے بادلوں کے پرشور قافلے ہرے بھرے مرغزاروں کی طرف روانہ ہوئے تو بڑے زور کا طوفان آیا۔ وادیوں' ٹیلوں' میدانوں اور چراگاہوں پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور بجلی کی کڑک بادلوں کی گرج اور طوفان بادو باراں میں قافلہ منتشر ہو گیا اور کوئی کہیں کوئی کہیں رہ گیا۔۔۔۔۔۔ بچھڑ گیا اور سیاہ برقعے والی نے سونے کی انگوٹھی والا ہاتھ اٹھا کر بال درست کرتے ہوئے کہا:

"یہ کیا ہو گیا؟۔۔۔۔۔۔ ہم کہاں سے کہاں آ گئے؟

آج میں تم سے جدا ہوتی ہوں مگر ہمیشہ ساتھ رہوں گی۔ میں تمہیں بھول رہی ہوں۔ لیکن ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ میں تم سے دور ہوں گی مگر بہت قریب رہوں گی۔ میرا جسم کسی دوسرے کی آغوش میں ہو گا اور دل تمہارے قدموں میں پڑا ہو گا اور تم اسے تعویذ میں بند کر کے گلے میں لٹکا لینا اور جب بھوک لگے تو چاٹ لیا کرنا۔۔۔۔۔۔ اور دیکھو میری انگلیوں پر سونا منڈھا ہے اور میرے کانوں میں طلائی آویزے ہیں اور پرس میں چیک بک ہے اور میرا سوٹ شیفون کا ہے۔ یہ سوٹ میرا خاوند کراچی سے لایا ہے۔ بھلا تم میرے لیے کراچی سے کیا لا سکتے ہو؟ تم نے تو ابھی تک کراچی دیکھا بھی نہیں۔ ویسے تم بڑے اچھے ہو' بڑے پیارے ہو۔ بڑے الو کے پٹھے ہو اور میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی اور میں نے تمہیں وہ چیز دے دی ہے جسے میرا خاوند بھی حاصل نہیں کر سکا۔ اور یہ لو دو روپے۔ تمہیں ضرورت ہو گی۔ بلیڈ خرید لینا۔ چپل کی مرمت کروا لینا۔ رات کو چرس پی لینا۔ اس طرح غم بھی غلط ہو جائے گا اور بہت سی دوسری چیزیں بھی اچھا اب میں جاتی ہوں۔ مجھ سے زیادہ کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ میرا نیا جوتا لگ رہا ہے اور یہاں گندے نالے کی کتنی واہیات بو ہے۔ پتہ نہیں لوگ یہاں کیسے رہتے ہیں اور پھر گرد بھی اڑ رہی ہے اور میرا شیفون کا سوٹ خراب ہو رہا ہے۔ اچھا اب میں جاتی ہوں اگر کبھی ملاقات ہو تو مسکرا کر ملنا۔ میں بھی تمہیں مسکرا کر ملوں گی۔ میں تو ہر ایک سے مسکرا کر ملتی ہوں۔ میری تو ایسی عادت ہی نہیں ہے۔ اور ہاں تم بھی رستے میں ہنس کر ملنا۔ پھر میں تمہیں یاد کرتی اپنے خاوند کے ساتھ چلی جاؤں گی اور تم مجھے یاد کرتے کہیں جھک مارنے چل دینا۔

میں بھی جھک مارتے ہوئے تمہیں یاد کروں گی' تم بھی جھک مارتے ہوئے مجھے یاد کیا کرنا۔ اس طرح ہم اکٹھے جھک مارا کریں گے۔۔۔۔۔۔"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شام کے گہرے ہوتے افسردہ سایوں میں لڑکا بنچ پر تنہا بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور شہتوت کے گھنیری ٹہنیوں میں چڑیاں اور طوطے شور مچا رہے ہیں' چلا رہے ہیں اور کچے پکے شہتوت کتر کتر کر نیچے پھینک رہے ہیں۔ اب وہ لڑکی کبھی اس کچی سڑک پر سے نہیں گزرے گی۔ اب یہ لڑکا یہاں سے تنہا گزرا کرے گا۔ اب کوئی طوطا ان دونوں کی باتیں سننے کے لیے درخت کی اونچی ٹہنی پر سے اتر کر نیچے نہیں آئے گا۔ اب سارے ساز بے سر ہو گئے ہیں' سارے سر بے تال ہو گئے ہیں اور سارے تال سوکھ گئے ہیں۔ اب ان جھیلوں میں کوئی کنول نہ مسکرائے گا۔ ان پہاڑوں پر کبھی برف نہ گرے گی اور ان برفوں میں کبھی پہاڑی ندیوں کے خلخال نہ بجیں گے۔ یہ سرائے ویران ہو گئی ہے۔ یہ سٹیشن اجڑ گیا ہے۔ اب یہاں کوئی پردیسی نہیں آئے گا۔ اب یہاں کوئی ریل نہیں آئے گی۔ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔"

اے دھوپ میں چمکنے والے کاغذی پھولو! اپنے اڑتے بھاگتے رنگوں کے پاؤں تھام لو۔ اے جھوٹے پتھروں کے موتیو! اپنی بے آب چمک سے لپٹ کر سو رہو' سو رہو۔۔۔۔۔۔۔ اے سہمی ہوئی محبت کی تھرتھراتی پلکو! اپنے سرد آنسوؤں کی شبنم واپس لے لو اور اکھڑی ہوئی چپل اور پھٹی ہوئی قمیص کو بھول جاؤ۔ قمیص' تولیہ اور دھوتی پہن کر صرف جمعہ کی نماز پڑھی جا سکتی ہے' محبت نہیں کی جا سکتی۔ محبت کرنے کے لیے کراچی سے لائے ہوئے شیفون کے سوٹ' طلائی آویزوں اور چمک دار انگوٹھیوں کی ضرورت ہے اور ایسی جیب کی ضرورت ہے جس میں رکھے سبز نوٹ صاف دکھائی دے رہے ہوں اور ایسے ذہن کی ضرورت ہے جس میں چھپے ہوئے بدصورت خیالات کبھی دکھائی نہ دیں۔

او خالی بنچ پر بیٹھے ہوئے اداس پردیسی! سگریٹ پھینک کر اپنی چپل کی مرمت کروا اور چرس پی کر کسی تکیے میں سو رہو۔۔۔۔۔۔ جھکی ہوئی خاموش ٹہنیوں کو تکنے والے! شیفون کے سوٹ اور طلائی آویزوں اور بدصورت جسموں پر سے گزر جا اور اپنی آنکھوں میں ڈھلکتے ہوئے ستاروں کو دل کی کھیتی میں بکھیر دے۔ یہ بہار کے بیج اور نایاب سیپیوں کے موتی ہیں۔ اپنی جلتی ہوئی پلکیں نئی زندگی اور چمکیلے مستقبل کے شبنمی شگوفوں پر رکھ دے اور مشرقی مرغزار کی اس ٹھنڈی ہوا میں جو زخموں کے جھروکوں میں سے تیری روح کو چوم رہی ہے بازو کھول کر کھڑا ہو جا' اور روشنی' امید اور حسن کا خیر مقدم کر تیرا ننگا سر بیش قیمت تاج میں چھپے ہوئے خالی سروں سے زیادہ قیمتی ہے۔ تیری خالی جیب بھرے ہوئے بٹوؤں سے زیادہ وزنی ہے۔ اور تیری خاموشی ان الفاظ سے زیادہ پر اثر ہے جو کھوٹے سکوں کی طرح اسٹیج پر اچھالے جاتے ہیں۔ تیری خاموشی وہ چندن ہار ہے جس پر جڑے ہوئے الفاظ کے نگینے جگنوؤں کی مانند چمکتے ہیں اور زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ تیرے دوست چپل کا فیتہ توڑ کر تجھے بنچ پر اکیلا چھوڑ گئے ہیں۔ وہ روشنی کے آخری مینار تک تیرے ساتھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آئے تھے اور اندھیرے کی پہلی سیڑھی پر تیرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ وہ تیرے دوست کبھی نہیں تھے۔ وہ سست رفتار آبی پرندے تھے جو جہاز کو ویران سمندروں میں چھوڑ کر واپس بندرگاہ کی جانب پلٹ آتے ہیں۔

یہ سفید قبروں کے پھول ہیں' تاریک سویرے ہیں اور بھڑکیلے کپڑوں اور شوخ لبادوں میں چھپے ہوئے مردہ جسم ہیں۔ یہ وہ لالے ہیں جو گلی گلی کو اپنا داغ دکھا کر دل جلوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور یہ وہ نمرود ہیں جو ہر پیغمبر کے لیے جہنمی آگ کا انتظام کرتے ہیں۔ یہ دن کے اجالوں میں گرجتے ہیں اور رات کے اندھیروں میں ممیاتے ہیں۔ ان کے بازو دوسروں کے بازو اور ان کے جملے دوسروں کے جملے ہیں۔ ان کے دہن چوڑے اور گریبان چھوٹے ہیں۔ یہ چاند کی تعریف کرتے ہوئے اپنے سینے کے داغ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ ستاروں کی طرف اٹھتے ہیں اور پاؤں کیچڑ میں دھنس جاتے ہیں۔ یہ جعلی سکوں کی تجارت کرتے ہیں اور سر جھکا کر بھیک مانگ کر محبت حاصل کرتے ہیں۔ یہ سونے کے عوض محبت خریدتے ہیں اور محبت کے عوض ہر چیز' ہر شے بیچ دیتے ہیں۔ ان کی ہر سرگوشی سہمی ہوئی کنیز اور ہر بوسہ بھنا ہو چیک اور کشکول میں گرا ہو ٹکڑا ہے۔ یہ دسترخوان کی ہڈیاں اور گرے پڑے پھل اٹھانے والے ہیں۔ ان کے جسم بوڑھے' روحیں کھوکھلی ہو چکی ہیں اور ان کی رگوں میں دوڑتا ہوا معمر خون سرد پڑ گیا ہے اور یہ زندگی کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہیں۔ یہ زندگی نہیں گزار رہے بلکہ زندگی انہیں گزار رہی ہے اور یہ لوگ بہت جلد گزر جائیں گے اور کوئی انہیں یاد نہ رکھ سکے گا۔ تیری تنہائیاں ان کے نقش بر آب محفلوں سے زیادہ چمکیلی اور تیرے اندھیرے ان کے اجالوں سے زیادہ تابناک ہیں۔ تجھے ان کی آہوں پر ہنسنا اور ان کے قہقہوں پر ترس کھانا چاہیے تو مکان کی گیارہویں منزل میں ہے اور یہ گلی میں کھڑے ہیں۔ تیرا راستہ جدا اور تیری منزل بالکل الگ ہے۔ انہیں رحم اور حقارت کی دلدل میں چھوڑ کر آگے بڑھ کر یہ ادنیٰ خواہشات کے گندے جوہڑوں میں رینگ رہے ہیں اور تیرے جہازوں کے بادبان نیلے سمندروں میں کھل گئے ہیں۔ اسی پکی سڑک کے موڑ پر زندگی موتیے کے پھولوں کا تاج لیے تیرا انتظار کر رہی ہے۔ ٹوٹا ہوا چپل پہن' ایک مضبوط اور صحت مند انگڑائی کے ساتھ گھٹیا خیالات اور احمقانہ غم کی کینچلی اتار کر اس سڑک پر سے اور ان لوگوں پر سے گزر جا۔ تیری زندگی کا ناول ابھی شروع ہوا ہے اس کے تیسرے باب پر ہی ختم شد مت لکھ۔

اٹھ۔۔۔۔۔۔۔ کہ ابھی شہتوت کے درخت پر چڑیاں چہچہا رہی ہیں اور ابھی دن کی روشنی باقی ہے۔

چیں۔۔۔۔۔۔ چیں۔۔۔۔۔۔ چیں

چڑیاں بدستور شور مچا رہی ہیں اور کونے والے نیم امریکی ہوٹل میں نیم عریاں جوڑے رقص کرنے لگے ہیں۔ یہ کیسا رقص ہے؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہر آدمی اچھل رہا ہے ناپ رہا ہے۔ مردوں کے دم پھول رہے ہیں اور عورتوں کے بلاؤز ڈھیلے ہو رہے ہیں اور سکرٹ اڑ رہے ہیں اور ٹانگیں ننگی ہو رہی ہیں۔ وہ کبھی ایک دم گھوم جاتے ہیں اور کبھی ایک دم بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے چہرے سرخ ہیں اور بال پریشان۔۔۔۔۔۔وہ چیخ رہے ہیں شور مچا رہے ہیں اور ہال میں بتیاں مدھم ہو رہی ہیں اور موسیقی تیز ہو رہی ہے اور روشنی کم ہو رہی ہے اور یہ کیا ہو رہا ہے یا علی مدد!

سڑک پر درختوں کے سائے لمبے ہو گئے ہیں۔

شام کی افسردگی زمین پر اتر آئی ہے۔ دو کمزور جسم کے لڑکے خوبصورت امریکی کپڑوں میں ملبوس باتیں کرتے چلے آ رہے ہیں۔

''ململ بخش اینڈ ڈوٹرز کے ہاں ہیریسن کو ٹویڈ آ گئی ہے۔

میں نے تو ایک کوٹ پیس ریزرو کروا لیا ہے۔

''اچھا خیال ہے لیکن ٹائی دوسری لینی پڑے گی۔''

''ٹائی بھی سن پروف ہی کی بنوا لوں گا۔''

''اچھا خیال ہے''

''چن چن فوں کے ہاں تم نے سویڈ کا نیا شو دیکھا ہے؟''

''نہیں تو''

''ضرور دیکھنا۔ تمہارے سن پروف کو بڑا میچ کرے گا۔ اومائی گاڈ! تم نے ٹائی کی ناٹ آج پھر غلط لگا رکھی ہے''

لڑکے گزر گئے ہیں۔ سویڈ اور سن پروف چلے گئے ہیں اور بجلی کے کھمبے پر بیٹھی ہوئی چڑیاں انہیں گردن ٹیڑھی کئے دیکھ رہی ہے۔ ان کے پیچھے دو پھولے ہوئے کانوں والے پہلوان نما لڑکے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے جسموں پر اکھاڑے کی مٹی لگی ہے اور وہ کرتے کندھوں پر ڈالے چلے آ رہے ہیں۔ وہ باتیں بھی کر رہے ہیں۔

''ہر لوئی کے تیل کی مالش اب مت کرنا اور سوڈ نڈ لگا کر شکر کا پتلا شربت ضرور پیا کرو۔

یہ جگر کی ساری گرمی چوس لیتا ہے پہلوان

میں تو آملے کا مربہ اور چاندی کے ورق ہی کھاتا ہوں''

''یہ بھی پی لیا کرو''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''پر خلیفہ۔۔۔۔۔۔۔ہی رام: ملائی والا تو صرف یخنی پیتا ہے۔''

''بھئی پسر ہی قصائی جو ہوا۔ روز کا ایک بچھڑا مل جاتا ہے۔

اللہ اللہ خیر صلا۔

''کل میں محنت کے بعد آدھ سیر کچا گھی پی گیا اور پچا ہی نہیں''

''پچا نہیں؟۔۔۔۔۔۔۔چ چ چ۔۔۔۔۔۔۔سارا نکل گیا ہوگا۔''

''بالکل۔''

''میری مانو تو آج پھر پیو!''

''وہ پھر نکل جائے گا۔''

''اونہوں۔۔۔۔۔۔۔چوکی پر بیٹھ کر پینا اور اس کے بعد دوڑنا شروع کر دینا۔''

کھمبے پر بیٹھی ہوئی چڑیا انہیں بھی گردن ٹیڑھی کئے تک رہی ہے۔

ایک لمترونگ آدمی اپنے بچے کو کندھے پر بٹھائے گزر رہا ہے۔ وہ بڑے پیار سے باتیں کرتا جا رہا ہے۔

''وہ آ گیا ہمارا گھر۔۔۔۔۔۔۔وہ آ گیا۔ گوگی لالے! بے بے کو کیا کہو گے؟ کہنا بے بے جی سلاماں لیکم' کہو۔۔۔۔۔۔۔بے بے کو کیا کہو گے؟''

بچہ شرما کر کہہ رہا ہے:

''تہوں گا بے بے تجری۔''

''ور فٹے منہ ماں دیا۔۔۔۔۔۔۔''

بڑی سڑک پر بڑ کے درخت تلے ایک لڑکی بس کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں ہیں۔ وہ بڑی دیر سے وہاں کھڑی ہے اور تھک گئی ہے۔ وہ کبھی ایک ٹانگ پر کھڑی ہوتی ہے اور کبھی دوسری کا سہارا لے لیتی ہے۔ ہر آدمی اسے گھورتے ہوئے گزرتا ہے۔ موٹریں گرد کے بادل اڑاتی گزر رہی ہیں۔۔ ایک لمبی سیاہ کار میں لمبے ناک والی موٹی عورت آدھا کیلا نگل کر آدھا باہر پھینکتے ہوئے ڈرائیور سے کہہ رہی ہے:

''ہائے رحیم بخش جلدی چلو۔ میں تو بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہائے رحیم بخش جلدی چلو۔ میں تو بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں"

اب رات کافی گزر گئی ہے۔ آسمان پر ویران چاندنی کی گرد سی اڑ رہی ہے اور پھیکے تارے کہیں کہیں اونگھتے دکھائی دے رہے ہیں۔ چھوٹی کچی سڑک سنسان ہے درختوں کے تنے اندھیرے میں گم ہیں۔ کونے والے نیم امریکی ہوٹل کے ہال میں کرسیاں میزوں سے لگی سو رہی ہیں۔ بیاہ والے گھر میں ڈھولک کی تھاپ اور کنواری، گونہ لگی آوازیں کہیں ڈوب گئی ہیں۔ باغ ویران ویران ہے اور ٹاہلیاں اور سفیدے لمبی ٹہنیاں جھکائے دھیمی دھیمی سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ سکول کے برآمدے میں فقیر سو رہا ہے۔ تکئے میں اپلوں کا ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا ہے اور کسی وقت خلیفہ نگی کی درد بھری خشک سی آواز لہرا جاتی ہے۔

ڈاچی والیا موڑ مہار۔۔۔۔۔۔۔"

اے خوبصورت ڈاچی والے! تیری ڈاچی کے پاؤں میں گھنگھروں ہیں اور گلے میں زمرد کی مالا ہے اور کانوں میں سونے کی بالیاں اور اس کی چال صحرائی ہرنیوں سے ملتی ہے۔ کیا تو اسے لے کر ہماری گلی میں سے نہیں گزرے گا؟ اے شہتوت کے خوبصورت درخت! تیرے گہرے سرخ شہتوت بڑے میٹھے ہیں اور آویزوں کی طرح لٹکتے ہیں۔ کہیں تو نے ان کنواریوں کو یہاں سے گزرتے دیکھا ہے جنہوں نے لال صراحیاں اٹھا رکھی تھیں؟ شہتوت کا درخت خاموش ہے۔ ڈاچی والا بھی چپ ہے۔ سب چپ ہیں۔ سب خاموش ہیں۔ کوئی کچھ نہیں کہہ رہا۔ کوئی کچھ نہیں بول رہا۔ پنچ خالی ہے۔ سڑک ویران ہے۔ وہ لڑکا بھی چپل گھسیٹتا جا چکا ہے۔ چاند ٹاہلیوں میں چھپ رہا ہے اور تارے ڈوب رہے ہیں۔ کوئی نہیں۔۔۔۔۔۔۔ کوئی نہیں!

اے شہتوت کے خوبصورت درخت!

اے شہتوت کے خوبصورت درخت!

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com